سفیرِ انقلاب

تالیف

تسلیم رضا خان

العارف پبلیکیشنز

5 — مُسلم ٹاؤن، لاہور

محفوظ بک ایجنسی مارٹن روڈ
کراچی
فون: ۳۲۳۲۸۹

بسم الله الرحمن الرحيم

سفیرِ انقلاب

تالیف

تسلیم رضا خان

العارف پبلیکیشنز
5 ـــــ مسلم ٹاؤن، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر	:	العارف پبلیکیشنز لاہور
مطبع	:	دھنک پرنٹنگ پریس راولپنڈی
کمپیوٹر کتابت	:	اصغر بلتستانی / اقبال بلتستانی
سرورق	:	محمد حسین چشتی / رزہم کمپیوٹر
اشاعت اول	:	فروری 1996ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	

ملنے کا پتہ :- 1- مکتبہ العارف 5 - مسلم ٹاؤن وحدت روڈ لاہور

2- مکتبہ الرضا- 8- بیسمنٹ میاں مارکیٹ اردو بازار لاہور

زندگی پہ جو لوگ چھا جائیں
موت ان کا طواف کرتی ہے

اِنتساب

پاک وفاؤں کے نام

جن کا سفر حضرت ابُو طالبؑ
سے تقی حیدر تک جاری ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

آغوش

عنوان	صفحہ نمبر
۱۔ عرض ناشر	11
۲۔ پیش لفظ (دل یہ کہتا تھا کہ فریاد لبوں تک پہنچے)	13
۳۔ سفیر انقلاب کا خاندانی پس منظر	26
۴۔ آغوش مادر سے آغوش مکتب تک	31
۵۔ آئی۔ایس۔او کا قیام اور سفیر انقلاب	34
۶۔ آئی۔ایس۔او کا رخت سفر اور سفیر انقلاب	49
۷۔ سفیر انقلاب کی مرکزی صدارت	63
۸۔ رشتہ ازدواج	65
۹۔ پیشہ ورانہ زندگی کے نشیب و فراز	69
۱۰۔ انقلاب ایران اور سفیر انقلاب	84
۱۱۔ تحریک جعفریہ اور سفیر انقلاب	109
۱۲۔ آئی۔او سے اختلاف	128
۱۳۔ سانحہ کوئٹہ اور سفیر انقلاب	134
۱۴۔ قرآن و سنت کانفرنسز اور سفیر انقلاب	143
۱۵۔ تحریک جعفریہ کے سفر کا تیسرا مرحلہ	151

۱۶۔ تحریک کا سیاسی سفر اور سفیر انقلاب 161

۱۷۔ فلاحی امور اور سفیر انقلاب 171

۱۸۔ سفیر انقلاب اور افراد سازی 193

۱۹۔ سفیر انقلاب اور سامراج 231

۲۰۔ سفیر انقلاب کی ذاتی زندگی 260

۲۱۔ سفیر انقلاب کے آخری ایام زندگی 305

۲۲۔ زندگی کا آخری سفر 319

۲۳۔ یہ کس کا لہو ہے کون مرا ؟ 322

۲۴۔ گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن...!(سلمان نقوی کا پر درد خطاب) 336

۲۵۔ قائد ملت جعفریہ کا تاریخی خطاب 340

۲۶۔ سلام تجھ پر !کہ تونے وفا کی لاج رکھی۔ (شہید وفا کے بارے میں) 355

۲۷۔ شہادت کیا ہے اور شہید کا رتبہ کیا ہے۔ 360

۲۸۔ وصیت نامہ ۔ 371

۲۹۔ ابدی حیات کی خوشبو 372

۳۰۔ ایک گزارش۔ ایک اپیل 375

عرض ناشر

ہمیں یہ عرض کرتے ہوئے مسرت نصیب ہو رہی ہے کہ ہم قائد ملت اسلامیہ شہید مظلوم حضرت علامہ سید عارف حسین الحسینی رضوان اللہ علیہ کی ذات اقدس، حیات طیبہ اور ان کے مقدمہ قتل پر مبنی کتاب ''سفیر نور'' پیش کرنے کے بعد مجاہد اسلام، شہید وطن اور محسن ملت ڈاکٹر محمد علی نقوی کی مجاہدانہ جدوجہد پر مشتمل کتاب **''سفیر انقلاب''** آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ''سفیر نور'' کی طرح ''سفیر انقلاب'' بھی آپ کی پسندیدہ کتب میں شامل ہوگی اور ایک مجاہد کی زندگی کے زاویے سمجھنے میں مدد دے گی۔

ہم نے محسوس کیا ہے کہ ''سفیر نور'' جتنے افراد نے پڑھی ہے اتنے افراد نے خریدی نہیں ہے۔ اگر ہر پڑھنے والا ذاتی کتاب خرید کر اس کا مطالعہ کرتا تو نہ صرف اس کے گھر میں یہ اثاثہ بطور ملکیت رہتا بلکہ ہمارا ادارہ اس کے دس ایڈیشنز شائع کر کے خسارہ پورا کر چکا ہوتا اور مزید کتب پیش کرنے میں تاخیر نہ کرتا۔

آپ کے علم میں ہونا چاہئے کہ ہم نے ''سفیر نور'' آدھی قیمت پر آپ کی خدمت میں پیش کی تھی تاکہ پیغام کی راہ میں کسی ہم خیال رفیق کے مالی مسائل رکاوٹ نہ بنیں اور یہی صورتحال ''سفیر انقلاب'' کی ہے۔

قارئین محترم! یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہم آپ سے کاغذ

اور طباعت کی پوری قیمت بھی وصول نہیں کرتے اور ہم اپنا خسارہ زیادہ کتب فروخت ہونے پر برابر کرتے ہیں "العارف پبلیکیشنز لاہور" خالصتاً ایک نظریاتی اور فکری ادارہ ہے جو آپ کی دہلیز تک ایسی ہی کتب اور لٹریچر پہنچانے کا عزم رکھتا ہے۔ ہمارا منافع آپ سے رابطہ، نئی نسل کے شعور کی بیداری اور آپ کی دعائیں ہیں۔

آپ سے استدعا کی جاتی ہے کہ آپ دوسروں سے کتب لیکر پڑھنے کی بجائے ذاتی طور پر یہ کتب خریدیں۔ اپنی لائبریری میں رکھیں، اپنی نسلوں کیلئے بطور تحفہ چھوڑ جائیں اور ادارہ کے ہاتھ مضبوط کریں تاکہ ہمارے اور آپ کے درمیان مالی مسائل دیوار نہ بنیں اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہے۔ اگر آپ نے تعاون فرمایا تو انشاء اللہ ہم اگلے مرحلے میں بہت جلد "برصغیر میں شیعیت کا کردار" کے عنوان سے ایک تاریخی دستاویز پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ مگر اس میں آپ کی دعائیں اور تعاون شرط ہے۔ خدا آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ آمین۔

العارف پبلیکیشنز

۵۔ مسلم ٹاؤن وحدت روڈ لاہور

فون:۔ 5830176-5834689

بسم رب الشھداء

دل یہ کہتا تھا کہ فریاد لبوں تک پہنچے

دستور زمانہ ہے کہ مصنف یا مؤلف اپنی کتابوں کے "پیش لفظ یا دیباچے" بڑی بڑی نامور شخصیات سے لکھوا کر کتاب کے چہرے کا بناؤ سنگھار کرتے ہیں مگر میں اس سے اختلاف کرتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اپنے دل کا "درد" کوئی اور بیان نہیں کر سکتا اگر بیان کر بھی دے تو مصنوعی یا خیراتی لفظوں میں اثر نہیں ہوتا اور جس میں اثر نہیں ہوتا وہ بات کبھی دل میں نہیں اترتی۔ چنانچہ میرا "پیش لفظ" ایک "فریاد" ہے اسے "فریاد" کے لہجہ میں سنا جائے۔

۷ مارچ ۱۹۹۵ء کو صبح تقریباً ۹ بجے کا وقت تھا دفتر کے فون کی گھنٹی بجی .... میں نے ریسیور اٹھایا ...... علیک سلیک کے بعد برادر سید ابوالحسن نقوی کی آواز بھر گئی اور انہوں نے بڑی دقت سے کہا "ڈاکٹر صاحب شہید کر دیے گئے" .... وہ کیسے ....؟ میں نے بے ساختہ پوچھا .... انہوں نے رک رک کے اپنے جملے مکمل کئے کہ صبح پونے آٹھ بجے "چوک یتیم خانہ" پر چند دہشت گردوں نے آپ کو محافظ سمیت اس وقت شہید کر دیا جب آپ اسپتال جا رہے تھے"

مختصر سی بات ختم ہوئی تو طویل صدمہ شروع ہوگیا۔ بات کانوں سے داخل ہو کر دل میں نشتر کی طرح اتری اور ۵ اگست ۱۹۸۸ء کے گہرے زخم کو ہرا کر گئی .... وقفہ وقفہ سے کئی فون اور دوست ملنے آئے، جو مجھ سے چھوٹے تھے انہیں میں، اور جن سے میں چھوٹا تھا مجھے وہ، دلاسے دیتے رہے۔ تاہم ہر دلاسہ نے زخموں کی جراحت کی اور ہر تعزیت نے درد میں اضافہ کیا۔

آنکھ کے پردہ پر ڈاکٹر صاحب کی تصویر تیرنے لگی اور ذہن میں ان کی یادوں کی فلم دوڑ گئی۔ اگرچہ میں نے زندگی کے گذشتہ چھ سال آپ کی قربت اور شفقت میں گزارے تھے اور طویل ملاقاتوں کا شرف بھی مجھے حاصل تھا مگر آج سابقہ ملاقاتوں کا ہر لمحہ تشنہ اور ہر داستان ادھوری لگتی تھی۔

میں اشکوں کا سیلاب پس چشم روکنے کیلئے آنکھیں بند کرتا تو کانوں سے آپ کی صدا ٹکراتی "عزیز دوستو! وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے، دشمنان اسلام دین محمدی کو زک پہنچانے کی مذموم سازشوں میں مصروف ہیں، زمانہ پھر ایک کربلا کا تقاضا کرتا ہے ...... اٹھو یزیدیت کے عزائم خاک میں ملا دو ...... مگر یاد رکھنا کربلا لہو مانگتی ہے"

میں آنکھیں کھولتا تو آپ کی تصویر کہتی سنائی دیتی "بے مقصد زندگی موت کے مترادف ہے ....."

میں ایسے میں کیا کرتا .....؟ حقیقتاً" کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا! نہ یہ بات غیر متوقع تھی البتہ آپکی جدائی کا ماتم کرنے کو جی چاہتا تھا مگر ماحول نے میرے ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ البتہ میری سوچیں آزاد تھیں جو مجھ سے دو قسم کے سوالات پوچھ رہی تھیں ...... ایک قسم کے سوالوں کا تعلق ڈاکٹر صاحب کی ذات سے تھا جبکہ دوسری قسم کے سوالوں کا واسطہ میری اپنی ذات سے .....۔

پہلی قسم کے سوالات کچھ یوں تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو کس نے قتل کیا ...... وہ کیوں قتل ہوئے۔ آخر ان کا جرم کیا تھا .....؟ ان تمام سوالوں کے جوابات میرے پاس موجود تھے چنانچہ میں نے اپنی سوچ کو مطمئن کیا مگر دوسری قسم کے سوالات کہ ان کے بعد ہمارا کیا بنے گا ...... ملت کو سہارا کون دے گا ...... ہماری نظریاتی تربیت کون کرے گا ...... ہمیں زندگی کے مقصد سے آگاہی کون دے گا ...... حالات کی کڑکتی دھوپ میں شفقتوں کا سایہ کون فراہم کرے گا ...... پردیسی پنچھیوں کا گھونسلہ کون بنے گا .....؟ کے جوابات مجھے مطلوب تھے مگر اس وقت ان سوالات کے جوابات دینے کیلئے کوئی میسر نہ تھا ...... جہاں تک میری بساط تھی میں نے خود کو جوابات دینے کی کوشش کی اور جہاں تک میرے ادراک کی قوت بصارت ساتھ دیتی تھی وہاں تک اس نے بھی نعم البدل تلاش کرنے کے جتن کیئے مگر خدا گواہ ہے کہ ارد گرد بظاہر بہت کچھ ہونے کے باوجود میں اپنی سوچوں کو طویل صحراؤں میں بھٹکتا، لڑکھڑاتا اور تڑپتا محسوس کرتا رہا۔ وہ فاصلے جو منزل تک پہنچنے کیلئے مختصر رہ گئے تھے آج نہ صرف طویل لگتے تھے بلکہ مسافتوں سے بھی خوف آتا تھا۔

اگرچہ میں مذکورہ سوالات کے جوابات سے قاصر تھا تاہم ماضی کے کچھ الجھے ہوئے سوالات کے مفاہیم مجھ پر نہایت واضح ہو رہے تھے آج مجھے پہلی بار اس حقیقت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ "گھونسلہ گر جانے کے بعد پرندوں کے بے پر بچے' طوفانوں' آندھیوں' بارشوں اور دشمن کے حملوں کے خوف سے کیوں چیختے ہیں .....؟

فطری عمل ہے کہ انسان اس قسم کے حادثات کے بعد دو زاویوں پر عموماً سنجیدگی سے غور کرتا ہے ایک اپنے محسن کے مشن کا تحفظ اور اس کے نظریات کا پرچار ..... دوم قاتل سے انتقام کی راہ کی تلاش۔ ....

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے مواقع پر مقتول کے پسماندگان کی نگہداشت اور انکے دنیاوی مال و متاع کا تحفظ ایک ضروری عمل ہوتا ہے مگر حقیقتاً اس سے بڑھ کر قیمتی سرمایہ "شہید" کا نظریہ ہوتا ہے جس کیلئے وہ اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ پس اس کے نظریہ کو زندہ اور اس کی جدوجہد کو جاری رکھنا ہی اس کے حق کی ادائیگی شمار ہوتا ہے۔

جہاں تک فطری طور پر قاتل سے انتقام کا تعلق ہے تو اس میں جذبات کی بجائے شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک "نظریاتی شہید" کے اجرتی قاتل کو قتل کرنے سے غصہ تو ماند پڑ سکتا ہے مگر مقاصد کبھی حل نہیں ہوسکتے۔ امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "اگر ہم یزید کی ساری فوج بھی قتل کر دیں تو اسکی قیمت کربلا میں مارے جانے والے ہمارے ایک گھوڑے سے بھی کم ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا دونوں کام مورخ یا لکھاری سے بڑھ کر کوئی اور شخص انجام نہیں دے سکتا۔ میں وثوق سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی مورخ دیانتداری سے "مظلوم شہید" کی داستاں تاریخ کے ماتھے پر رقم کر دے تو جغرافیے بدل جاتے ہیں کیونکہ اس سے بیک وقت راہ حق کے شہید کا تعارف' مشن اور نظریہ زندہ رہتا ہے اور دشمن سے انتقام کی صورت بھی نکل آتی ہے۔

اس کتاب سے پہلے خدا نے مجھے توفیق دی کہ میں نے ملت اسلامیہ کے عظیم قائد شہید مظلوم علامہ سید عارف حسین الحسینی کے کردار اور مقدمہ قتل پر "سفیر نور" کتاب لکھی جس نے بین الاقوامی سطح پر شہید کو متعارف کرایا اور اجرتی قاتلوں

سے لیکر وائٹ ہاؤس کے مکینوں تک کے کردار کو بے نقاب کیا۔

سفیر نور کی بے پناہ حوصلہ افزائی نے مجھے اس حقیقت سے آشکار کیا کہ شہید کا خون ایک امانت ہوتا ہے جس کی خوشبو کو نسلوں تک منتقل کرنا لکھاری کے دوش پر قرض تصور کیا جاتا ہے۔

شومی قسمت کہ قائد کی جدائی کا زخم ہرا ہی تھا اور ابھی ہم ان کے پیغام کو گھر گھر پہنچا ہی رہے تھے کہ ظالموں نے ہمارے قبیلہ کے ایک اور مجاہد کو قتل کر دیا۔ ایسے میں ایک چیخ درد بن کر اٹھی اور فریاد کا روپ دھار گئی۔ فطرت "درد" کو دل کے سپرد کرنا چاہتی تھی مگر

دل یہ کہتا تھا کہ فریاد لبوں تک پہنچے۔

جب میں ڈاکٹر صاحب کی صف ماتم پر بیٹھا تو پرسہ دینے والے تمام برادران نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سفیر نور کی طرح ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور کردار پر بھی ایک جامع کتاب کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اور ایسے میں ؎

کہا مجھ سے دماغ و دل نے مل کر
طبیعت یوں نہ اپنی مضمحل کر
قلم کو درد دل سے متصل کر
قلم میں درد دل کو منتقل کر

چنانچہ جب میں "سفیر انقلاب" کی تیاری کیلئے گھر سے نکلا تو تنقید کے کچھ پتھر میرے سر پر بھی پھینکے گئے کہ "اب اس کا کام "شہداء" پر کتابیں لکھنا رہ گیا ہے۔" میں نے اپنے ان مہربانوں سے عرض کی اگر میں نے کسی کی ذات کا قصیدہ لکھنا ہوتا تو اس کی زندگی میں لکھتا اور کوئی دنیاوی فائدہ بھی حاصل کرتا، رنگین کفن اوڑھ کر مٹی کے نیچے سونے والوں سے میں نے کون سی لالچ وابستہ رکھنی ہے۔ میں کسی کی ذات کی

نہیں بلکہ کردار کی گواہی لکھ رہا ہوں جو مقتول کے ورثاء کیلئے ایک شہادت اور قاتلوں کے خلاف استغاثہ ہے۔ یہ تاریخ اپنوں کیلئے اثاثہ اور دشمن کیلئے انتقام ہے کہ اس نے جس شخص کو قتل کرکے یہ سوچا تھا کہ اس کا مدمقابل ختم ہوگیا ہے اب اس پر ثابت ہوگا کہ وہ مرا نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ طاقتور بن کر سامنے آیا ہے۔

مجھے یہ لکھنے میں کوئی باک نہیں کہ اگر میں ملت جعفریہ پر ڈاکٹر صاحب کے احسانات کی بجائے اپنی ذات پر ان کے احسانات رقم کرتا تو پھر بھی ایک کتاب بن سکتی تھی کیونکہ مجھے یاد ہے کہ جب مئی ۱۹۸۹ء میں میرا لاہور آنا ہوا تو تنظیمی سطح پر دو افراد شہید ڈاکٹر محمد علی نقوی اور برادر سید راشد عباس نقوی (جو اس وقت آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے مرکزی صدر تھے) نے مجھے اس انداز میں بانہوں میں لیا کہ میرا احساس غریب الوطنی جاتا رہا۔ اس وقت میری حیثیت ایک آخری درجہ کے کارکن کی تھی جو دفتر میں جھاڑو اور میزوں کی صفائی کے علاوہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میرے دامن میں لفظ بھی نہیں ہوتے تھے۔ میں اتنا غریب تھا کہ مسکراہٹ کے علاوہ کسی کو کچھ نہ دے سکتا تھا۔ بھلا ایسے میں کسی کا مجھے پیار دینا خلوص نہیں تو اور کیا تھا.....؟

لاہور میں بڑے بھائی صاحب کا ذاتی گھر تھا مگر مجھے اس گھر کی بجائے دیو سماج (سابقہ مرکزی دفتر آئی۔ ایس۔ او) کے گھونسلہ میں زیادہ سکون محسوس ہوتا تھا کیونکہ یہاں مذکورہ برادران میری اسطرح پرورش کرتے تھے۔ جیسے کوئی پرندہ اپنے بے بال و پر بچے کو گھونسلہ میں چوگا دیتا ہے۔ اور اسے پرواز کے مراحل میں داخل کرکے اپنی ذمہ داری مکمل کرتا ہے۔

آخر ایک وقت آیا کہ ممتاز قلمکار اور معروف مصنف بڑے بھائی جان عابد عسکری نے میرے پر سنوارے' راشد نقوی نے مجھے اڑان دی اور ڈاکٹر نقوی نے میری اڑان میں درد بھرا۔ میرے اردگرد کے ہمسفر لوگوں نے وقت کیساتھ ساتھ خوشیاں خریدیں مگر میں نے درد کو اپنی میراث اور سرمایہ سمجھا۔ پرواز کرنے والے کئی احباب نے اپنے رشتے مال و متاع سے قائم کیئے مگر میں نے ہر چند کربلا سے ناطہ جوڑنے کی کوشش کی۔

مجھے ستمبر ۱۹۹۵ تک کربلا سے مانوسیت کی گہرائی کا علم نہ تھا مگر ایک شب جب میں اپنے آبائی گاؤں "نکانی ضلع ڈیرہ غازیخان" میں "سفیر انقلاب" لکھ رہا تھا تو مجھے اپنی والدہ محترمہ نے بتایا کہ "بیٹا اگرچہ میں تمہاری کتابیں اور تحریریں نہیں پڑھ سکتی لیکن جو کچھ میں لوگوں سے سنتی ہوں اس کی روشنی میں کہہ رہی ہوں کہ تم نے میرے دودھ اور میری محنتوں کا حق ادا کیا ہے" میں نے برجستہ پوچھا "کونسا حق ......؟" فرمانے لگیں کہ میں نے ہر چند کوشش کی تھی کہ تمہیں باوضو ہوکر دودھ پلاؤں اور میں نے تمہیں زندگی کے ابتدائی سالوں میں جتنے لباس بھی پہنائے تھے وہ پنگھوڑا حضرت علی اصغر یا روضہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے مس شدہ ہوتے تھے" میں نے موقع پاتے ہی عرض کی کہ "امی جان اس کا مطلب ہوا کہ میں آپ کا مقروض ہوں اور یہ قرض اس صورت میں ادا ہو سکتا ہے کہ میں آپ کے سفید بالوں کو سرخ کرنے کیلئے اپنا لہو بطور مہندی پیش کروں تاکہ قرض بھی ادا ہو جائے اور حضرت علی اکبر کی والدہ معظمہ کی سنت بھی ......؟ میری یہ بات سن کر ان کی ضعیف آنکھوں میں جواں آنسو اترے اور انہوں نے فرمایا "میرے لیئے اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو سکتا ہے ......"؟ بقول شاعر

ہر لمحہ اشکبار رہی ہے ہماری آنکھ
معمول پر کبھی یہ سمندر نہ آسکا

یہ ساری بات سن کر میں نے خدا کی عطا کردہ نعمت کا شکر ادا کیا کہ

پرائے پن کی وسیع و عریض دنیا میں
یہ اک خوشی ہی بہت ہے کہ درد اپنا ہے

میں ہمیشہ اقرار کرتا ہوں کہ مجھے ماں نے انسان جنا ...... تنظیم نے انسان بنایا اور ڈاکٹر نقوی جیسے برادران نے انسانیت کا نصاب پڑھایا۔ انہوں نے مجھے زخمی

ہاتھوں سے بہت اونچا تعمیر کیا ...... انہوں نے مجھے مقصد حیات بتایا .... انہوں نے مجھے عارضی زندگی میں دائمی کام کرنے کا حوصلہ اور سمت دی .... انہوں نے مجھے تاریخ کا حصہ بننے کے گر سکھائے .... انہوں نے مجھے خدا پر بھروسہ اور اپنے گناہوں سے ڈرنے کا درس دیا .... انہوں نے مجھے اسلام کی عظمت اور وطن عزیز کی ناموس کے تحفظ کا سبق پڑھایا ...... انہوں نے مجھے فلک سے اترنے والا رزق کھانے کی تلقین کی اور انہوں نے مجھے کسی کے آگے دامن اور ہاتھوں کا رخ نہ بدلنے کی تاکید فرمائی ......"

میں بند پھول تھا اس نے بہار دی مجھ کو
میں اس کے دم سے کھلا اعتراف کرتا ہوں

قارئین ! اب آپ یہ خود اندازہ لگائیں کہ میں ان کا کتنا مقروض ہوں صرف میں ہی نہیں بلکہ ملت جعفریہ کے ہزاروں جوان میری طرح ڈاکٹر صاحب کی شفقتوں کے مقروض ہیں۔

لہٰذا اس کتاب کے دامن میں' میں نے جو کچھ سمویا ہے وہ ان کا کردار ہے۔ جہاں تک ان کے ذاتی احسانات کی ادائیگی کا تعلق ہے وہ مجھ جیسے غریب انسان کیلئے ممکن نہیں کیونکہ

میرے دامن میں تو لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں

مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کے عطا کردہ "درد" نے مجھے اتنا اعتماد بخشا ہے کہ آج میں ظالموں کے کردار کو صفحات کے کفن میں لپیٹ کر دفن کرتا ہوں اور قرطاس کے صحرا میں لفظوں کے سیاہ فام قبیلوں کو مظلوموں کا سفیر بنا کر آباد کرتا ہوں جو راہ حیات کے ہر راہی کو حقیقتوں کا پتہ دیتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ خلوص سے لکھی جانے والی تاریخ جب نسلوں کو حق کا تعارف کراتی ہے تو قاتل رسوا اور مقتول سرخرو ہو جاتا ہے جب لفظوں کے دوش پر

سوار ہو کر لہو بولتا ہے تو قاتل کا دم گھٹنے لگتا ہے کہ

"ہم نے جس خون کو مقتل میں چھپانا چاہا
آج وہ کوچہ و بازار میں آنکلا ہے"

ایک جرم پر پردہ ڈالنے اور ندامت سے بچنے کیلئے تاریخ کا مجرم معافی نہیں مانگتا، توبہ نہیں کرتا، بلکہ کبھی لہو کے چراغ جلانے والوں کو قتل کر کے اور کبھی مورخ کے ہاتھ قلم کر کے اپنے جرائم میں اضافہ کرتا ہے اور وہ اسطرح نسل در نسل مجرم بن جاتا ہے ...... پھر اس کی نسلیں نسب سے بھی شرمندہ رہتی ہیں اور تاریخ سے بھی .....

یہ فلسفہ میں خود سے نہیں لکھ رہا بلکہ یہ سب کچھ میں نے کربلا کے نصاب میں پڑھا ہے ...... میں نے اس نصاب کے امتحان کی تیاری ماں کی گود میں کی تھی اور مجھے اس تیاری کے دوران بتایا گیا کہ "کربلا کا جرم چھپانے کیلئے شام کے بازار سجائے گئے تھے تاکہ لوگ حقائق سے بے خبر رہیں ...... جب شام کے دربار میں حق بیان ہوا کہ "اے یزید! تو ہمارے ورثاء کے قتل اور ہماری مظلومیت پر خوش ہو رہا ہے تو ہمیں قیدی سمجھے ہوئے ہے مگر یاد رکھ ہم تجھے تلاش کرتے کرتے یہاں تک آپہنچے ہیں" ...... دربار پر سکتہ طاری ہوا تو زر خرید علما نے یزید کو اذان دلوانے کا مشورہ دیا تاکہ علیؑ کی بیٹی اذان کے احترام میں چپ ہو جائے اور تاریخ کے ابواب میں اضافہ نہ ہو جب درباری موذن نے "اشہد انا محمد الرسول اللہ" کا جملہ ادا کیا تو زنجیروں میں جکڑے اور طوق و ضعف کیوجہ سے جھکے ہوئے کربلا کے ایک سفیر نے کمر سیدھی کی اور تخت نشین حکمران کو مخاطب کر کے فرمایا "اے یزید! یہ موذن جس محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لے رہا ہے بتا یہ تیرا نانا ہے یا میرا ......؟

یہ انقلاب آفریں جملہ سن کر جب دربار میں سناٹا چھایا تو سونے کے قلم ہاتھوں میں پکڑنے والوں نے اسے ایک قیدی کی بادشاہ وقت کے سامنے گستاخانہ جسارت قرار دی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی مگر دیانتدار مورخین نے اس امانت کو نسلوں

کے سپرد کیا اور انہیں اس دیانتداری کی بھاری قیمت چکانا پڑی۔

مجھے فخر ہے کہ میرا تعلق کربلا کے سفیر مورخین کے قبیلہ سے ہے ..... ہمارا معیار مخالفت اور دوستی بھی دوسروں سے مختلف ہے ہم ذاتیات کی بجائے کردار کو چھیڑتے ہیں ہم "یزید مردہ باد کم" "یزیدیت مردہ باد" زیادہ کہتے ہیں نہ جانے ہمارے مخالف کو یہ بات بری کیوں لگتی ہے ......؟

پیارے پڑھنے والو ! آپ کے ہاتھوں میں موجود "سفیر انقلاب" ایک کتابی شکل میں قصیدہ ہے اس عظیم انسان کا جو دلوں کی سلطنت کا بے تاج بادشاہ رہا ..... نوحہ ہے .... اس مظلوم کا جو مظلوموں کے حقوق کے تحفظ کی جنگ لڑتا ہوا بے دردی سے شہید ہوا .... فریاد ہے ...... ان فراق زدگان کی جو اپنے محبوب کے ہجر میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہیں ..... تاریخ ہے ...... اس تاریخ ساز شخصیت کی جس کی جدوجہد کا سلسلہ اس کے سلسلہ نسب کی طرح کربلا سے ملتا ہے۔

"سفیر انقلاب" صرف دلچسپ اور دلگداز واقعات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ حقیقت میں پیغام ہے اس خون کا جو شہید کے چہرے پر فاتحانہ تبسم اور قاتل کے چہرے پر موت کی زردی کا باعث بنا' پیغام ایک امانت ہوتا ہے جس سے کوتاہ نظری خیانت تصور کی جاتی ہے اور خائن کو تو کوئی نسل معاف نہیں کرتی۔

میں نے کردار کو پیغام کا روپ دینے کی کوشش کی اور یہ سب کچھ خدا کی عطا کردہ توفیقات کی بدولت ہوا اگر میں یہ حق ادا نہ کرتا تو خدا مجھ سے توفیق سلب کر لیتا اور شہید کے خون کا بھی مجرم ٹھہرتا ...... تاریخ مجھے خائن لکھتی اور نسلیں مجھے مجرموں کے کٹہرے میں لے آتیں۔

میرا خدا شاہد ہے کہ میں نے یہ کتاب آزاد اور مطمئن ضمیر کیساتھ لکھی ہے' نہ میں نے کسی کی دی ہوئی لکیروں میں رنگ بھرا ہے اور نہ قلم کی عصمت کا کسی موڑ پر سودا کیا ہے۔

میں اپنی سوچ کی انگلی پکڑ کے چلتا ہوں
میرے خیال کا رشتہ میرے ضمیر سے ہے

کتابیں شوقیہ یا شغل کے طور پر نہیں لکھی جاتیں بلکہ ان کے پس منظر میں ایک "فکر" کار فرما ہوتی ہے۔ جس کی اساس "درد" ہوتا ہے۔ اگر کوئی قاری استطاعت کے باوجود بھی اس درد کی تہہ تک نہیں پہنچتا تو پھر وہ تاریخ اور اپنی توفیقات کیساتھ ظلم کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص پر درد کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ اسے اپنی قوم کیساتھ شیئر (Share) کرتا ہے تو وہ نہ صرف اپنے ساتھ انصاف کرتا ہے بلکہ کتاب کے عنوان کی قربانی اور خون کے تقاضوں کا بھی حق ادا کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی نقوی کیا تھے۔؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب جاننے کیلئے ایک عمر چاہئے۔ میں واضح کرتا چلوں کہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی قدآور شخصیات جنہیں تنظیمی دریاؤں سے تشبیہ دی جاتی ہے یہ تمام کے تمام دریا ایک سمندر میں اترتے تھے اور وہ سمندر "سفیر انقلاب" تھے۔

اب آپ خود اندازہ لگائیں کہ ساحل پہ کھڑا ہوا ہم جیسا کوئی عام انسان اس سمندر کی گہرائی کا کتنا ادراک کر سکتا ہے.......؟

میں برملا اعتراف کرتا ہوں کہ جو کچھ اس کتاب کے دامن میں سمویا گیا ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی جدوجہد کا عشر عشیر بھی نہیں ہے کیونکہ جس انسان نے شعوری زندگی کے پچیس سال گھڑی کی سوئیوں کی طرح مسلسل حرکت میں گزارے ہوں اس کی خدمات کا تعارف تین سو صفحات میں سمونا ناممکن ہے۔ البتہ اس بات پر مطمئن ہوں کہ کچھ نہ کرنے سے کچھ کر گزرنے کا عمل بہتر ہوتا ہے۔ اس حقیقت میں کوئی شک ہی نہیں کہ لفظوں کی زبان خدمات کا حق ادا نہیں کر سکتی پس

میرے خیال نے جتنے بھی لفظ سوچے ہیں
ترے مقام، تری عظمتوں سے چھوٹے ہیں

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ڈاکٹر صاحب کی ذات اور کردار پر لکھی جانے والی یہ

آخری کتاب ہوگی کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے بیسیوں زاویے تھے اور ہر زاویہ پر کم از کم ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ میری یہ حقیر کاوش بہتر لکھنے والوں کو ایک بنیاد ضرور فراہم کرے گی۔

میں نے یہ کوشش میدان صحافت کے قدآور صحافیوں میں شامل ہونے کیلئے نہیں کی اور نہ ہی میری تحریر کا کسی لکھاری کیساتھ تقابل کیا جائے۔ میرے ان کج مج لفظوں کو ایک وظیفہ سمجھا جائے جس کی ادائیگی کا حوصلہ مجھے شہد کی اس مکھی سے ملا ہے جو اپنے منہ میں پانی کا ایک قطرہ لیکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آتش نمرود سے بچانے کیلئے میدان میں آئی تھی۔ روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے درمیان رکھا گیا تو فرشتوں سمیت بہت سی مخلوقات بھی پیغمبر خدا کو بچانے کیلئے فلک بوس شعلوں کے گرد اکٹھی ہوئی تھیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے شہد کی مکھی کو دیکھ کر پوچھا تھا کہ ان شعلوں کی حرارت ہی اس قدر شدید ہے کہ تم آگ کے قریب پہنچ ہی نہ پاؤ گی دوم اگر تم پہنچ بھی جاؤ تو تمہارے منہ میں موجود پانی کا ایک قطرہ کیا کمال دکھائے گا ......؟ یہ سن کر مکھی نے جواب دیا تھا ...... آپ کی دونوں باتیں درست ہیں مگر میں تو اپنا وظیفہ ادا کرنے آئی ہوں تاکہ خدا کے حضور سرخرو ہو سکوں کہ "اے رب العزت میری جتنی طاقت یا حیثیت تھی میں اس کے ساتھ تیرے محبوب کو بچانے کیلئے سر میدان اتری تھی"

پس پیارے قارئین ! میری جتنی بھی حیثیت تھی میں نے خدا کے ایک محبوب کیلئے پیش کی یہی وجہ ہے کہ میں یہ فریضہ انجام دینے کیلئے گردو پیش سے بے نیاز رہا ہوں۔ کسی پہ انحصار کرکے نہ اپنے آپ کو جمود کا شکار کیا ہے اور نہ کسی انسان پر بھروسہ کی نیت یا نوازشات کی امید لیئے یہ کام سرانجام دیا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "جو کام خدا کی رضا کیلئے کیا جائے اس کا اجر خدا ہی دیتا ہے"

میرے لیئے یہ عزت کافی ہے کہ میں نے ایک عظیم شہید کے خون کو مقتل تک محدود نہیں ہونے دیا اور نہ دشمن کی یہ خواہش پوری ہونے دی ہے بلکہ اس کے پیغام کو آفاقی بنا دیا ہے۔ اس سے قبل جو لوگ ڈاکٹر صاحب کے نام سے واقف تھے

انشاء اللہ اب وہ ان کے کام اور پیغام سے بھی واقفیت حاصل کر لیں گے اور پھر

ان کے عاشق جب پھریں گے ہجر میں دیوانہ وار
رفتہ رفتہ لوگ بھی درد آشنا ہو جائیں گے

چونکہ یہ کتاب ایک عام انسان اور مکتب صحافت کے کم علم طفل کی لکھی ہوئی ہے اس لیئے اس میں تشنگی اور غلطیوں کا امکان خاصا موجود ہے۔ لہٰذا کہیں کوئی غلطی محسوس کریں تو آگاہ فرمائیں تاکہ دیگر ایڈیشنز میں اس کا اعادہ نہ ہونے پائے۔ اگر کہیں میری کم مائیگی محسوس کریں تو حوصلہ افزائی کے صدقے در گزر کردیں۔ آپ کی اس کرم نوازی کا احسان مند رہوں گا۔

تاریخ کے قاری پر واضح ہونا چاہیئے کہ ذمہ داریوں کی مثلث میں اس کا خط بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ شہید نظریہ کے تحفظ کیلیئے آگے بڑھ کر جان قربان کرتا ہے اور یہاں اس کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے .... اس کے بعد مورخ اس کے خون کی سرخی سے اس کی قربانی کا مقصد اور منطق لکھتا ہے اور یوں وہ اپنی ذمہ داری کو تکمیل تک پہنچاتا ہے .... اس کے بعد ہم خیال قاری کی ذمہ داری شروع ہوتی ہے جو پیغام رساں بن کر کوچہ بہ کوچہ شہید کی فکر کا پرچار کرتا ہے۔ تیسری قسم کی ذمہ داری کتنی اہم اور طاقتور ہے اس کا اندازہ آپ کو چودہ سو سال قبل کے معرکہ کربلا کے پرچار اور پیغام رسانی سے ہو سکتا ہے۔

پس قارئین پر لازم ہے کہ وہ اپنے محسن شہداء کے پیغام کو دیانتداری اور جانفشانی سے معاشرے کے ہر فرد اور آئندہ کی نسلوں تک پہنچانے میں اپنا اہم فریضہ سرانجام دیں اور خون کی حرارت کو زندہ رکھیں بصورت دیگر شہید کی قربانی بے مقصد چلی جائیگی اور قاتل اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیگا کیونکہ قاتل کی خواہش ہوتی ہے کہ مقتول کا نوحہ و ماتم نہ ہو تاکہ مظلوم اور ظالم کے درمیان تمیز نہ ہوسکے جبکہ شہید کے خون کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کی بے گناہی سے زمانہ کو متعارف کرایا جائے۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کس کے مقصد کو کامیاب کرنا چاہتے ہیں مجھے یقین ہے کہ

آپ مظلوم اور اپنے محسن شہید کے خون کے ساتھ مکمل انصاف فرمائیں گے۔ اور شہید کے اس دعویٰ کو زندہ رکھیں گے کہ

ہمارے بعد بھی رونق رہے گی مقتل میں
ہم اہل دل کو بڑے حوصلے میں چھوڑ آئے

میری دعا ہے کہ خداوند متعال میری یہ حقیر کوشش اپنی دربار عالیہ میں منظور فرمائے اور قارئین کو اسے پڑھنے، حقیقی معنوں میں اسے سمجھنے اور پھر اس کے مطابق اپنی راہیں تراشنے کی توفیق دے۔

آخر میں خداوند ذوالجلال کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کرنے کیساتھ ساتھ ممنون احسان ہوں، اپنے والدین، بہن بھائیوں اور احباب کا جنہوں نے اس کتاب کے سلسلہ میں حسب استطاعت میری حوصلہ افزائی اور پذیرائی فرمائی۔ خصوصی طور پر شکر گزار ہوں برادر ارشاد حسین ناصر کمالیہ کا جنہوں نے کتاب کی تیاری کے آغاز سے اختتام تک بہت سے میرے مسائل اپنے سر لیکر مجھے وقت فراہم کیا۔ جس کے باعث میرے کام کی رفتار متاثر نہ ہوئی۔

رب دو جہاں تمام بہن بھائیوں کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں شیطان کے شر اور چشم بد سے محفوظ رکھے۔ رب کریم سے التجا ہے کہ وہ ذات میرے شکستہ اور بے ربط لفظوں میں شہید کے خون کا صدقہ اثر بھر دے اور میری حقیر کوشش کو میری نجات کا ذریعہ بنا دے۔

عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سفیر انقلاب کا خاندانی پسِ منظر

سفیر انقلاب "ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید" کے خاندان کا سلسلہ امام حضرت علی نقی علیہ السلام سے ملتا ہے تاہم صوبہ پنجاب کے دارالخلافہ لاہور کے مضافات میں آپ کے خاندان کی آمد تقریباً" تین صدیاں پہلے بتائی جاتی ہے۔ آغاز میں یہ سادات خاندان لاہور کے مغربی علاقہ "شرقپور" میں آباد ہوا جہاں انہوں نے خاندانی زہدو تقویٰ کی بدولت گردونواح کی مسلم و غیر مسلم آبادی کو گرویدہ کیا۔ آپ کے آباؤ اجداد نے بہت سے غیر مسلم افراد کو مشرف بہ اسلام کرکے اسلامی طاقت میں اضافہ فرمایا اور عزاداری سید الشہداء کو تقویت بخشی۔

شیعیت کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں تو صدیوں قبل کی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمیشہ سادات قبیلہ نے اپنے گھر بار چھوڑ کر، وسائل اور استطاعت کے مطابق کربلا کا آفاقی پیغام دنیا کے کونہ کونہ میں پہنچایا ہے۔ آج بھی اگر ہم برصغیر میں پھیلے ہوئے معروف مزارات یا دور دراز علاقوں میں غیر معروف قبروں کا تاریخی پس منظر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مرحومین نے تبلیغ اسلام اور ترویج عزاداری کیلئے ہجرت کی تھی۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ جن افراد کی رگوں میں علیؑ و بتول سلام اللہ علیہا کا خون اور خون میں جد کی مظلومیت کی تاثیر شامل ہے وہ لوگ ہر دور میں کوفہ و کربلا کے زخمیوں کی طرح رہے ہیں او انہوں نے ہر قسم کے جبرو ستم جھیل کر رسول اکرم ﷺ کے عالمگیر پیغام کو انسانیت تک پہنچایا۔

سفیر انقلاب کے پردادا حضرت سید مدد علی شاہ صاحب نے آج سے تقریباً" ڈیڑھ سو سال قبل "شرقپور" سے لاہور کے جنوب مشرقی علاقہ "وطنہ" میں تبلیغ کیلئے ہجرت کی۔ شاہ صاحب کی آمد کی خبر دور دراز تک پھیلی تو وہاں کی آبادی نے تہہ دل سے خوش آمدید کہا۔ مختصر سے عرصہ میں آپ کے زہد و تقویٰ کی داستانیں گھر گھر پہنچ گئیں اور ہزاروں لوگ آپ کے مرید بن گئے۔ مسلمان تو آپ سے عقیدت رکھتے ہی تھے تاہم ہندو بھی آپ کی مریدی پر فخر کیا کرتے تھے۔

سید مدد علی شاہ صاحب کو خداوند کریم نے چار فرزند عطا فرمائے جن میں سید

غلام عباس شاہ بڑے، سید جعفر علی شاہ، سید رحمت علی شاہ اور سید غلام حیدر شاہ چھوٹے تھے۔

سید غلام عباس شاہ صاحب جب سکول کی تعلیم کے قابل ہوئے۔ تو "وطنہ" میں سکول نہ ہونے کے باعث سید مدد علی شاہ صاحب نے انہیں قریبی علاقہ علی رضا آباد کے مڈل اسکول میں تعلیم کیلئے داخل کروایا۔ آج کا علی رضا آباد معروف قزلباش خاندان کا علاقہ تھا۔ مظفر علی خان قزلباش یہاں کے نواب تھے اسلیئے یہ خطہ "علاقہ نواب صاحب" کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

قزلباش خاندان قدیمی شیعہ خاندانوں میں سے ایک ہے اور تاریخ میں شیعیت کی ترویج کیلئے اس خاندان کی خدمات نمایاں اور قابل تحسین ہیں۔ جب سید مدد علی شاہ صاحب "وطنہ" تشریف لائے تھے تو اس نواب خاندان نے ان کی بے پناہ خدمت کی تھی اور انہیں اپنے ہر ممکنہ تعاون کا یقین دلایا تھا۔

سید غلام عباس شاہ صاحب جب ابتدائی تعلیم حاصل کرنے "علاقہ نواب صاحب" آئے تو نواب مظفر علی خان قزلباش نے انہیں اپنے بچوں کیساتھ ٹھہرایا اور بچوں جیسی شفقت دی۔ سید غلام عباس شاہ صاحب نے مڈل کی تعلیم مکمل کی تو نواب صاحب نے ان کی شرافت اور دیانتداری کی بدولت انہیں اپنی زمینوں کا مختیار بنا دیا۔ خلوص، دینداری اور وفاداری کے باعث شاہ صاحب، نواب خاندان کے اعتماد کی علامت تصور کیئے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کے فیصلوں کو نوابزادگان چیلنج نہیں کرتے تھے۔

انہی ایام میں شاہ صاحب نے عاشورہ محرم کا جلوس اپنے گھر سے برآمد کیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اس سے پہلے محرم کے تمام پروگرام نواب صاحب کی حویلی میں منعقد ہوتے تھے۔ جب شاہ صاحب نے اپنے گھر سے ماتمی جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا تو نواب صاحب نے کہا "ہم تو سادات کے غلام ہیں اور غلام کی حیثیت سے صف ماتم بچھاتے ہیں۔ حقیقت میں پرسہ داری تو سادات کے گھر زیب دیتی ہے"

سید غلام عباس شاہ کو رب کریم نے چار بیٹے سید ظہیر حسین شاہ، سید نذیر حسین شاہ، سید بشیر حسین شاہ اور سید امیر حسین شاہ عطا فرمائے اور ذات باری نے

انہیں پانچ بیٹیوں کی نعمت سے بھی نوازا۔ آپ کی دختران کا شمار انتہائی متقی اور خدا کی برگزیدہ ہستیوں میں سے ہوتا ہے۔ آپ کی چھوٹی دختر نے نجف اشرف میں حرم حضرت علی علیہ السلام پر زندگی گزاری وہیں پہ انتقال فرمایا اور وہیں پہ دفن ہوئیں۔

سید امیر حسین شاہ ۱۴ دسمبر ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ چونکہ آپ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے اسلیئے بہنوں کا انس و پیار بھی آپ سے نسبتاً" زیادہ تھا۔ متقی بہنوں کی تربیت نے آپ کی زندگی پر گہرے اثرات مرتب کیئے اور آپ کی طبیعت روحانیت کی طرف مائل ہوگئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل اسکول علی رضا آباد سے مکمل کی۔ جبکہ میٹرک کا امتحان سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور سے پاس کیا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور سے ایف۔ اے کرنے کے بعد آپ نے ریلوے میں معقول ملازمت اختیار کرلی۔ اسی دوران عربی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات بھی پاس کیئے۔

آپ کی شادی سید رفیق حیدر زیدی کی صاحبزادی سیدہ شمیم فاطمہ سے ہوئی جو بھارت کے ضلع بجنور سے ہجرت کرکے علی رضا آباد لاہور آئے ہوئے تھے۔ اس رشتہ سے خدا نے آپ کو دو صاحبزادے سید محمد علی نقوی و سید عباس علی نقوی اور چھ صاحبزادیاں عطا فرمائیں۔

سید امیر حسین شاہ صاحب نے ملازمت کے دوران بی۔ اے کیا تو ریلوے میں اعلیٰ ملازمت کے معیار پر پورے اترے مگر فطرت میں روحانی عنصر کے غلبہ نے آپ کی سمت بدل ڈالی۔

اسی زمانہ میں مقامات مقدسہ کی زیارت کے شوق نے تڑپایا تو آپ نجف اشرف عراق تشریف لے گئے، روحانی ماحول کی حدود میں داخل ہوئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ عشق کی لذت میں اضافہ ہوا تو ترک وطن کا ارادہ کیا، وطن لوٹے تو ملازمت کو خیرباد کہا اور دینی تعلیم سے سیراب ہونے کیلیئے نجف کی راہ کے مسافر بنے۔

آپ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۸ تک علوم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فیضیاب ہوئے۔ ۱۹۵۸ء کو پاکستان واپس آئے تو "جامعہ امامیہ لاہور" کے پرنسپل ٹھہرے اور "جامعتہ المنتظر لاہور" جو وسن پورہ میں ہوتا تھا کے طلباء کو دروس دینے میں

مصروف ہوگئے۔ اس دوران میں آپ نے مختلف موضوعات پر علیحدہ علیحدہ کتابچے لکھنا شروع کیئے جن میں "ولایت حضرت علیؑ" کے کتابچہ نے خوب شہرت پائی۔

آپ کے علم، تدریسی انداز، زہدو تقویٰ اور تبلیغی رجحان کو دیکھتے ہوئے "کینیا" کے دارالخلافہ نیروبی میں مقیم پاکستانی مومنین نے آپ کو دعوت دی۔ آپ ان کے ہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے آپ سے دینی خدمات کی التماس کی چنانچہ آپ ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے بطور خطیب، پاکستان سے کینیا (نیروبی) چلے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب براعظم افریقہ دنیا بھر کا اہم تجارتی مرکز سمجھا جاتا تھا اور یہاں انگریزوں، عربوں اور برصغیر کے تاجروں نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ مولانا سید امیر حسین نقوی کو چونکہ تبلیغ اسلام سے عشق تھا اسلیئے آپ کو مزاج کے موافق ماحول میسر آیا۔

نیروبی میں آپ کو دیگر مسلم خطباء وائمہ مساجد کی نسبت منفرد مقام حاصل تھا۔ ان ایام میں "سنی ایسوسی ایشن" کے زیر اہتمام مرکزی جشن میلاد منعقد ہوا کرتا تھا جس کے شاہ صاحب نہ صرف منتظم ہوا کرتے تھے بلکہ آپ کو "چیف اسپیکر" کی حیثیت سے اس پروگرام میں مدعو کیا جاتا تھا۔ سنی شیعہ مسلمانوں کی نگاہ میں آپ کا مقام اس قدر بلند تھا کہ وہاں کی حکومت آپ کی ذات کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ تصور کرتی تھی۔ ایک مرتبہ کینیا کی آزادی کی تقریب میں تمام مذاہب کے نمائندگان کو دعوت دی گئی تو حکومت نے مسلمانوں کی طرف سے آپ کو مدعو کیا اور نمائندگی دی۔

چونکہ آپ کو اردو، انگریزی، فارسی، عربی، افریقی اور گجراتی زبان پر عبور حاصل تھا اسلیئے آپ وہاں کے مختلف علاقوں میں تبلیغ اسلام کیلیئے جاتے اور دلائل سے دین محمدیہ کا تعارف کراتے تھے۔

نیروبی میں دو سال قیام کے بعد ۱۹۶۶ء میں آپ تنزانیہ کے شہر "لینڈی" چلے گئے جہاں دو سال تک خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۶۹ء میں آپ "یوگنڈا" کے دارالخلافہ "کمپالہ" تشریف لے گئے جہاں درس قرآن دینے میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ایک مرتبہ وہاں کے غیر مسلم گروہ کے ساتھ مناظرہ طے پایا تو آپ شب بھر خدا کے حضور

دعا کرتے رہے کہ ذات کریم ان کی زبان میں اثر عطا کر دے تاکہ وہ خدا کے دین کو متعارف کرا سکیں۔ صبح مناظرہ ہوا تو آپ نے فتح پائی اور لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔

سید امیر حسین شاہ صاحب نے زندگی کے آخری ایام "برمنگھم" لندن میں گزارے۔ جہاں آپ کو انتڑیوں کا سرطان ہوا۔ آپ کا مرض لا علاج ہوا تو ڈاکٹر محمد علی نقوی اپنے والد بزرگوار کو لینے لندن پہنچے اور آپکو اپنے وطن واپس لے آئے۔ آپ نے زندگی کے آخری ایام شیخ زید اسپتال لاہور میں گزارے اور ۲۱ ستمبر ۱۹۸۷ء کو داعی اجل ہو گئے۔

آپ کے جنازہ میں ملک کے معروف علماء، معززین شہر اور قائد ملت جعفریہ علامہ سید عارف حسین الحسینی نے شرکت فرمائی۔ آپ کے جسد خاکی کو علی رضا آباد میں سپرد خاک کیا گیا۔ جہاں آپ کی مرقد پر لکھا ہوا شعر آپ کا یوں تعارف کراتا ہے۔

دوستوں کا دوست تھا اقرباء کی جان تھی
بندہ مولا علی سادات کی پہچان تھا

☆☆☆☆☆

سفیر انقلاب آغوش مادر سے آغوش مکتب تک

سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی ۲۸ ستمبر ۱۹۵۲ء کو علی رضا آباد لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جس گود میں آنکھ کھولی وہ علوم آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درسگاہ تھی اور جس آنگن میں پروان چڑھے وہ "شہر علم" کا ایک حصہ تھا۔ آپ کو اپنی پشت میں پہلے عالم زادہ ہونے کا اعزاز تو حاصل تھا ہی مگر ملت جعفریہ کے مسیحا علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم کی شفقت آپ کو روز اول سے ممتاز کر گئی۔

محسن ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفیؒ مولانا سید امیر حسین نقویؒ کے بہنوئی تھے۔ ایک بلند پایہ فقیہہ اور روحانی شخصیت ہونے کے ناطے آپ سے نومولود بچے کا نام تجویز کرنے کی استدعا کی گئی۔ چنانچہ آپ نے بچے کا نام "محمد علی" رکھا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ "میری زندگی میں اس نام کے ہر شخص نے ستاروں پر کمند ڈالے ہیں"

نام تجویز کرنے کے بعد جب محسن ملت نے محمد علی کی پیشانی پر درود پڑھ کر ہاتھ رکھا تو بقول شاعر

اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی، تاثیر مسیحائی کی

سید محمد علی نقوی کی پیدائش کے وقت آپ کے والد مولانا سید امیر حسین نقوی نجف اشرف میں تھے۔ آپ اسی سال پاکستان آئے تو واپسی پر اہل خانہ کو ساتھ لے گئے۔ چنانچہ محمد علی کو نجف و کربلا کی فضائیں جذب کرنے کا موقع نصیب ہوا۔

آپ نے چلنا نجف میں سیکھا اور بولنا کربلا میں .... شاید یہی وجہ تھی کہ زندگی بھر آپ کے قدم علیؑ کی بتائی ہوئی سمت میں اٹھے اور آپ کی زبان حسینؑ کی صدائے "ھل من ناصر" کی یاد تازہ کرتی رہی ...... آپ دیکھنے کے قابل ہوئے تو کربلا کا وہ نقشہ دیکھا جس کے بارے شاعر نے کہا تھا

مقتل کی سرزمین پہ بناتے رہے حسینؑ
اسلام کی حیات کا نقشہ تمام رات

تقریباً" چھ سال تک نجف و کربلا کی زمین پر پروان چڑھنے کے بعد انقلاب کا یہ ننھا سفیر اپنے والد کیساتھ کینیا کے دارالخلافہ "نیروبی" آگیا جہاں دو سال تک ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کو پدر بزرگوار کے ہمراہ تنزانیہ کے شہر "لینڈی" اور پھر یوگنڈا کے دارالخلافہ "کمپالہ" آنا پڑا۔ آپ نے ۱۹۶۹ء میں سینئر کیمبرج بھی "اولڈ کمپالہ" سے کیا۔

آپ زمانہ طالب علمی میں مثالی اسکاؤٹ تھے۔ آپ نے اسکاؤٹ کی تربیت "نیروبی" سے حاصل کی اور "کمپالہ" میں بہترین مباحث (DEBATER) کی حیثیت سے اپنا نام روشن کیا۔ آپ مباحثانہ صلاحیت کی بنا پر وہاں کی "DEBATING Society" کے جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے اور ملک بھر کے مقابلوں میں بیسیوں انعامات جیتے۔

۱۹۷۵ء میں آپ اپنے خاندان کیساتھ پاکستان آئے اور لاہور کی معروف درسگاہ "گورنمنٹ کالج" میں ایف۔ ایس۔ سی پری میڈیکل میں داخلہ لیا۔

کالج کے پہلے سال میں ماحول کی تبدیلی اور لاہور میں رشتہ داروں کی قربت نے آپ کی تعلیمی رفتار کو متاثر کیا۔ اسی دوران میں آپ کے اندر کی حس تڑپی تو آپ نے محلّہ کی سطح پر شیعہ نوجوانوں کی تنظیم "شیعہ ینگ ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی اور اس کے روح رواں بن گئے۔ جب آپ کے والد کو آپ کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے تعلیم میں عدم دلچسپی کا شکوہ کیا اور ساتھ میڈیکل کالج میں داخلہ لینے کی صورت میں منہ مانگے انعام کی پیشکش بھی کی ..... منہ مانگے انعام کا سن کر "محمد علی" نے اپنے والد سے وعدہ لیا کہ اگر انہیں چودہ معصومینؑ کی زیارت گاہوں کی زیارت اور عمرہ کی ادائیگی کے اخراجات دیئے جائیں تو وہ میڈیکل کالج کے میرٹ پر پورا اتریں گے۔ والد صاحب نے حامی بھری تو آپ پختہ عزم کے ساتھ مصروف تعلیم

ہو گئے۔ دوسرے سال آپ نے بے پناہ محنت کی اور ۷۰ فیصد سے زائد نمبر حاصل کر کے لاہور میں ایشیاء کے معروف میڈیکل کالج "کنگ ایڈورڈ" کے معیار پر پورے اترے۔

۱۹۷۲ء میں آپ نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی پہلی کلاس میں داخلہ لیا تو وعدہ کے مطابق آپ کے والد نے زیارتوں کے تمام اخراجات آپ کو بطور انعام پیش کر دیئے۔ اسی سال گرمیوں کی تعطیلات ہوئیں تو آپ زیارتوں کیلئے اکیلے عازم سفر ہوئے۔ تقریباً دو ماہ تک مقامات مقدسہ پر حقیقی عشق کی پیاس بجھائی۔ سیراب ہو کر واپس لوٹے تو پاکستان کی تاریخ نے ایک اور محمد علی کی اداؤں کو سمیٹنے کیلئے دامن دراز کر دیئے۔

آئی۔ ایس۔ او کا قیام اور سفیر انقلاب

یوں تو امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان کا قیام ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء کو عمل میں آیا مگر جذبات کے ان بھڑکتے شعلوں کا اصل محرک وہ چنگاری تھی جو ۱۹۶۶ء میں ''شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن'' کی شکل میں چمکی تھی میں سمجھتا ہوں کہ محرک کی معرفت کیئے بغیر کسی چیز کی حقیقت کو گہرائی تک جانچنا مشکل ہوتا ہے لہٰذا مورخ کے حوالہ سے میری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ حال اور مستقبل کے قارئین پر واضح کروں کہ کسی چیز کی تعمیر کتنی مشکل، محنت طلب، پر کٹھن اور پر مصائب ہوتی ہے..؟

۱۹۶۶ء کی بات ہے جب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور کے ڈاکٹر حیدر حسین شمسی نارووال نے کالج کے چند شیعہ احباب کے سامنے شیعہ طلباء کی تعلیمی رہنمائی کیلیئے درد دل بیان کیا۔ ذاتی احباب نے حامی بھری تو برادر موصوف نے ایک شام اپنے کمرہ میں ہوسٹل کے ان تمام شیعہ طلباء کو اکٹھا کیا جن تک ان کی رسائی تھی۔ انہوں نے اس سہانی اور بابرکت شام دوستوں پر دل کی بات واضح کی تو وہ اثر اور خلوص کی بدولت دلوں میں اتر گئی۔

شمسی صاحب کی سوچ اس وقت اپنے ادارے کے شیعہ طلباء کو نوٹس فراہم کرنے اور ان کی تعلیمی رہنمائی تک محدود تھی البتہ انہوں نے جو کچھ سوچا اس پر عمل کر دکھایا۔ تقدیر کے فیصلوں سے کوئی واقف نہیں ہوتا وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے اس کے راستے خود فراہم کرتی ہے۔ یہی کچھ آئی۔ ایس۔ او کے ساتھ ہوا کہ شمسی صاحب کے ''درد'' کی چنگاری، احساس کی فضاؤں سے شعلوں میں بھڑکی اور پھر شعلے بھانبھڑ بنتے گئے۔

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی سطح پر جب اہداف کی تکمیل میں کامیابی ہوئی اور پرانے ساتھیوں کی رہنمائی کی بدولت نئے امامیہ طلباء کے ہر سطح کے مسائل حل ہوئے اور ان کی تعلیمی صورتحال بہتر ہوئی تو ان برادران نے ذاتی طور پر جان پہچان رکھنے والے دوسرے اداروں کے طلباء کو اپنے پروگرام سے آشنا کر کے فکر دی۔ جب شہر کے مختلف تعلیمی اداروں میں امامیہ طلباء کی رہنمائی کا سلسلہ جاری ہوا اور اس

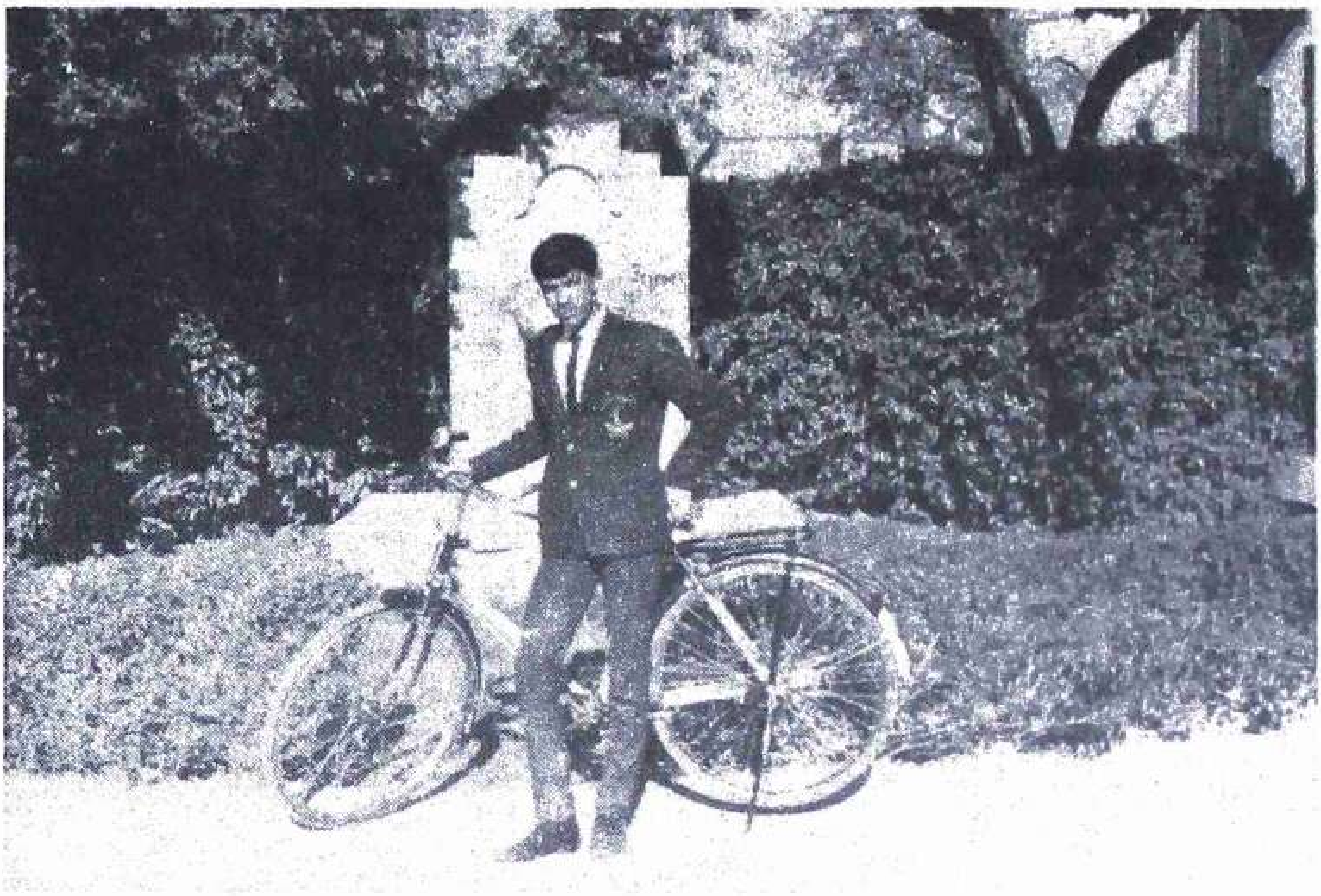

آئی۔ایس۔او کی حلقہ سازی کے لئے دوستوں کے انتظار کا ایک منظر

کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے تو اس فکر کے روح رواں اکٹھے مل بیٹھے اور انہوں نے اسے ایک تنظیم کا روپ دینے کی ٹھانی۔ آغاز میں مختلف اداروں میں مختلف ناموں سے یہ کارواں رواں ہوا کسی ادارہ میں یہ کارواں "شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن" کے حوالہ سے معروف ہوا اور کسی درسگاہ میں اسے "جمیعت طلبا اثنا عشریہ" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ کسی کالج میں یہ قافلہ درد "شیعہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن" کے نام سے مشہور ہوا اور کسی ادارہ میں اس کا نام "جعفریہ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن" رکھا گیا۔

ایک روز مختلف تعلیمی اداروں کے سرکردہ امامیہ طلباء اکٹھے ہوئے تو انہوں نے اپنے پروگرام کو وسعت دینے کا عزم کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر تعلیمی ادارہ میں یہ سلسلہ جاری کیا جائے' کارکنان تلاش کرکے انہیں فکر دی جائے اور انہیں ادارہ کے یونٹ سے مربوط کیا جائے۔

آغاز میں یہ طے پایا کہ تمام کلاسوں کے حاضری رجسٹرز کی پڑتال کی جائے اور وہاں سے جن ناموں پر شیعہ ہونے کا گمان ہو نوٹ کر لیئے جائیں اور پھر ان سے رابطہ کی زنجیر مستحکم کی جائے۔ تھوڑے عرصہ بعد یہ فیصلہ بھی ہوا کہ لاہور کے تعلیمی اداروں کے ہاسٹلز کا گشت کرکے کمروں کے دروازوں پر لکھے گئے معروف شیعہ نام بھی ریکارڈ میں لائے جائیں گے اور ان سے مربوط ہوکر دائرہ کار کو وسعت دی جائیگی۔

قبیلہ سازی کے احساس اور عشق نے مٹھی بھر نوجوانوں کو یوں تڑپایا کہ یہ احباب کالجز میں شیعہ طلباء کی ٹوہ میں رہتے اور چھٹی کے بعد سائیکلوں پر سوار ہوکر مختلف اداروں کے ہاسٹلز میں پہنچ جاتے ..... بھوک نقاہت پیدا کرتی اور نہ پیاس تھکاوٹ ...... ہاسٹلز کے طلباء پیٹ بھر کر کمروں میں سو جاتے تو یہ بھوکے پیاسے جنوں فروغ کمروں کے دروازوں پر لکھے ہوئے نام پڑھتے۔

اپنے اہداف سے مخلص یہ قافلہ درد ہمیشہ موسموں سے بے نیاز رہا البتہ گرمی سے جھلسے ہوئے ان چہروں پر اس وقت پھول سی تازگی آجاتی تھی جب ان کا تیر نشانہ پر ٹھیک بیٹھتا تھا اور سردی سے ٹھٹھرے ہوئے جسموں میں اس وقت حرارت پیدا ہو جاتی تھی جب انہیں کوئی طالب علم "یا علی مدد" کا جواب "پیر مولا علی مدد" کے جملے میں دیتا تھا۔

عشق کی اس تحریک کے روح رواں حیدر حسین شمسی' محمد علی گیلانی اور ماجد نوروز عابدی تھے جو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے جبکہ مبارک علی جھنگ' نسیم الحسنین میانوالی' حمید الحسن رضوی راولپنڈی' شیخ نور محمد لاہور' سید گل محمد نقوی راولپنڈی' سید مطلوب حسین نقوی میانوالی' سید بابر نقوی لاہور' سید اصغر علی شاہ آزاد کشمیر' سید نیاز حسین نقوی بھکر' سید قیصر حسین شیرازی نارووال' فرمان علی بلتستان' ناصر حسین نقوی ڈیرہ اسماعیل خان اور سید امجد علی کاظمی شیخوپورہ جو لاہور کے اداروں میں زیر تعلیم تھے میدان عشق کے عظیم سپوت تصور کیئے جاتے تھے۔ عابدی صاحب انتھک' پردرد اور شیریں مقال تھے اور وہ اپنے ساتھیوں سے ہر موڑ پر کہتے ...... دوستو!

موڑ تو بے شمار آئیں گے
تھک نہ جانا جدا نہ ہو جانا
عشق کی انتہا نہیں ہوتی
عشق کی انتہا نہ ہو جانا
زندگی درد سے عبارت ہے
زندگی سے خفا نہ ہو جانا

ایسے حالات میں جہاں والدین کی توقعات' وسائل کی کمی اور تشخص کے مسائل حائل ہوں کام کرنا کس قدر دشوار تھا یہ ان احباب کو معلوم ہے جن پر داستان عشق بیتی' بعض اوقات والدین کی جھاڑ پاؤں کی زنجیر بنتی اور بعض دفعہ وسائل کی کمی آڑے آجاتی۔ کبھی کبھار نیا ساتھی تلاش کرنے میں خوشی ہوتی تو بعض دفعہ غلط تعارف سے مایوسی کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ ایک مرتبہ ایک ساتھی نے پنجاب یونیورسٹی کے لاء ہاسٹل کے کمرہ پر ایک نام پڑھا جو شیعوں جیسا تھا چنانچہ برادر موصوف اس کے پیچھے پڑ گئے۔ ایک روز وہ لڑکا ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہا تھا کہ جنوں فروغ برادر پہنچ گئے۔ انہوں نے اس کے قریب ہو کر پوچھا "آپ شیعہ ہیں" تو جواب مثبت ملا ......

حقیقتاً وہ لڑکا شیخ تھا شیعہ نہیں تھا۔ مگر حجاب کی گفتگو میں مغالطہ ہوگیا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرہ میں پہنچا تو برادر خوش اس کے ہاں پہنچ گئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد برادر نے اس کے سامنے خم غدیر' کربلا' کوفہ و شام اور سقیفہ کا نقشہ پیش کیا۔ یہاں تک کہ بات تولیٰ اور تبریٰ کی حدود کو عبور کرتی ہوئی "شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن" (ایس ایس۔ اے) کے اغراض و مقاصد تک جا پہنچی۔ برادر جذبات میں بہت کچھ کہہ گئے مگر اس کے چہرے کے تیور نہ بھانپ سکے۔ آخر اس نے پوچھا کہ "یار تم کون ہو' کیسے آئے ہو' تمہیں کس نے بھیجا ہے اور تم چاہتے کیا ہو؟" ایک بار پھر تعارف ہوا تو پھر دونوں پر شیعہ اور شیخ کا عقدہ کھلا اور یوں دونوں حضرات کو خیال آیا کہ

ع ایک نکتہ نے انہیں محرم سے مجرم کر دیا۔

مختصر احباب کی اس مختصر جمیعت نے قلیل عرصہ میں طویل مصائب برداشت کیئے۔ وقت' تعلیم' قوت' وسائل اور آرام کی قربانیاں نچھاور کرکے انہوں نے سفر کو جاری رکھا

ایس۔ ایس۔ اے نے پہلے سال لاہور میں جن تعلیمی اداروں میں امامیہ طلباء سے رابطے کیئے ان میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج' ڈینٹل کالج' گورنمنٹ کالج' گورنمنٹ اسلامیہ کالج' ایم۔ اے۔ او کالج' دیال سنگھ کالج' ہیلے کالج آف کامرس' یونیورسٹی لاء کالج' پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس' انجنیئرنگ یونیورسٹی' وٹنری کالج اور یونیورسٹی اور وٹیل ہوسٹل نمایاں تھے۔

ان اداروں میں جب امامیہ طلباء کی میٹنگ ہوتی تو عموماً پانچ چھ رہنما طلباء سائیکلوں یا اس زمانہ کی ڈبل ڈیکر بسوں پر سوار ہوکر متعلقہ ادارے میں جاتے جہاں چار پانچ احباب پہلے سے موجود ہوتے اور یوں آٹھ دس افراد کی میٹنگ ہوتی۔ عشق کا یہ عالم تھا کہ بس کی دوسری منزل پر جاتے جاتے میٹنگ شروع ہو جاتی۔ منقبت اور اشعار سے جذبوں کو حرارت دی جاتی۔ ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی صاحب عام طور پر شعر

پڑھ کر محفل کو گرماتے آج بھی ان کی ڈائری میں یہ شعر سرفہرست ہے کہ

ہم کل بھی سردار، صداقت کے امیں تھے
ہم آج بھی انکار حقیقت نہ کریں گے

ایک سال کی مسلسل محنت کے بعد "ایس۔ ایس۔ اے" کا پہلا یوم تاسیس کربلا گامے شاہ لاہور میں منعقد ہوا جس میں لاہور کے چودہ تعلیمی اداروں کے طلباء نے شرکت کی۔ اس اجتماع سے پروفیسر عنایت حسین بخاری، مولانا سید عابد حسین عابدی اور مولانا سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل نے خطاب فرمایا۔ یہ اجتماع دیکھ کر "ایس۔ ایس۔ اے" کے قائدین کو بے حد خوشی ہوئی اور انہوں نے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔

۱۹۶۹ء میں "ایس۔ ایس۔ اے" کا دوسرا اجتماع شاہراہ قائد اعظم پر واقع " کانفرنس سنٹر" نزد انار کلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سید مبارک محمود علی گیلانی نے کی اور اس میں خانہ فرہنگ ایران کی ڈائریکٹر جنرل مادام مریم بہنام مہمان خصوصی تھیں۔ ایس۔ ایس۔ اے کے اس اجلاس کی اخبارات نے خاصی تشہیر کی اور باقاعدہ فوٹو لیئے۔ جس پر ایس۔ ایس۔ اے کے قائدین کے حوصلے توانا ہوئے۔ اس عظیم اجتماع میں شرکاء کے سامنے "ایس۔ ایس۔ اے" کا جو سہ نکاتی پروگرام پیش کیا گیا وہ کچھ یوں تھا۔

(۱) شیعہ طلباء کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا۔

(۲) تعلیمی میدان میں ان کا بھرپور تعاون کرنا۔

(۳) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمد علیہ السلام کی سیرت پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دینا۔

اس پروگرام سے نہ صرف قائدین کے حوصلے بلند ہوئے بلکہ شرکاء کے چہرے بھی فرط جذبات سے دمک اٹھے۔ یہ دوست جب ایک دوسرے سے گلے ملے تو ان کے احساسات دلوں میں منتقل ہوگئے۔ قربتوں کے بڑھنے سے محبتوں نے جنم لیا، محبتیں

جوان ہوئیں تو انہوں نے آنکھوں میں کرنوں کے جوت بھر دیے۔ یہ ساتھی اپنے اپنے اداروں میں لوٹے تو خاصے متحرک ہوگئے۔ چنانچہ "ایس۔ ایس۔ اے" کا تیسرا یوم تاسیس دیال سنگھ کالج لاہور میں ہوا تو ایک صد پچیس (۱۲۵) طلباء نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سید ماجد نوروز عابدی نے کی اور مولانا مرتضٰی حسین صدر الافاضل کے علاوہ کئی ایک عمائدین نے خطاب فرمایا۔

۷۰-۱۹۶۹ میں ایوب خان کے خلاف ملک بھر کی سیاسی جماعتوں نے اتحاد کرکے "ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی" تشکیل دی تو ملکی حالات پلٹا کھا گئے۔ اجتماعی مظاہروں اور ہڑتالوں سے جہاں دیگر ادارے متاثر ہوئے وہاں تعلیمی اداروں پر بالخصوص گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ طلباء کی سیاسی سرگرمیوں کی بدولت تعلیمی ادارے وقفہ وقفہ سے بند ہوتے رہے اور یوں طلباء تنظیموں کی فعالیت بھی ماند پڑ گئی۔ ہاسٹلز کے طلباء اپنے گھروں کو بیرون لاہور چلے گئے تو رابطے کمزور ہوگئے۔ چنانچہ حالات کے پیش نظر ایس۔ ایس۔ اے کی کارکردگی بھی متاثر ہوئی۔

۱۹۷۱ میں تعلیمی ادارے باقاعدگی سے کھلے تو امتحانات کی وجہ سے طلباء تعلیم میں مصروف ہوگئے اور امتحان دینے کے بعد سینئر ساتھی تعلیمی اداروں سے چلے گئے۔

ایس۔ ایس۔ اے جمود کا شکار ہوئی تو طلباء کے رابطے بھی کمزور پڑ گئے۔ مرکز نہ ہونے کے باعث مرکزی اجتماع تو سرد ہوگئے مگر طلباء کی فکر متحرک رہی جس کے باعث مختلف اداروں میں مختلف ناموں سے طلباء سرگرم عمل رہے۔

۱۹۷۲ء میں شیعہ طلباء کی منتشر طاقت کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنے کا خیال انجنیئرنگ یونیورسٹی لاہور کے طلباء کو آیا تو انہوں نے اس مشن میں سرگرم طلباء سے رابطے بڑھانا شروع کیئے۔ اس سلسلہ میں برادر علی رضا نقوی اور برادر نیاز نقوی انجنیئرنگ یونیورسٹی سے "کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج" میں زیر تعلیم برادر بابر نقوی اور ایس۔ ایس۔ اے کے بانی رکن ڈاکٹر سید ماجد نوروز عابدی انچارج بلڈ بنک سے ملنے گئے۔ سائیکلوں پر سوار یہ برادران جب میڈیکل کالج کے گیٹ پر پہنچے تو ان کی ملاقات کالج کے گیٹ پر فرسٹ ایئر کے ایک باریش نوجوان سے ہوئی جو سفید ڈاکٹری کوٹ پہنے برق رفتاری سے اپنی کلاس کو جا رہا تھا۔ برادران نے اس پھرتیلے نوجوان کو صدا

دی تو وہ رک گئے۔ علیک سلیک کے بعد برادران نے اس باریش نوجوان سے بابر نقوی اور ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی کے بارے میں پوچھا۔ نقوی اور عابدی جیسے الفاظ سنتے ہی اس نوجوان نے فورا" ان سے ملنے کی وجہ دریافت کی تو برادران حقیقت کو گول کر گئے کیونکہ یہ برادران اس باریش نوجوان کو ریش اور خلوص سے ملنے کی بدولت "اسلامی جمعیت طلبہ" کا کارکن سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ برق رفتار، نرم و ملائم ریش کا مالک، پیکر خلوص و محبت اور چمکتی آنکھوں والا نوجوان "ڈاکٹر محمد علی نقوی" تھا جو بار بار ان برادران سے دل کی بات پوچھ رہا تھا۔

کچھ وقت تلاش کرنے کے بعد جب مطلوبہ افراد نہ ملے تو برادر رضا نقوی اور برادر نیاز نقوی اپنا نام بتائے بغیر چلے گئے اور دو دن بعد واپس آنے کا پیغام چھوڑ آئے۔ کہتے ہیں کہ

؎ تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

یہ دونوں برادران واپس چلے گئے مگر ڈاکٹر محمد علی نقوی نے ڈاکٹر بابر نقوی اور ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی سے رابطہ قائم کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بے قراری کو اس وقت تک قرار نہ آیا جب تک انہوں نے اپنی دعا کا حاصل نہ پایا۔ چونکہ وہ "سفیر انقلاب" تھے اسلیئے تنہا رہنا انہیں دشوار لگتا تھا اور وہ اپنے رب سے یہی دعا کرتے تھے۔

جس کی آنکھیں مجھے اندر سے بھی پڑھ سکتی ہوں
کوئی چہرہ تو میرے شہر میں ایسا لا دے

تیسرے روز برادر نیاز نقوی اور برادر رضا نقوی، بابر نقوی سے ملنے آئے تو ڈاکٹر محمد علی نقوی سے دوبارہ ان کی ملاقات ہوگئی مگر اس بار ڈاکٹر صاحب پر معاملہ عیاں ہو چکا تھا۔ آپ نے برادران کا مؤقف سنا تو فرمایا "چونکہ آپ کا مؤقف خاصا وزنی ہے اس لیئے میں ہر موقع پر آپ کا ساتھ دوں گا" حالانکہ ڈاکٹر صاحب پہلے کسی

کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی یونیفارم میں ملبوس مستقبل کا مسیحا

طلباء تنظیم سے مربوط نہ تھے مگران کے اندر کا انسان پہلے سے بیدار تھا۔

جب برادران کے رابطے مکمل ہوگئے تو انہوں نے ۲۲ مئی ۱۹۷۲ء کو انجنیئرنگ یونیورسٹی میں ایک اہم اجلاس منعقد کیا جس میں تمام تعلیمی اداروں میں مختلف ناموں سے کام کرنے والی شیعہ طلباء تنظیموں کے دو دو نمائندگان نے شرکت کی۔

برادر نیاز نقوی' برادر علی رضا نقوی اور برادر محمد علی نقوی نے دلائل کے ساتھ شرکاء پر مرکزی پلیٹ فارم کی اہمیت اجاگر کی اور ساتھ ہی دو طلباء تنظیموں "اسلامی جمعیت طلبہ" اور "نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن" (این۔ ایس۔ ایف) کی مثالیں بھی دیں۔ جو اپنے اپنے مرکزی پلیٹ فارم کی وجہ سے منظم تھیں۔

طویل بحث و تمحیص کے بعد شرکاء' مرکز کی اہمیت پر رضا مند ہوئے تو مسئلہ نام کا پیدا ہوگیا۔ آخر کار اس مرکزی پلیٹ فارم کا نام "شیعہ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن" تجویز کیا گیا جو پہلے سے خاصا معروف تھا۔

طے پایا کہ "اثنا عشری اسٹوڈنٹس فیڈریشن" اور دیگر شیعہ طلباء تنظیمیں اس میں ضم ہو جائیں گی اور تنظیم کو دستوری شکل میں متعارف کرایا جائیگا۔ چنانچہ دستور سازی کیلئے کمیٹی اور تاریخ کا اعلان کیا گیا۔

شیعہ طلباء کے اس اہم اجلاس اور تنظیم سازی کا علم جب مولانا سید ہادی علی شاہ صاحب (جو انجینئرنگ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے) کو ہوا تو انہوں نے تنظیم کے رہنماؤں سے رابطہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید شیعہ طلباء متحد ہوکر سوشلسٹ یا کیمونسٹ بلاک میں جا رہے ہیں اور ان کا یہ سارا منصوبہ "اسلامی جمیعت طلبہ" کو کمزور کرنے کیلئے ہے۔ یاد رہے کہ آغاز میں جب شیعہ قوم کے پاس اپنا اسلامی اور سیاسی پلیٹ فارم نہ تھا تو شیعہ علماء کرام وسیع تر اسلامی فکر کے حوالہ سے جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابو اعلیٰ مودودیؒ کے نظریات کے حامی ہوتے تھے۔

جب مولانا سید ہادی علی شاہ صاحب پر ماجرا واضح ہوا تو بہت خوش ہوئے اور وہ فوراً مولانا سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل سے ملنے چلے گئے۔ جہاں دو علماء نے شیعہ طلباء کے ابھرتے جذبوں پر نہایت فکر و غور فرمایا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب امامیہ طلباء سے زعماء قوم کے روابط نہ ہونے کے برابر تھے

بلکہ معروف علماء کرام جن کی ممبر و مجالس میں اہمیت تھی وہ بھی وابستگی سے کتراتے تھے اسی وقت ملت جعفریہ کی تین قومی جماعتیں آل پاکستان شیعہ کانفرنس' ادارہ تحفظ حقوق شیعہ اور شیعہ پولٹیکل پارٹی منظر عام پر تھیں۔

آل پاکستان شیعہ کانفرنس کے سربراہ نواب مظفر علی خان قزلباش تھے جو مکمل طور پر حکومت وقت کی منشا کو ترجیح دیتے تھے اور ان پر بعض عمائدین جملہ کستے تھے کہ

تو خیال ہے کسی اور کا تجھے سوچتا کوئی اور ہے

نواب صاحب اس زمانہ میں ایوب خان کی کنونشن مسلم لیگ سے وابستہ تھے اور انہوں نے محترمہ فاطمہ جناح کی بجائے ایوب خان کو سپورٹ کیا تھا۔ اسی طرح ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کو ''تحفظ حقوق شکم'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

ایس۔ ایس۔ اے کا وجود عمل میں آیا تو روایتی رہنماؤں نے ڈورے ڈالنے کی کوشش کی جب انہیں ان کے مزاج سے آشنائی ہوئی تو انہوں نے قوم میں یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ''لونڈوں کی ایک تنظیم ہے جس کی عمر شبنم کے قطرہ سے زیادہ نہیں ہوگی''

ایس۔ ایس۔ اے کے رہنما علماء حقہ سے مربوط تھے اور وہ روایتی رہنماؤں سے بہت دور بھاگ رہے تھے۔ ایس۔ ایس۔ اے کے بانی رکن سے جب میں نے سوال کیا کہ اگر آپ اس وقت گمنام علماء کی بجائے نامور رہنماؤں کے پہلو میں بیٹھ جاتے تو زیادہ مصائب نہ جھیلنے پڑتے اور آپ کا سفر تیزی سے طے ہو جاتا تو انہوں نے جواب دیا کہ

جن کی آنکھیں تھیں انہیں بھی کچھ نظر آتا نہ تھا
ایسے اندھے شہر میں ہم کیا بصارت مانگتے

۲۲ مئی کے اجلاس میں طے شدہ فیصلہ کے مطابق ۱۱ جون ۱۹۷۲ء کو تنظیم کا پہلا باقاعدہ اجلاس ڈاکٹر ماجد نوروز عابدی کی رہائش گاہ پر ہوا۔ جس میں پہلی بار تین علماء کرام مولانا سید صادق علی نجفی، مولانا سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل اور مولانا سید آغا علی موسوی نے شرکت فرمائی۔ اس اہم اجلاس میں تمام تعلیمی اداروں سے شیعہ طلباء تنظیموں نے بھرپور نمائندگی کی جبکہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے برادر مرغوب زیدی، برادر بابر نقوی اور برادر محمد علی نقوی شریک ہوئے۔

تمام شرکاء میں سے برادر علی رضا نقوی انجنیئرنگ یونیورسٹی لاہور اور برادر محمد علی نقوی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج نے دستور پر خاصی دلچسپ اور پر معنی بحث کی۔ اس موقع پر دستور ساز کمیٹی نے جب حاضرین کے سامنے دستور پیش کیا تو برادر خیر محمد بدھ اور برادر اعجاز رسول نگری جو لاء کے طالب علم تھے نے قانونی شق پیش کی کہ "فیڈریشن" اور "ایسوسی ایشن" کبھی ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکتیں۔ اس نکتہ کے بعد خاصی سراسیمگی پھیلی، آخر سوچ بچار کے بعد مولانا سید علی موسوی سے استخارہ کی استدعا کی گئی۔ مولانا صاحب نے استخارہ کیا تو آئی۔ ایس۔ او کے نام کی تائید ہوگئی مولانا مرتضیٰ حسین صاحب نے "امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان" کے نام کا اعلان کیا اور فرمایا بہت اچھا نام ہے خدا برکت فرمائے، برادران کو بھی اس کا مخفف (iso) بہت پسند آیا کیونکہ علم کیمیا میں آئی سو (i-s-o) کا مطلب "ایک جیسا" ہونا ہے۔

اس موقع پر امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی پہلی عبوری کابینہ کا اعلان ہوا تو برادر سید مرغوب زیدی مرکزی صدر برادر خیر محمد بدھ نائب صدر، برادر شیخ نوازش علی جنرل سیکریٹری برادر علی رضا نقوی جوائنٹ سیکریٹری، برادر فیض بخش لائبریری سیکریٹری اور برادر محمد علی نقوی آفس سیکرٹری منتخب کئے گئے۔

آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے پلیٹ فارم پر پہلا پروگرام "یوم حسینؑ" پنجاب یونیورسٹی کے سیمینار ہال میں منعقد ہوا جس میں حنیف رامے جو اس وقت صوبائی وزیر خزانہ تھے، مولانا مفتی جعفر حسین، مولانا سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل اور مولانا سید صادق علی نجفی صاحب نے خطاب فرمایا۔ اس پروگرام سے عوامی سطح پر

تنظیم کو پذیرائی ملی اور یوں ملک کے بڑے تعلیمی ادارے میں پہلی بار آئی۔ ایس۔ او متعارف ہوئی۔

اس کے بعد لاہور اور دیگر شہروں میں تنظیم کے تعارف کیلئے کیلنڈر شائع کرایا گیا جس میں امام حسین علیہ السلام کے روزہ مبارک کی تصویر تھی اور نیچے تنظیم کا نصب العین اور نام تحریر تھا۔

اس کیلنڈر کی اشاعت کے پیچھے ڈاکٹر محمد علی نقوی کا جذبہ کار فرما تھا۔ انہوں نے نثار آرٹ پریس لاہور سے یہ کیلنڈر شائع کروایا تھا اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے گیٹ پر کرسی پر چڑھ کر اسے فروخت کیا تھا۔ چونکہ اس وقت ملک میں فرقہ واریت کی زہر نہ پھیلی تھی اس لیئے یہ خوبصورت کیلنڈر بہت سے اہلسنّت برادران نے بھی خریدا اور پسند کیا۔

جب لاہور میں زیر تعلیم طلباء تعطیلات میں اپنے اپنے شہروں کو گئے تو وہ یہ کیلنڈر بھی ساتھ لے گئے یوں آئی۔ ایس۔ او کی خوشبو ملک کی فضاؤں میں پھیل گئی اور برادران نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔

؎ خدا کرے تیرے روز روشن کی دلکشی میں نہ فرق آئے

☆☆☆☆☆

آئی۔ ایس۔ او کا رخت سفر اور سفیر انقلاب

شب تاریک رشک روز ہوگی عزم پیہم سے
ہم اپنی جستجو کو ماہ کامل کرکے چھوڑیں گے

اس عزم و فکر کے امین مٹھی بھر نوجوان قومی درد کا زخم سینے پر سجا کر ہواؤں کی مخالف سمت کو چلے اور ""حی علیٰ خیرالعمل" کا نعرہ لگاتے ہوئے منزل کی جانب رواں ہوئے۔ اس مختصر قافلہ کی صدا میں اتنا درد تھا کہ خوابیدہ لوگ بیدار ہوئے اور بیدار، متحرک ہوگئے۔

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ کربلا کے ان زخمی مسافروں میں نحیف جسم کا مالک ایک "سفیر انقلاب" بھی تھا جو قوم کے نوجوانوں کو بار بار یہ صدا دے رہا تھا۔

اب وقت آگیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہئے

ابھی یہ خاک نشیں چلے ہی تھے کہ اس وقت کے تخت نشینوں سے سامنا ہوگیا۔ ۱۹۷۲ کا واقعہ ہے کہ ملت جعفریہ جو اس وقت "شیعہ مطالبات کمیٹی" کے پلیٹ فارم سے متحرک تھی اور جس کی قیادت سید محمد دہلوی فرما رہے تھے کو حکومت کی بعض پالیسیوں سے اختلاف ہوگیا۔ چنانچہ شیعہ قائدین، وفاقی وزیر تعلیم حفیظ پیر زادہ سے شیعہ طلباء کیلئے علیحدہ اسلامیات، اوقاف اور عزاداری کے مسائل پر مذاکرات کرنے راولپنڈی پہنچے۔ اس اہم اور حساس اجلاس کی اطلاع آئی۔ ایس۔ او کے برادران کو علامہ مرتضیٰ حسین صاحب کے ذریعہ موصول ہوئی تو برادر علی رضا نقوی جوائنٹ سیکریٹری اور برادر شیخ نوازش علی جنرل سیکریٹری پروگرام کے مطابق ڈاکٹر اجمل حسین کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ بھاری بھرکم شخصیات کے مالک قائدین نے ان دو نوجوانوں

کا تعارف چاہا تو برادران نے اپنا تنظیمی تعارف کرایا۔ اس موقع پر بعض قائدین نے حوصلہ افزائی کی اور بعض نے اہمیت نہ دی۔

طے شدہ وقت کے مطابق یہ قافلہ وزیر اعظم سیکریٹریٹ پہنچا وعدہ کے باوجود پیر زادہ صاحب وقت پر نہ آئے تو ان کے سیکریٹری نے ان کی نمائندگی کرتے ہوئے شیعہ قائدین سے پیر زادہ کی عدم آمد پر معذرت کی اور عذر پیش کیا کہ وہ قومی اسمبلی کے اہم اجلاس میں مصروف ہیں۔ قائدین کو یہ بات ناگوار گزری مگر وہ خاموش رہے۔ ایسے میں آئی۔ ایس او کے برادران اٹھے اور انہوں نے سیکریٹری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "حفیظ پیر زادہ صاحب نے چند قائدین کی بے عزتی نہیں کی بلکہ یہ پوری ملت جعفریہ کی تذلیل ہے اور ہم اس ہزیمت کا بدلہ لیں گے" سیکریٹری نے نوجوانوں کا تعارف چاہا تو انہوں نے بتایا کہ وہ شیعہ طلباء کی ملک گیر تنظیم آئی۔ ایس۔ او کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ لہٰذا وہ تعلیمی اداروں میں وزیر تعلیم کے رویہ کے خلاف احتجاج کریں گے۔

یہ سن کر سیکریٹری واپس گیا اور قومی اسمبلی کے اجلاس سے حفیظ پیر زادہ کو لے آیا۔ مذاکرات ہوئے اور مطالبات تسلیم کیے گئے۔

آئی۔ ایس۔ او کے برادران کی جرأت کو دیکھ کر قائدین خاصے متاثر ہوئے انہوں نے پذیرائی کی اور اپنے پتہ جات دے کر رابطہ کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ مرکزی قائدین کیساتھ آئی۔ ایس۔ او کے برادران کی پہلی میٹنگ نے اس قدر اچھا تاثر قائم کیا کہ پھر ہر اہم اجلاس میں آئی۔ ایس۔ او کو نمائندگی دی جانے لگی۔

جب یہ برادران سرخرو ہوکر لوٹے تو احباب کے حوصلوں کو اٹھان ملی جبکہ کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ انہیں پہلے تعلیمی اداروں میں مستحکم ہونا چاہئے پھر کہیں جاکر مرکزی قومی اجلاس میں شرکت اور دعوے کرنے چاہئیں۔ مگر ڈاکٹر محمد علی نقوی نہ صرف اس قدم پر بے حد خوش ہوئے بلکہ زندگی بھر تنظیم کی پہلی فتح کا فاتحانہ انداز میں ذکر فرماتے رہے۔ بڑے بڑے معرکے سر کرنا ان کا عشق اور بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کرنا ان کی جستجو رہی ہے وہ خود بھی اس نظریہ پر کاربند رہے اور عمر بھر ساتھیوں کو بھی یہ درس دیتے رہے۔ کہ

زندگی کے ابتدائی دور میں بھی کم سے کم
آدمی کو عرش تک پرواز کرنا چاہیے
اور جب جنبش میں آجائیں پرو بال حیات
عرش سے پرواز کا آغاز کرنا چاہیے۔

آغاز سفر میں جن مشکلات نے اس کارواں کی راہ میں سر اٹھائے اور کسی حد تک حائل ہوئیں وہ تعلیمی اداروں میں شیعہ طلباء کو اپنے اہداف کی طرف مائل کرنا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پیپلز پارٹی کا طوطی بول رہا تھا۔ عوام نظریاتی طور پر دو دھڑوں میں تقسیم تھے۔ ایک طرف مذہبی جماعتیں روایتی طور پر سینہ سپر تھیں جبکہ دوسری جانب سوشلزم کا سحر طاری تھا۔ پاکستان کے درماندہ عوام سوشلزم کی طرف مائل تھے جبکہ اہل تشیع "حب علی کم بغض معاویہ زیادہ" کی بنا پر ذوالفقار علی بھٹو کے طلسم میں آچکے تھے۔ یہی صورتحال تعلیمی اداروں کی تھی طلباء بھی واضح طور پر دو حصوں میں بٹ چکے تھے ایک طرف "اسلامی جمعیت طلبہ" تھی جبکہ دوسرا بلاک کمیونزم اور سوشلزم کا تھا۔ شیعہ طلباء کی اکثریت دوسرے بلاک میں تھی اور جذبات کی رو میں بہے جا رہے تھے۔ لہٰذا ایسے میں انہیں اس بلاک سے جدا کرکے اسلامی اقدار کے دائروں میں لانا خاصا مشکل کام تھا۔

اس صورتحال میں آئی۔ ایس۔ او کے بعض بانی برادران کا خیال تھا کہ ابتدائی مرحلہ میں اپنے طلباء کو دیگر طلباء سے جدا کرکے کمزور نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان سے اپنی استطاعت کے مطابق کام لیتے رہنا چاہئے۔ مگر ڈاکٹر محمد علی نقوی کا نظریہ روز اول سے بڑا واضح تھا کہ "ہم تعداد میں چاہے کتنے ہی کم ہوں مگر ہمارا ہر قدم اسلام کی راہ میں اٹھنا چاہئے کمیونزم اور سوشلزم چاہے کسی روپ میں ہوں اسلام سے متصادم ہیں لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے طلباء کو اسلام کے مفاہیم سے آگاہ کریں"

سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی چونکہ عالم زادہ ہونے کے علاوہ علامہ سید صفدر حسین نجفی کے تربیت یافتہ تھے اسلیئے ان کی رگ رگ میں اسلام کی روح سموئی ہوئی

تھی۔ وہ آئی۔ ایس۔ او میں پہلے نوجوان تھے جو آغاز ہی میں نظریہ اسلام سے واقف اور اسلامی احکامات کے سختی سے پابند تھے۔ آئی۔ ایس۔ او میں پہلے باریش نوجوان ہونے کا اعزاز بھی انہیں حاصل تھا اور عبادات خدا میں گریہ کا شرف بھی انہی کے حصہ میں جاتا تھا۔

آپ کے تقویٰ، اسلام شناسی اور خلوص کی بدولت تعلیمی اداروں میں تعارف تنظیم اور دروس کی ذمہ داری آپ کو تفویض کی گئی۔ آج بھی اگر ۱۹۷۲۔۱۹۷۳ کا تنظیمی ریکارڈ ملاحظہ فرمائیں تو جابجا ڈاکٹر صاحب کے دروس کے حوالے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ نے اس وقت کے طلباء سے جذبات سے نہیں بلکہ دلائل کیساتھ اپنا نظریہ منوایا کمیونزم سوشلزم کے علمبردار "لینن اور ماؤزے تنگ" کے مقابلہ میں اسلام کے محسن محمد عربی اور شہید انسانیت حضرت امام حسین علیہ السلام کو پیش کیا۔ آپ کے دلائل میں اتنا وزن تھا کہ ہر باشعور طالب علم کو قائل ہونا پڑا اور آپ کے خلوص میں اتنا اثر تھا کہ قوم کا درد رکھنے والے ہر شخص نے شامل کارواں ہونے کا عزم کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے احساس کے چشمہ سے پھوٹنے والا پانی دریا کی موجوں کی صورت اختیار کر گیا جن کے ساحل سے ٹکرانے کی صدا پیغام بن کر دور تک سنائی دینے لگی۔

جس میں خلوص فکر نہ ہو وہ سخن فضول
جس میں نہ دل شریک ہو اس لئے میں کچھ نہیں

آئی۔ ایس۔ او کے چمن میں جب کلیاں کھلنے لگیں اور پھول اپنا روپ دھارنے لگے تو ان کے سینوں سے نکلی ہوئی خوشبو فضاؤں میں پھیلی اور قوم کے روایتی رہنماؤں کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ بہت سے قائدین کی یہ خواہش رہی کہ یہ خوشبو ان کے قیادتانہ لباس پر رہے اور وہ حکومتی ایوانوں میں اس کا احساس دلوا سکیں۔ مگر ان کی یہ خواہش ان کے ارمان بن کر رہ گئی کیونکہ اس تنظیم کی سرپرستی علماء حقہ کو نصیب تھی جو مفادات کی حدود سے بہت آگے نکل چکے تھے۔

ان حالات میں چند معتبر رہنماؤں نے آئی۔ ایس۔ او کو خریدنے اور بغل بچہ

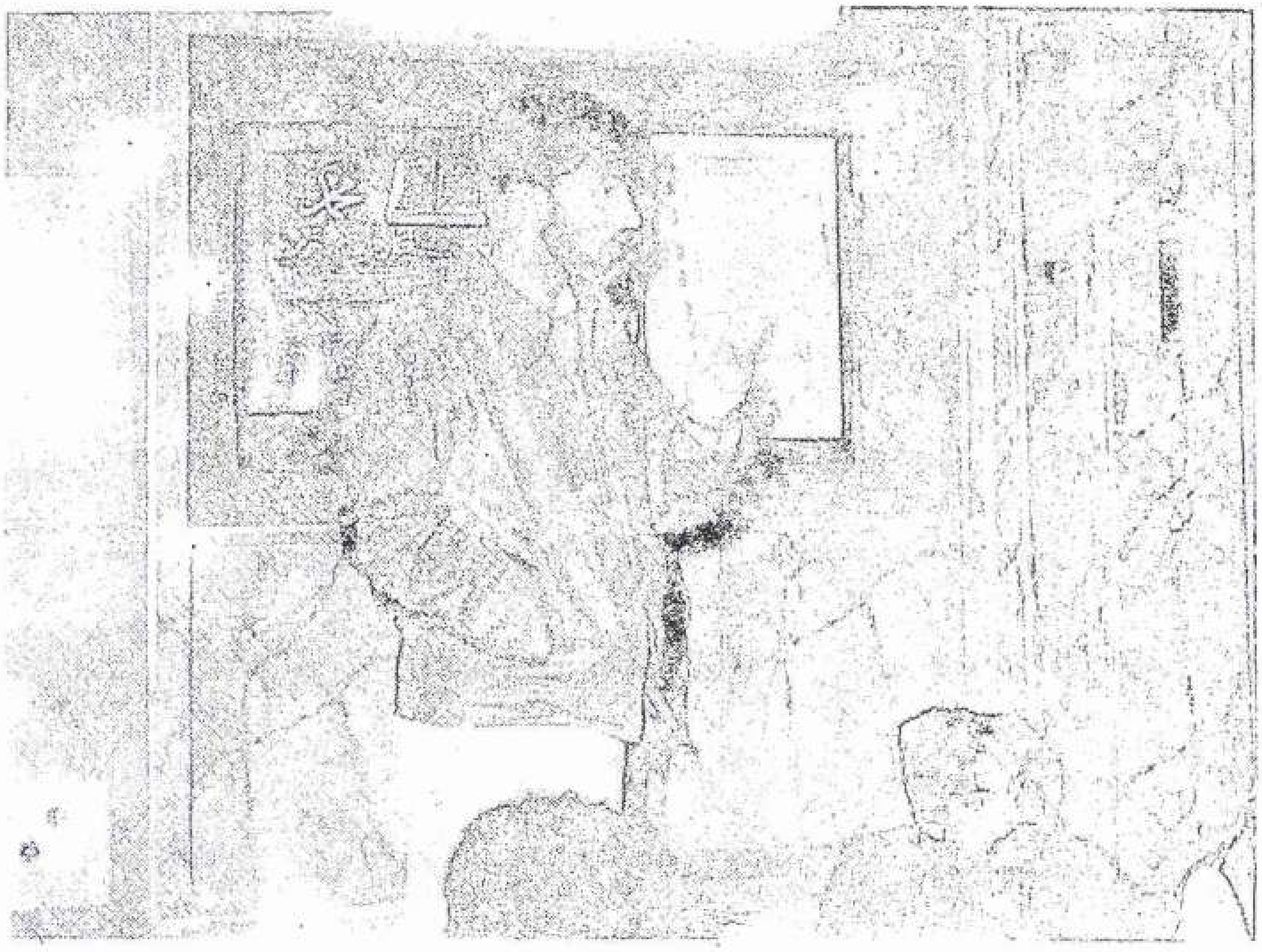

امامیہ برادران سے خطاب کرنے کا ایک انداز

میڈیکل کالج کے فیلوز کیساتھ ....

بنانے کی کوششیں بھی کیں جو یکسر ناکام رہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تنظیم کو مالی مشکلات کا سامنا ہوا اور پے در پے دفاتر بھی تبدیل کرنے پڑے۔ برادران نے ہر مشکل برداشت کی، نشیب و فراز کے کئی مراحل عبور کیئے مگر ہر موڑ اور ہر قدم پر اپنے حلف پر قائم رہے اور آج بھی اپنے تنظیمی احباب پر وہ واضح کرتے ہیں کہ

قیادتوں کے جنوں میں جن کے قدم لہو سے رنگے ہوئے تھے
ہمارے بس میں نہیں تھا یارو کہ ان کو عزت مآب کہتے

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ تک تنظیم کا مرکزی دفتر گنپت روڈ اور ریٹی گن روڈ سے ملتان روڈ جعفریہ مسجد لاہور تک لڑکھڑاتا رہا۔ جگہ کی کمی کے باعث احباب نے یہاں خاصے مسائل جھیلے۔۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب مرکزی صدر بنے تو مرکزی دفتر کو اپنے گھر سے متصل مکان ۱۴۶۔ بھلا سٹاپ۔ ملتان روڈ پر لے آئے جہاں بارہ سال تک تنظیم نے قیام کیا، آپ کی شفقت اور نگرانی میں پروان چڑھی اور یہاں سے شباب تک پہنچی۔

توسیع تنظیم:۔

۱۹۷۴ تک آئی۔ ایس۔ او پاکستان لاہور کے تعلیمی اداروں تک محدود رہی تاہم لاہور میں اس کے یونٹس خاصے نکھر کے سامنے آئے۔ یونٹس اور مرکز کے روابط کا ڈھانچہ مستحکم ہوا تو احباب نے توسیع تنظیم کی ٹھانی۔ دو سالوں میں تنظیم ملک کے اہم شہروں تک متعارف ہو چکی تھی مگر اس کا تعارف اہم افراد تک محدود تھا۔ طے پایا کہ مرکزی برادران پنجاب کے اہم شہروں کا دورہ کریں وہاں کے قائدین اور طلباء سے ملیں اور ان تک اپنا پیغام پہنچائیں۔ چنانچہ اپنا پیغام محبت پہنچانے کیلئے لاہور سے برادر علی رضا نقوی، برادر نیاز حسین نقوی، برادر زاہد حسین بخاری، برادر گل محمد نقوی اور برادر شبر عباس صدیقی عازم سفر ہوئے۔ یہ قافلہ درد ساہیوال، خانیوال، ملتان، ڈیرہ غازیخان، لیہ اور بھکر کے دور دراز علاقوں تک پہنچا۔ ہر شہر میں پڑھے لکھے

اور ملی درد رکھنے والے افراد سے ملا، اپنا پیغام پہنچایا اور پذیرائی حاصل کی۔ جہاں بھی یہ برادران پہنچے۔ "حی علی خیر العمل" کی صدا بلند کی۔ لوگ ان کے قریب آئے تو انہوں نے انہیں متوجہ کیا۔

ہماری بات سنو اور ہمارے ساتھ چلو
ہماری بات ہی اک دن بنے گی افسانہ

لوگوں نے اس قافلہ کے پیغام کو بغور سنا، جذبوں کو سراہا، تعاون کا یقین دلایا، ہمت، حوصلے اور دعائیں دیں۔ پنجاب کے شاداب کھیتوں سے روانہ ہونے والا یہ کارواں ڈیرہ غازیخان کے میدانوں سے ہوتا ہوا بھکر کے ریگستانوں تک پہنچا تو ہر مقام پر پذیرائی میں اضافہ ہوا۔ حوصلوں کو تقویت ملی تو یہ برادران اپنا تنظیمی گیت۔

اونچا رہے اپنا علم — حی علیٰ خیر العمل
بڑھتے رہیں یونہی قدم — حی علیٰ خیر العمل

گاتے ہوئے راولپنڈی پہنچ گئے۔ وہاں بھی اپنا پیغام پہنچایا، شفقتیں اور عقیدتیں وصول کیں۔ ایک طویل دورہ کرنے کے بعد یہ قافلہ گنگناتا اور چہچہاتا لاہور پہنچا، مرکز کو اپنی رپورٹ پیش کی تو خوشی سے احباب کی پلکیں بھیگ گئیں۔

ڈاکٹر محمد علی نقوی نے داستان سفر سننے میں اتنی دلچسپی لی کہ بعض برادران کو اپنے گھر لے گئے اور ان سے شب بھر مسافتوں کا حال پوچھتے رہے اور بعض برادران کے گھر یا ہاسٹلز کے کمروں میں جاکر ان سے روداد سنی۔ داستان کی لذت سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ لائل پور (فیصل آباد) کے دورہ کیلئے کمر باندھ لی۔

لائل پور کے پہلے تنظیمی دورہ میں ڈاکٹر صاحب نے میر کارواں کا کردار ادا کیا اور وہاں کی شخصیات اور طلباء کو مل کر اپنے اہداف سے متعارف کرایا۔ لائل پور میں پہلے سے شیعہ طلباء خاصے متحرک تھے اور انہوں نے "انجمن محبان اہلبیتؑ" کے

پلیٹ فارم پر کام کا آغاز کیا ہوا تھا لہٰذا انہیں مذہبی میدان میں کام کرنے کیلئے آمادہ کرنے میں دقت پیش نہ آئی البتہ ان کی تنظیم کو آئی۔ ایس۔ او میں ضم کرنے میں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔

آئی۔ ایس۔ او کے برادران کا موقف تھا کہ لائل پور کے برادران معمول کے مطابق کام کرتے رہیں البتہ انکا تشخص آئی۔ ایس۔ او کے حوالہ سے ہو اور وہ مرکزی تنظیم کی نمائندگی کریں۔ جبکہ "انجمن محبان اہلبیتؑ" کے مرکزی قائدین مرکزی پلیٹ فارم کے قائل ہونے کے باوجود بھی اپنی تنظیم کو تحلیل یا ضم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ لوگ ان کے اس پلیٹ فارم پر زیادہ معاون ہیں اور وہ تیزی سے ترقی کر رہے ہیں۔ طویل بحث کے بعد "انجمن محبان اہلبیتؑ" کے چند برادران آئی۔ ایس۔ او میں ضم ہونے پر متفق ہوگئے جبکہ چند مرکزی برادران نے تعاون کی حامی نہ بھری۔

۱۹۷۴ء میں انجنیئرنگ یونیورسٹی لاہور کے زیر اہتمام فارغ التحصیل طلباء کے اعزاز میں الوداعی پارٹی ہوئی تو ڈاکٹر محمد علی نقوی نے لائل پور کے برادران کو خصوصی دعوت دی۔ اس موقع پر یہ برادران خاصے متاثر ہوئے اور آئی۔ ایس۔ او میں ضم ہونے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ایک بار پھر لائل پور (فیصل آباد) کا دورہ کیا اور آئی۔ ایس۔ او کی بنیاد رکھی۔

۷۵-۱۹۷۴ء کے مرکزی صدر کیلئے انتخابات ہوئے تو برادران آئی۔ ایس۔ او نے لائل پور زرعی یونیورسٹی کے طالب علم سید ناصر حسین نقوی کو مرکزی صدر منتخب کیا اور یوں لاہور کے بعد تنظیم لائل پور میں خاصی مضبوط ہوگئی۔

برادر سید ناصر حسین نقوی کی کابینہ میں ڈاکٹر محمد علی نقوی بحیثیت مرکزی جنرل سیکرٹری لیئے گئے۔ جبکہ اس سے پہلے وہ نشرواشاعت سیکرٹری' آفس سیکرٹری اور جوائنٹ سیکرٹری کے عہدوں پر کام کرتے رہے۔ احباب کے بقول کہ ڈاکٹر صاحب کو آفس سیکرٹری کی ذمہ داری ہمیشہ اچھی لگتی تھی ان کا خیال تھا کہ جس تنظیم کا مرکزی آفس جس قدر مستحکم اور یونٹس سے مربوط ہوگا وہ تنظیم اسی قدر ترقی کرے گی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے دو سال میں تنظیمی ڈھانچے اور امور کو اس خوش اسلوبی

سے انجام تک پہنچایا کہ تنظیم کی جڑیں مضبوطی پکڑ گئیں۔

جب آپ مرکزی جنرل سیکرٹری بنے تو تمام عہدیداران سے زیادہ متحرک اور فعال نظر آئے۔ لاہور کی سطح پر کہیں بھی کوئی تنظیمی اجلاس ہوتا تو ڈاکٹر نقوی اپنی سائیکل پر سب سے پہلے پہنچے ہوئے ہوتے۔ بقول برادر سید ناصر حسین نقوی کہ وہ اگرچہ مرکزی صدر تھے مگر انہیں بھی متحرک رکھنے میں ڈاکٹر محمد علی نقوی کا ہاتھ تھا۔ وہی طلباء سے مربوط رہتے' وہی نشرواشاعت کرتے اور بڑے بڑے پروگرام منعقد کراتے۔ ان کے تحرک کا یہ عالم تھا کہ اس وقت کے احباب انہیں مٹی کا نہیں بلکہ لوہے کا بنا ہوا انسان سمجھتے تھے۔

۱۹۷۵ء میں پہلی بار آئی۔ ایس۔ او کے تنظیمی دامن میں وسعت آئی اور تنظیم لاہور سے نکل کر فیصل آباد پہنچی۔ فیصل آباد کے تعلیمی اداروں میں لاہور کی طرز کا کام کیا گیا اور ایک سال کے اندر اکثر درسگاہوں میں آئی۔ ایس۔ او کے یونٹس قائم ہوگئے اس کے ساتھ ہی ملتان' راولپنڈی اور پشاور میں بھی تنظیم سازی کی گئی اور وہاں بھی یونٹس کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح ۷۵۔۱۹۷۴ء کے تنظیمی سیشن میں آئی۔ ایس۔ او باقاعدہ طور پر فیصل آباد' ملتان' راولپنڈی اور پشاور میں مصروف کار ہوگئی۔

تنظیم سازی کے پورے سفر میں ڈاکٹر محمد علی نقوی نمایاں رہے وہ جہاں بھی جاتے گفتگو میں دلائل کے انبار لگا دیتے ۔ انہیں خدا نے مسکرا کر دل میں اتر جانے کا انداز عطا فرمایا تھا۔ تنظیمی اہداف میں وہ بڑے واضح تھے۔ اسلامی اقدار پر بحث کا بھی انہیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ اتنی پرخلوص اور لطیف گفتگو کرتے کہ سننے والے ان کے عقیدتمند بن جاتے اور عقیدتمند ان کے کارواں کی طاقت بنتے۔

انہوں نے اپنا پیغام پہنچانے میں مشکلات کے طویل صحرا عبور کیئے اور مصائب کے کوہ سر بنے۔ وہ آئی۔ ایس۔ او کے پہلے نمائندہ تھے جو پارا چنار (کرم ایجنسی) کے پہاڑوں کے دامن میں پہنچے اور وہاں کے نوجوانوں پر واضح کیا۔ کہ عزیز دوستو ....

دلوں میں فاصلے اتنے نہیں ہیں
زمانہ درمیاں آیا ہوا ہے

1975ء میں مرکزی کابینہ کا گروپ فوٹو

خیبر میں تنظیمی کامیابی کے پرچم گاڑنے کے بعد یہ سفیر انقلاب کراچی پہنچا اور وہاں "ڈاؤ میڈیکل کالج" میں ایک دوست کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچایا' آپ اپنے اس دوست کو لاہور بھی لائے اور اسے پیغامبر ہونے کے اسلوب سکھائے۔ وہ واپس کراچی گئے تو انہوں نے تنظیم کی توسیع میں مثالی کردار ادا کیا۔

۷۶-۱۹۷۵ء میں آئی۔ ایس۔ او ملک بھر میں پھیلی تو اس کا چوتھا سالانہ کنونشن دفتر سے نکل کر پنڈالوں میں آگیا۔ یہ آئی۔ ایس۔ او کا پہلا کنونشن تھا جو "جامعتہ المنتظر لاہور" میں منعقد ہوا جس کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ جبکہ اس سے قبل تنظیم کے پہلے کنونشن ریٹی گن روڈ پر ہوئے۔ اس کنونشن میں مختلف ڈویژنز سے سینکڑوں طلباء شریک ہوئے تو آئی۔ ایس۔ او کے بانیان اور مرکزی رہنما بے پناہ خوش ہوئے۔ ڈاکٹر محمد علی نقوی تو اس قدر پر مسرت تھے کہ وہ ہر ساتھی کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ان کے سینوں پر آئی۔ ایس۔ او کے "بیجز" لگاتے رہے۔ وہ کنونشن کے سٹیج سیکرٹری بھی تھے اور منتظم بھی ..... اس موقع پر ان کے جذبات ان کی آنکھوں سے نمایاں تھے اور ان کا جوش و عزم ان کے لہجے سے ٹپک رہا تھا۔ وہ احباب کے سامنے جب بھی سٹیج پر آتے تو جذبات اور عزم میں ڈوب کر کہتے۔

ابر پاروں پہ چلو' چاند ستاروں پہ اڑو
یہی اجداد سے ورثہ میں ملا ہے تم کو

کنونشن کے پروگرام ختم ہوتے تو چاک و چوبند اور کانوں میں لہجے کی مٹھاس کا رس گھولنے والا سفیر انقلاب برادران کے حلقوں میں آتا .... ہر ایک کو گلے لگاتا' ان کی تکالیف دریافت کرتا' ان کے تاثرات لکھتا' مشکلات پر ان سے معذرت چاہتا اور ان کی خدمت کیلئے رواں ہو جاتا .... دن بھر وہ تنظیمی امور بجا لاتا' رات کو خوردو نوش کے اہتمام کرتا اور اگر اسے وقت مل جاتا تو وہ برتن تک صاف کرتا

......جب رات کو احباب سو جاتے تو حسینؑ کے اس پیغامبر کی فکر عشق کی مستی میں گنگناتی۔

کربلا سے انس ہے نجف سے لگاؤ ہے
دھڑکنوں میں آج بھی عشق کا الاؤ ہے
رنگ بھر رہا ہوں میں خاکہ حیات میں
آج بھی ہوں منہمک فکر کائنات میں
حرف حق عزیز ہے ظلم ناگوار ہے
عہد نو سے آج بھی عہد، استوار ہے
دل ابھی بجھا نہیں
غم ابھی لٹا نہیں
میں ابھی مرا نہیں

☆☆☆☆☆

سفیر انقلاب کی مرکزی صدارت

۷۷۔۱۹۷۶ کے دورانیہ کے لئے جب مرکزی صدر کے امیدوار کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو مجلس عاملہ، مجلس مشاورت اور سینئر برادران کی نظروں میں ڈاکٹر محمد علی نقوی سے زیادہ مناسب امیداوار کوئی نہ جچا۔ جب آپ سے برادران نے اظہار فرمایا کہ وہ اگلے سال کے لئے ان کی ذات کو بطور امیدوار برائے مرکزی صدر لانا چاہتے ہیں تو آپ نے معذرت کی اور فرمایا "مرکزی صدر بننا میرے مزاج کا حصہ نہیں ہے اور نہ ہی میں خود کو اتنی بڑی مسئولیت کے قابل سمجھتا ہوں"۔

جب آپ نے تمام برادران کو واضح الفاظ میں انکار کیا تو مجلس مشاورت کے معزز رکن سید امجد علی کاظمی ایڈوکیٹ نے آپ سے گلاب دیوی ہسپتال لاہور میں ملاقات کی جہاں آپ اپنی پھوپھی کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ کاظمی صاحب کئی گھنٹوں تک آپ پر تنظیمی ضرورت اور حالات کے تقاضوں کو واضح کرتے رہے مگر آپ نہ مانے۔ جب تنظیمی احباب اور مجلس مشاورت کے اراکین کے تقاضے بڑھے تو آپ نے استخارہ کرنے کی استدعا کی۔ استخارہ حق میں آیا تو آپ بطور امیداوار رضامند ہو گئے۔

اس وقت طریقہ انتخاب آج سے قدرے مختلف ہوتا تھا۔ مجلس مشارت جو آج مجلس نظارت ہے۔ مرکزی صدارت کیلئے ایک نام، طلباء کے سامنے پیش کرتی اس پر "YES" یا "NO" لکھنا پڑتا تھا۔ گویا وہ انتخاب ایک ریفرنڈم ہوتا تھا۔ چنانچہ جب طلباء کے سامنے آپ کا نام پیش کیا گیا تو تمام طلباء نے آپ کی حمایت میں ووٹ ڈالے۔

جب بطور مرکزی صدر آپ کو سٹیج پر لایا گیا تو آپ اشکبار تھے۔ سید امجد علی کاظمی رکن مجلس مشاورت نے آپ سے حلف لیا۔ حلف کے دوران جب یہ جملے آئے کہ "میں خدا، رسول ﷺ اور امام زمانہؑ کے روبرو اقرار کرتا ہوں" تو آپ کی آواز گلے میں دب گئی اور آپ دیر تک سسکیاں لیتے رہے۔ آپ ایک دفعہ حلف لینے کے بعد تمام عمر اسی حلف پر قائم رہے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے "دوستو! بھائیو!

حلف عہدہ کے ایک سال کے لئے نہیں ہوتا بلکہ حلف کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے"

آپ چونکہ صاحب تقویٰ تھے اس لئے آپ نے اپنے مرکزی صدارت کے عرصہ کو تربیت کا سال قرار دے کر نوجوانوں کی کردار سازی کی۔ علما کرام سے مضبوط ربط اور نوجوانوں کا نماز تہجد پڑھنا آپ کی محنتوں کا ثمر تھا۔ چونکہ آپ کا تعلق براہ راست علامہ سید صفدر حسین نجفی جیسی شخصیت سے تھا۔ اس لئے وہ آپ کی مستحکم بنیادوں پر تربیت کرتے رہے۔ انہوں نے علماء کے بڑے بڑے اجتماعات میں آپ کو متعارف کرایا اور بین الاقوامی سطح پہ ہونے والے قومی معاملات سے آپ کو مربوط رکھا۔

۱۹۷۶ء میں جب عراق کے علماء پر حکومت کی جانب سے تشدد ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار آئی۔ ایس۔ او کے پلیٹ فارم پر کسی بین الاقوامی مسئلہ کی حمایت کی اور عراق کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایران میں اسلامی تحریک خاصی فعال تھی۔ مستقبل کا ادراک رکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے نوجوانوں کو علماء کے قریب کیا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا معمول تھا کہ آپ اپنی موٹر سائیکل LES 2629 پر علماء کرام کو پروگرام میں لاتے اور نوجوانوں میں اسلامی فکر کو بیدار کرتے۔

طلباء کی کردار سازی کے ساتھ آپ نے افراد سازی پر خاصی محنت کی اور ایک سال کے عرصہ میں تنظیم کے معیار کے مطابق نوجوان پیدا کئے۔ آج یہ بات دعویٰ سے کہی جا سکتی ہے کہ آپؒ نے اپنی تنظیمی زندگی میں جتنے افراد پیدا کئے وہ قوم کی نظریاتی فوج کے طور پر آج بھی قومی امور میں بدستور متحرک ہیں۔

ایک مرتبہ آپؒ نے کردار سازی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ایک واقعہ نقل فرمایا جسے سن کر نوجوانوں نے اپنی روش بدل ڈالی۔ وہ واقعہ یوں تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک شاگرد کئی سالوں تک آپؑ کی خدمت کرنے کے بعد جب اپنے وطن جانے لگا تو اس نے امامؑ سے اجازت چاہی "مولا جو کچھ میں نے آپ سے سیکھا ہے کیا مجھے لوگوں میں اس کے پرچار کی اجازت ہے" امامؑ نے اپنے شاگرد کی یہ بات سن کر زبان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اجازت ہے مگر اس سے نہیں ہماری تعلیمات کو کردار سے واضح کرو"۔

جس سال آپؒ کو مرکزی صدر کی ذمہ داری سونپی گئی تعلیمی حوالے سے آپؒ کا آخری سال تھا۔ آپؒ نے ابتدائی ایام میں بے پناہ دورہ جات کر کے تنظیم کو وسعت دی اور سالانہ پروگرام کی بنیاد رکھی۔ آپؒ نے اسی سال تنظیم کا مجلّہ "امامیہ نیوز بلیٹن" شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ جب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے آخری امتحان کا اعلان ہوا تو آپؒ نے پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل ۲ میں سکونت اختیار کر لی۔

رشتہ ازدواج :۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں آپؒ کا نکاح آپکے تایا سید شبیر حسین شاہ کی صاحبزادی سے ہوا۔ آپؒ کے سسرال علی رضا آباد لاہور میں مقیم ہیں۔ سید شبیر حسین شاہ صاحب علاقہ کے معروف روحانی پیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی پیری مریدی کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ سابق وزیر اعلیٰ سندھ اور سابق وزیر اعظم غلام مصطفیٰ جتوئی ان کے عقید تمندوں میں سے ہیں اور ان کے ہاں حاضری دیتے رہتے ہیں۔

ان ایام میں ڈاکٹر صاحب دو حصوں میں تقسیم تھے آپ پڑھائی سے فارغ ہوتے تو تنظیمی امور بجا لانے کے لئے نکل جاتے اور رات گئے تک کام کرتے رہتے۔ جب آپؒ کا نکاح ہونے لگا تو خاندان کے افراد نے آپ کی عادت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک دن پہلے اطلاع دی کہ وہ ہاسٹل میں رہیں تاکہ نکاح کے وقت انہیں لاہور میں تلاش نہ کرنا پڑے۔ نکاح کی شب آپ کے بہنوئی سید اعجاز حسین شاہ اور آپؒ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عباس علی نقوی آپ کو رسم نبھانے کے لئے لانے گئے تو آپؒ نے خاصا مزاح کیا اور کہنے لگے "یہ کن چکروں میں ڈال رہے ہو' اچھے خاصے آزاد تھے' اب رات کو گھر ضرور لوٹنا پڑے گا"۔

انہی ایام میں آئی۔ ایس۔ او کے بانی رکن برادر علی رضا نقوی کی شادی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب دوستوں کے ساتھ ان کے ولیمہ میں پہنچے۔ اس موقع پر ان سے تنظیم کے لئے چندہ مانگا تو انہوں نے اپنے نوٹوں والے ہار پیش کر دیئے کئی روز تک ان

نوٹوں سے کام چلتا رہا جب نوٹ ختم ہونے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے دوستوں سے کہا "کسی اور ساتھی کی شادی کی دعا کریں"

اکتوبر ۱۹۷۷ء کو آپ ایم. بی. بی. ایس کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تو نومبر ۱۹۷۷ء میں ہی آپ کی شادی طے پائی۔ ۸ نومبر شادی کے روز آپؒ تنظیمی پوسٹر چھپوانے میں مصروف تھے اور بارات کی روانگی سے تھوڑی دیر پہلے آپ کو پریس سے پکڑ کر لایا گیا۔

آپؒ کی شادی ہوئی تو خاصے خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ "اب تو ہماری ایک رکعت کنوارے نمازیوں کی ستر رکعتوں سے افضل ہوگئی" جب بارات آپ کی رہائش گاہ ۱۴۶ بھلا سٹاپ ملتان روڈ پہنچی تو آپ نے اسی دوران اپنے ایک تنظیمی دوست سے زیر چھپوائی پوسٹر کے رنگ اور پرنٹنگ کے بارے میں پوچھا بالفاظ دیگر شادی کی رسومات کے دوران میں آپؒ کے ذہن میں تنظیم کا پوسٹر گھومتا رہا۔

اہلیہ سے سے پہلی ملاقات ہوئی تو آپؒ نے ان پر واضح کیا کہ "یہ میری دوسری شادی ہے" بیگم خاصی پریشان ہوئیں تو آپؒ نے وضاحت کی کہ "پہلی شادی تنظیم سے ہوچکی ہے لہٰذا گھر کو زیادہ وقت نہ دینے کا شکوہ نہ کرنا"۔

۹ نومبر کو آپؒ کا ولیمہ تھا مگر ولیمہ سے پہلے آپؒ نے پریس کا چکر لگایا اور پوسٹرز اٹھا لائے۔

آپؒ نے اپنی دونوں شادیوں کو خوب نبھایا۔ پہلی شادی کے بتائے ہوئے راستوں پر چلے اور دوسری شادی کو اختیار کردہ راستوں پر چلایا۔ یہ فکر کی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا کہ آپ نے ملک میں بھر میں نوجوانوں کی نظریاتی فوج تیار کی جب کہ آپ کی اہلیہ نے ملک کے دور دراز علاقوں کے دورہ جات کر کے خواتین کی فکر بیدار کی۔

آخر وہ وقت بھی آیا جب ڈاکٹر صاحب سے آپ کی اہلیہ نے آپ کے ساتھ ہم قدم ہونے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا "آپ سفیر کربلا ہیں اور میں سفیر شام..... ' آپؒ حسینؑ کی صدا کو ورد بنائیں میں زینبؑ کے خطبوں کو دہراتی ہوں..... ' آپؒ جوانوں

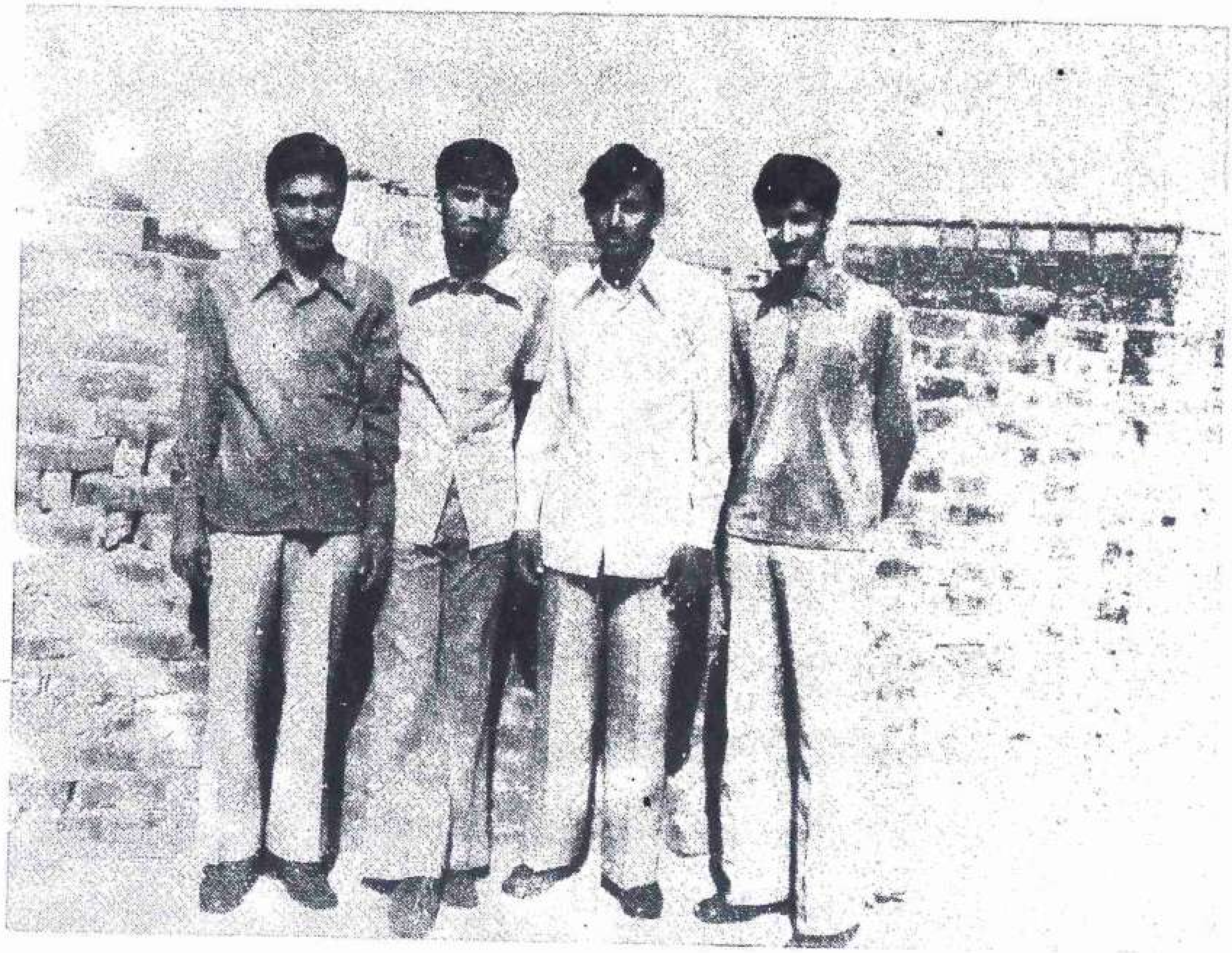

زمانہ طالب علمی میں اپنے بھائی اور چچا زاد بھائیوں کے ہمراہ۔

کے شعور کو جلا بخشیں میں خواتین کی پائمال روحوں کے زخموں کو زبان دیتی ہوں.....'
آپ کار حسینیؑ انجام دیں اور میں کار زینبیؑ" آپؒ شہید باقرالصدر کی فکر عام کریں اور میں آمنہ بنت الہدیٰ کی سوچیں ..... آپ محمدﷺ و علیؑ کا پیغام لے کر نکلیں اور میں بتولؑ کے اسوہ کی علمبردار بن کر آپؒ کا ساتھ نبھاتی ہوں تاکہ انقلاب کسی مرحلہ پر رکنے نہ پائے۔ آپ بھی خدا، رسولﷺ اور آئمہؑ اطہار کے روبرو سرخرو ہوں اور میں بھی ......۔

شاہراہ زیست کے دونوں ہمسفر اپنے دروازے سے نکل کر قوم کے دروازوں تک پہنچے۔ انہوں نے گھر میں بیٹھی ہوئی خواتین اور درسگاہوں میں زیر تعلیم طالبات کے ذہنوں پر دستک دیتے ہوئے فرمایا۔

چلو کہ آج سبھی پائمال روحوں سے
کہیں کہ اپنے ہر اک زخم کو زباں کر لیں
ہمارا راز، ہمارا نہیں سبھی کا ہے
چلو کہ سارے زمانے کو رازداں کر لیں

یہ آپؒ کی اہلیہ کے خلوص اور درد کا نتیجہ تھا کہ ملک بھر میں خواتین کے اندر انقلابی روح تڑپی اور انہوں نے آئی. ایس. او پاکستان (شعبہ طالبات) کا قیام عمل میں لایا۔ جس کا مرکزی دفتر ڈاکٹر صاحب کا گھر بنا۔ لہٰذا یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان (طلباء و طالبات) آپ کے گھر میں پروان چڑھی۔ یہاں سے بال و پر سنوارے گئے اور یہاں سے ہی اسے اڑان ملی۔

پیشہ وارانہ زندگی:۔

سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقویؒ نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز جنوری

۱۹۷۸ء میں میو اسپتال لاہور سے کیا۔ آپ نے ذہنی امراض کے ماہر پروفیسر اے ۔ کے ترین کے ساتھ چھ ماہ تک بطور ہاؤس سرجن اور فزیشن کام کیا اور ایک سال تک علامہ اقبال میڈیکل کالج کے پروفیسر افتخار احمد کی زیر سرپرستی میڈیکل کے میدان میں مہارت حاصل کی۔

پروفیسر اے . کے ترین سکاٹری سوسائٹی (PHSYCHIATRY SOCIETY) کے صدر تھے اور وہ لاہور میں انٹر نیشنل سکاٹری کانفرنس منعقد کرا رہے تھے۔ کانفرنس کے دن جوں جوں قریب آتے گئے پروفیسر صاحب کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ایک روز انہوں نے اپنی پریشانی کا ذکر ڈاکٹر محمد علی نقوی کے سامنے کیا تو آپ نے یہ کوئی مسئلہ نہیں کہہ کر ان کی پریشانی کافور کر دی۔ اپنے تنظیمی تجربات کی بنا پر آپ نے کانفرنس کا اس قدر اہتمام کیا کہ تمام شرکاء کو داد دینی پڑی۔

جولائی ۱۹۷۹ء میں آپؒ نے پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ باقاعدہ گورنمنٹ سروس حاصل کی اور پہلی بار "سروسز اسپتال لاہور" کے میڈیکل یونٹ میں بطور رجسٹرار تعینات ہوئے۔ آپ نے اسی دوران میں M.c.P.s بھی کیا اور دو سال تک شعبہ بے ہوشی (ANAESTHESIA) میں کام کرتے رہے۔ آپ نے یہاں سرجری میں خاصی مہارت حاصل کی اور ایک معروف ڈاکٹر کے حوالے سے پہچانے جانے لگے۔

آپؒ کا معمول تھا کہ آپ اپنی ڈیوٹی عموماً رات کو لیتے اور دن بھر تنظیمی کام کرتے رہتے۔ آپ یہاں چھ سال تک ملازم رہے' دکھی انسانیت کی بے لوث خدمت کی اور اسپتال کے عملہ پر خلوص اور کردار کے انمٹ نقوش چھوڑے۔

یہ انہی ایام کی بات ہے جب ایران کی سرزمین پر اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور پاکستان میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ وجود میں آچکی تھی۔ چونکہ آپ کی ذات انقلابی سرگرمیوں کا محور تھی اس لئے آپ تمام حساس اداروں کی نظر میں تھے۔ اسلامی انقلاب ایران کی حمایت میں مظاہرے اور تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے حقوق کے لئے ضیاء الحق حکومت سے آپ کا ٹکراؤ ملک کی ایجنسیوں کی فائلوں میں

استعمار اور اس کے گماشتوں کو للکارنے کا انداز۔

آیا تو انہوں نے پنجاب کے وزیر صحت اور سیکرٹری کو آپ کے بارے میں اطلاعات فراہم کیں اور آپ کے تبادلہ کی سفارش بھی کی۔

ایجنسیوں نے حکومت پنجاب پر واضح کیا کہ یہ شخص لاہور سے باہر تعینات کیا جائے اور وہاں اس کی حاضری کو ضروری بنایا جائے۔ چنانچہ آپؒ کو لاہور سے ڈسٹرکٹ اسپتال قصور تبدیل کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد آپ کا دوسرا تبادلہ "نارنگ منڈی" ضلع شیخوپورہ ہوا اور پھر تیسرا ٹرانسفر "للہ ٹاؤن" جہلم کر دیا گیا۔ آپ جہاں بھی گئے ایجنسیاں آپ کے تعاقب میں رہیں۔ انہوں نے آپ کی جانچ پڑتال کی اور مریضوں کے روپ میں آپ کے تاثرات نوٹ کئے۔ ایک اطلاع کے مطابق ان ایام میں آپ کی ڈاک بھی سنسر ہوتی رہی جن میں اہم خطوط کی فوٹو کاپیاں اورچند قائدین کے ساتھ آپ کی تصاویر پنجاب سیکرٹیریٹ کو ارسال کی گئیں۔ جو آج بھی آپ کی ذاتی سروس فائل (PERSONAL FILE) میں لگی ہوئی ہیں۔ اس فائل میں ان خطوط کی کاپیاں بھی موجود ہیں جو آپ اپنے قریبی احباب کو رازداری کے طور پر لکھا کرتے تھے۔ نہ جانے یہ کاپیاں ایجنسیوں کو کیسے مل جاتی تھیں۔ ....؟

آپ نے ضلع قصور اور نارنگ منڈی اسپتال میں بادلِ ناخواستہ ملازمت کی۔ نارنگ منڈی آپ روزانہ آتے جاتے رہے اور دونوں اطراف سے آپ کو عموماً بس کی چھت پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ جب آپ کا تبادلہ للہ ٹاؤن ہوا تو آپؒ نے حکومت پر واضح کیا کہ وہاں آپ کے تعلیمی معیار کی نوکری نہیں ہے۔ حکومت ایک سپیشلسٹ کو معمولی آسامی پر تعینات کر کے زیادتی کی مرتکب ہو رہی ہے۔

۱۹۸۶ء کی بات ہے جب تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی نے ۱۲ مئی کو "یوم مردہ باد امریکہ" منانے کا اعلان کیا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ علامہؒ صاحب کے دست راست تھے اس لئے انہوں نے اپنے قائد کے فرمان کا احترام کرتے ہوئے لاہور کے مظاہرے کی قیادت کی اور شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) پر واقع ایک معروف کاروباری مرکز "الفلاح بلڈنگ" پر چڑھ کر (A .S

DOWN WITH U.) (مردہ باد امریکہ) کا طویل و عریض بینر لٹکایا۔

ملکی و غیر ملکی صحافیوں نے بینرز سمیت آپ کی تصاویر بنائیں جو قومی اخبارات میں بھی شائع ہوئیں۔ جس کے بعد حکومت پنجاب کو آپ کے خلاف ایکشن لینا پڑا اور یوں آپ ملازمت سے برطرف کر دئے گئے۔

جن ایام میں آپ سرکاری ملازمت سے فارغ ہوئے ان دنوں عراق ایران جنگ عروج پر تھی۔ ایران' عراق پر آخری ضرب لگانے کے لئے اپنے تمام وسائل استعمال کر رہا تھا۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے امام زمانہؑ کی سرزمین سے "صدائے ھل من ناصر" ان الفاظ میں بلند کی " ہر کس کہ می تواند باید جبہ برود" "جو شخص جنگ کی طاقت رکھتا ہے وہ محاذ پر جائے"۔

نائب امام اور ولی فقیہ کی یہ صدا دنیا بھر میں گونجی تو پاکستان میں ڈاکٹر محمد علی نقوی نے اسے کربلا کی صدائے استغاثہ سمجھا اور محاذ جنگ پر پہنچ گئے۔ آپؒ نے زخمی مجاہدین کی خدمت اس انداز میں کی کہ آپ "ڈاکٹر پریشان" کے نام سے مشہور ہوگئے۔ ایرانی ڈاکٹر آٹھ گھنٹے جبکہ ڈاکٹر نقوی سولہ گھنٹے زخمیوں کے زخموں اور تکالیف کا علاج کرتے۔ چشم دید گواہان کے بقول کہ ڈاکٹر صاحب اپنی ڈیوٹی کے دوران انتہائی کم سوتے اور کم کھاتے جب آپ سے آرام کرنے کو کہا جاتا تو آپ جواباً کہتے "میں خدمت کرنے آیا ہوں آرام کرنے نہیں"

جنگ کی آگ ٹھنڈی ہوئی تو آپ وطن واپس لوٹے اور "ریڈ کریسنٹ اسپتال کالا باغ" میں بطور میڈیکل آفیسر سروس اختیار کی۔ یہاں آپ نے اپنی پیشہ وارانہ مہارت اور دکھی انسانیت سے محبت کے طفیل خاصی شہرت پائی۔ آپ کی تنخواہ نو ہزار روپے تھی جس میں سے آپ چار ہزار گھر والوں کو اور باقی رقم گردونواح کے محروم اور مستضعف طبقہ میں تقسیم کر دیتے تھے۔

آپ نے کالا باغ کے گردو نواح کی جن آبادیوں میں خصوصی خدمات سرانجام دیں ان میں ماڑی انڈس' واہنڈا لکڑاں والا' کوٹ بیلیاں اور ڈھیر امید علی شاہ نمایاں

یوم مردہ باد امریکہ پر پہلا تاریخی احتجاج

ہیں۔ آپ کے کالا باغ جانے سے قبل وہاں کے دیہاتوں کی حالت ہر لحاظ سے ناگفتہ بہ تھی۔ تعلیمی اور اخلاقی حوالہ سے لوگ انتہائی پستی کا شکار تھے اور ان کے مزاج میں بھی پہاڑوں جیسی سختی موجود تھی۔ آپ نے محسوس فرمایا کہ بڑی عمر کے لوگوں کی اصلاح ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے چنانچہ آپ نے طویل المدت منصوبہ بندی کے تحت وہاں کے سکولوں پر خصوصی توجہ دی۔ آپ نے اساتذہ سے خصوصی مراسم استوار کیئے انہوں نے بھی ایک ڈاکٹر کے حوالہ سے آپ کو بے حد عزت دی۔ زمین ہموار ہوئی تو آپ نے ایرانی انقلاب کی طرز کی فصل کاشت کرنا شروع کر دی۔ پہلے مرحلہ میں آپ نے سکولوں کی مالی معاونت کی اور پھر مستحق اور لائق طلباء کے وظائف جاری کر دیئے دوسرے مرحلہ پر آپ نے دیہاتوں میں مفت مریض چیک کرنے اور ان کو دوائیاں فراہم کرنے کی ریت ڈالی جو وہاں کے باسیوں کے دلوں میں گھر کر گئی۔ آپ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہاں کے لوگ اپنے ذاتی معاملات بھی آپ کے سامنے رکھتے اور آپ کے فیصلوں کو ترجیح دیتے۔

جب دیہاتیوں کے مزاج آپ سے ہم آہنگ ہوئے تو آپ نے ماڑی انڈس میں ''المصطفیٰ ماڈل ہائی سکول'' کی بنیاد رکھی اور منفرد و معیاری تعلیم فراہم کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ آپ کے کردار نے دل جیتے تو آپ نے مدرسہ امام خمینی ماڑی انڈس میں دعائے کمیل اور درس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ آپ کی تبلیغات کا یہ اثر ہوا کہ لوگ دور دراز کی بستیوں سے آپ کے تربیتی پروگرام میں شرکت کرتے اور حقیقت حیات سے آشکار ہوتے۔

کالاباغ اور ملحقہ آبادی کے لوگ آپ کی بے لوث مسیحانہ خدمت کے معترف تھے کیونکہ انہیں ڈاکٹر کے روپ میں پیغمبرانہ صفات کا ایک انسان میسر آیا تھا۔ آپ کی بے لوث خدمت کو دیکھ کر آپ کے ساتھی نے سوال کیا تھا ''ڈاکٹر صاحب آپ آدھی تنخواہ گھر دیتے ہیں اور آدھی غریب و ناچار عوام میں تقسیم کرتے ہیں کیا آپ کی فیملی کا گزارہ چار ہزار میں ہوجاتا ہے......؟

آپؒ نے نہایت اطمینان سے انہیں جواب دیا "عزیز دوست میں نے شروع ہی سے اپنے گھر کے اخراجات میں اعتدال رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چار ہزار میں ہمارا مہینہ گزر جاتا ہے۔ اگر آج میں نے نو ہزار بھی گھر دیا تو اخراجات خود بخود بڑھ جائیں گے اور گھریلو آسائشات میں اضافہ ہوجائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے گھر کے اخراجات اس قدر بڑھ جائیں کہ ناسازگار حالات میں انہیں سمیٹنا مشکل ہو جائے"

دوست نے پھر کہا آپ بے شک چار ہزار گھر دیں مگر مشکل وقت کے لئے کچھ رقم تو محفوظ رکھیں ؟

آپؒ مسکرائے اور کہنے لگے "کتنی بدبختی ہے ان لوگوں کی جن کے اضافی سرمائے بنکوں میں جمع ہیں اور ان کے اڑوس پڑوس میں لوگ فاقہ کشی کرتے ہیں، یتیم بچے جہالت کی زندگی گزارتے ہیں، یتیم جوان بچیاں ہاتھ پیلے کرنے کو ترستی رہتی ہیں اور لوگ پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے جہنم کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ میرے دوست غربت کی لعنت نے ہمارے معاشرے کو پراگندہ کیا ہے جہاں تک ممکن ہو خلق خدا کی سوچو......"

آپؒ کی پردرد گفتگو سن کر دوست خاموش ہوا اور اس نے اپنی جمع شدہ رقم بنک سے نکلوا کر آپ کے مشن پر خرچ کر دی اور آپ کا ہم سفر ہوگیا۔

۱۹۸۸ء میں علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بعد لاہور میں آپ کی موجودگی ناگزیر ٹھہری تو آپ نے کالا باغ کی نوکری کو خیرباد کہا اور لاہور کے ایک فلاحی ادارہ "زینبیہ کمپلکس" میں ملازمت اختیار کر لی۔

آپ نے ریڈ کریسنٹ اسپتال کالا باغ کی انتظامیہ کو استعفا دیا تو انہوں نے آپ کو تیرہ ہزار تنخواہ کی پیشکش کی مگر آپ نے فرمایا "میں تنخواہ کیلئے نہیں بلکہ وہاں کی ضرورت کے تحت لاہور واپس جا رہا ہوں"۔

جب آپ کے گرویدہ عوام کو آپ کے جانے کا علم ہوا تو لوگوں نے آپ کے

پاؤں تک پکڑے۔ آپ نے ان پر اہداف واضح کیئے تو انہوں نے بھاری دل اور اشکبار آنکھوں کیساتھ اجازت دی۔ آپ کی الوداعی تقریبات کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا۔ آپ جس ڈیرہ پر بھی جاتے سینکڑوں لوگ دیوانہ وار ٹوٹ پڑتے اور ہر اجتماع میں لوگ برملا کہتے کہ آج علاقہ سے ایک ڈاکٹر نہیں بلکہ مظلوم و محروم عوام کا مسیحا رخصت ہو رہا ہے جب آپ کی شہادت کی خبر میانوالی کے علاقوں میں پہنچی تو بیسیوں جوان اور بزرگ لاہور آئے اور دیہاتوں میں بچوں اور خواتین نے بین کیئے۔

آپ "زینبیہ کمپلکس" آئے تو یہاں کی انتظامیہ نے آپ کو چھ ہزار کی آفر دی مگر آپ نے فرمایا "چونکہ یہ فلاحی ادارہ ہے لہٰذا میں پانچ ہزار تنخواہ پر کام کروں گا اور اتنی رقم میں میرا اور میرے گھر کا گزارہ ہو جائیگا"

آپ نے مسیحائی خدمات سرانجام دے کر یہاں بھی غرباء کے دلوں میں گھر کیا۔ زینبیہ اسپتال میں آپ نے عام مریضوں کے علاوہ منشیات کے شکار لوگوں کا مفت علاج شروع کیا۔ آپ ایسے مریضوں کو کئی کئی روز تک وارڈ میں رکھتے اور ان کی مسلسل نگہداشت کرتے۔ آپ اپنے احباب سے کہتے کہ منشیات کے عادی لوگ نہ صرف اپنی زندگی کے دشمن ہیں بلکہ یہ اپنے گھر اور معاشرہ کیلئے بھی خطرناک ہیں۔ لہٰذا جہاں بھی ایسے شخص کو پائیں اس کے گھر سے رابطہ کرکے یہاں لے آئیں۔

انسانیت کی خدمت کے دوران کئی مریض آپ کے کپڑے خراب کرتے بلکہ زنجیروں میں بندھے ہوئے بعض مریض آپ پر تھوکتے مگر آپ ایک عزم کیساتھ ان کے معالجہ کیلئے ہر ممکنہ کوشش کرتے۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے آپ سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ان کو علاقہ کی پولیس بھی ٹھیک نہیں کر سکی آپ نے خواہ مخواہ مصیبت اپنے سر لی ہوئی ہے۔ ان لوگوں سے بھلا کیا ملنا ہے ....؟ آپ نے امام حسین علیہ السلام کا فرمان جواب میں سنایا کہ "جو کام صرف خدا کیلئے کیا جائے اس کا اجر خدا ہی دیتا ہے"

۱۹۹۰ء میں آپ نے موضع ہنجروال ملتان روڈ پر اپنا پرائیویٹ کلینک کھولا اور

وہاں کی غریب آبادی کی مسیحانہ خدمت شروع کی۔ یہاں آپ نے مریضوں کیساتھ موجودہ ڈاکٹروں والا سلوک برتا نہ فیس کا مطالبہ کیا۔ جس مریض کا جتنا جی چاہتا یا اسے جیب جتنا اجازت دیتی آپ کو فیس پکڑوا دیتا۔ بعض اوقات مریض دوائیاں لیکر آپ کو دعائیہ جملے دیتے اور چلے جاتے تو آپ فرماتے "فیس' دعا میں آگئی ہے"

۱۹۹۲ء میں آپ ملک کے معروف شیخ زید اسپتال اور فیڈرل پوسٹ گریجوایٹ انسٹی ٹیوٹ لاہور میں رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوئے اور تاحیات یہاں فرائض انجام دیتے رہے۔

میو اسپتال سے لیکر شیخ زید اسپتال کی ملازمت کے دورانیہ میں آپ نے اپنی نوکری کو ذریعہ ثواب جان کر دکھی انسانیت کی خدمت کی۔ آپ دوسرے ڈاکٹروں کی طرح کبھی متکبر ہوئے نہ مریض اور اس کے کسی تیمار دار کا دل دکھایا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے ملازمین سے اس طرح پیش آئے کہ آپ کے ساتھ کام کرنے والے مختلف مکاتب فکر کے لوگ آپ کی شہادت پر دھاڑیں مار کر روتے ہوئے دیکھے گئے۔

آپ نے اپنی زندگی کو مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کے اس فرمان کے قالب میں ڈھالا جو انہوں نے نہج البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے "لوگوں سے اسطرح سے ملو جب تک زندہ رہو وہ تمہارے مشتاق ہوں اور جب مر جاؤ تو وہ تم پر ماتم کریں"

مجھے وہ دن یاد آرہا ہے جب میں بھی شیخ زید اسپتال میں ملازم تھا۔ میں اپنے آفس سے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کی زیارت کیلئے جا رہا تھا کہ ان کے آفس کے سامنے والے سبزہ زار میں ایک مالی اور دوسرا ڈاکٹر صاحب کا چپڑاسی حقہ پی رہے تھے۔ مالی چپڑاسی کو کوس رہا تھا کہ تم کام نہیں کرتے حقہ پینے آجاتے ہو کیا تمہارا افسر یہاں نہیں ہوتا ....؟

میرا افسر تو یہاں ہوتا ہے مگر وہ دوسرے افسروں جیسا نہیں۔ چپڑاسی نے جواب دیا

کیا مطلب ....؟ مالی نے پھر استفسار کیا۔

شیخ زائد اسپتال میں

میرا افسر شاہ جی ہے وہ ہمیں تنگ نہیں کرتا۔ زیادہ تر کام اپنے ہاتھوں سے کرتا ہے .... کبھی غصہ میں آجائے بھی تو گالی نہیں دیتا صرف "بندہ خدا" کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے .... جب خوش ہوتا ہے تو اپنی الماری سے بسکٹ نکال کر کھلاتا ہے ...... ہمیں ضرورت پڑتی ہے تو اپنی تنخواہ سے ہماری مدد کرتا ہے .... قرآن مجید پڑھنے کی زیادہ تاکید کرتا ہے .... شیعہ ہے مگر تبلیغی اجتماع میں رائیونڈ بھی جاتا ہے ......"
چپڑاسی نے دل کی گہرائیوں سے تعریف کرتے ہوئے یہ جملے کہے۔

مالی یہ باتیں سن کر حیران ہوا اور کہنے لگا "اس کا مطلب ہے کہ تمارا افسر کربلا والے سیدوں میں سے لگتا ہے کسی دن مجھے بھی ایسے شخص کی زیارت کروا دینا"

میں نے مالی اور چپڑاسی کی یہ گفتگو سنی تو مولا علی علیہ اسلام اور ان کے غلام کا وہ واقعہ یاد آگیا۔ جب ایک مرتبہ مولا علیؑ نے کسی کام کے سلسلہ میں اپنے غلام کو کئی بار آواز دی مگر وہ نہ آیا۔ آخر امام اٹھے اور وہ کام خود کر لیا۔ جب تھوڑی دیر بعد غلام آیا تو امام نے پوچھا

"کیا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی"

سنی تھی .... غلام نے جواب دیا۔

پھر آئے کیوں نہیں؟ ...... مولاؑ نے فرمایا۔

مولاؑ کافی تھکا ہوا تھا ..... کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا اور مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے سزا بھی نہیں دیں گے اور حسب معمول اپنا کام خود کر لیں گے ...... غلام نے معذرت کرتے ہوئے عرض کی۔

سفیر انقلاب کی زندگی آئمہ کی زندگی کا نمونہ پیش کرتی تھی ان کا زندگی میں جن لوگوں سے بھی واسطہ پڑا وہ آج بھی آپ کے فراق میں روتے ہوئے یہی کہتے سنائی دیتے ہیں۔

تری خوشبو نہیں ملتی، ترا لہجہ نہیں ملتا
ہمیں تو شہر میں کوئی، ترے جیسا نہیں ملتا

☆☆☆☆☆

"انقلاب ایران و سفیر انقلاب"

۱۹۷۶-۷۷ میں آپ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے مرکزی صدر بنے تو اس وقت ایران میں اسلامی انقلاب کی تحریک میں حرارت آچکی تھی اور وہاں کے علماء کو انقلاب کی صبح کا سورج طلوع ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ امام خمینیؒ کی فکر کی شعاعیں دنیا بھر میں ظلمت کے اندھیروں کا سینہ چیر رہی تھیں اور حق پرستوں کے قافلے تشکیل پا رہے تھے۔

پاکستان میں علامہ سید صفدر حسین نجفی واحد شخصیت تھے جو امام خمینیؒ کی فکر کے امین بن کر اہالیان پاکستان کو امام خمینیؒ اور اسلامی انقلاب کا تعارف کرا رہے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے مسلمان بالخصوص اہل تشیع انقلاب کی روح سے بیگانہ تھے۔ مرجعیت کا تصور صرف علماء تک محدود تھا جبکہ عوام اور علماء کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔

ان مشکل حالات میں علامہ سید صفدر حسین نجفی جہاد کا علم اٹھا کر دینی مدرسہ کی دیواروں سے باہر نکلے تو انہیں ایک مجاہد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ابھی وہ حالات کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ انہیں اپنے پہلو میں کھڑا ہوا وہ مجاہد ملا جو ان کا اپنا تربیت یافتہ تھا ...... جو ان کی گود کا پروردہ تھا ...... جو ان کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا ...... جو ان کی محنتوں کا ثمر تھا ...... جس کا نام انہوں نے "محمد علی" رکھا تھا۔

روحانی باپ بیٹا عوامی حلقوں میں آئے۔ عالم نے فکر پھیلائی مجاہد نے حالات کو گرفت میں لیا۔ بزرگوں تک بزرگ نے پیغام پہنچایا اور جوانوں سے جوان نے گفتگو کی۔ علامہ صاحب نے جو کچھ قرطاس پر لکھا ڈاکٹر صاحب نے اسے عوام تک پھیلایا' فقیہ نے جو سمت دی نمائندہ نے وہی راہ اختیار کی۔

آغاز میں اسلامی انقلاب اور امام خمینیؒ کے پیغامبروں کے سر الزام آئے اور مشکلات نے ان کی راہ میں دیوار بننا چاہا مگر ہر الزام کا مقابلہ کرتے ہوئے اور ہر مشکل کی دیوار کو گراتے ہوئے یہ باپ بیٹا آگے بڑھے تو چند بابصیرت لوگ ان کے ساتھ ہو لیئے اور یوں قافلہ حق تیار ہوگیا۔ شروع میں یہ قافلہ علامہ صاحب کے عقید تمندوں

اور ڈاکٹر صاحب کے ہم فکر نوجوانوں پر مشتمل تھا مگر کچھ عرصہ بعد عوام اس میں شامل ہوئے تو امام خمینی کے حمایتیوں کا سیل بیکراں رواں ہوگیا۔

حالات کے بدلتے تیور دیکھ کر علامہ سید صفدر حسین نجفی نے امام خمینی کی "توضیح المسائل" کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی راہ ہموار کرنے کی ٹھان لی۔ علامہ صاحب نے توضیح المسائل چھپوائی تو ڈاکٹر صاحب نے ملک کے کونہ کونہ میں اسے تقسیم کیا۔ علامہ صاحب نے امام خمینی کا تعارف اور ان کی تحریک کے مقاصد تحریر فرمائے اور امام خمینی کی پہلی کتاب "حکومت اسلامی یا ولایت فقیہہ" کا ترجمہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے انہیں پورے ملک میں پھیلا دیا۔

۱۹۷۶ء میں جب عراقی علماء پر امام خمینیؒ کی حمایت کے جرم میں تشدد اور قتل عام ہوا تو ان پر ظلم اور ان کی شہادتوں پر احتجاج کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ایک پوسٹر شائع کروایا جس کا عنوان تھا۔

"وہاں خون کی ہولی کھیلی گئی اور ہم کہ یہاں خاموش رہے"

۱۹۷۸ء میں شاہ ایران کو پاکستانی حکومت نے دورہ کی دعوت دی تو ڈاکٹر صاحب اور برادر ثاقب نقوی نے ایک پوسٹر شائع کروایا جس پر درج تھا "ہم قاتل شاہ کا استقبال نہیں کرتے" یہ پوسٹر اسلامیان پاکستان کے نام سے چھپوایا گیا۔ جب یہ پوسٹر لاہور کے درو دیوار پر چسپاں ہوا تو حکومتی ایوانوں اور ایران کے قونصل خانوں میں کھلبلی مچ گئی۔

شاہ ایران تو پاکستان نہ آسکا البتہ ایرانی قونصلیٹ نے روایتی شیعہ لیڈروں کو بلا کر اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ جس پر بعض رہنماؤں نے عذر پیش کیا کہ "یہ حرکت خمینی کے چیلوں کی ہے۔"

انقلاب اسلامی کے طلوع سے قبل جب امام خمینیؒ پیرس میں جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے لاہور سے علامہ سید صفدر حسین نجفی اور سیٹھ نوازش علی امام خمینی سے ملنے کیلئے پیرس جانے لگے تو اس موقع پر ڈاکٹر محمد علی نقوی نے اپنے چند احباب کو جمع کیا اور تجویز پیش کی کہ ہماری طرف سے امام کو تائیدی خط جانا چاہئے تمام احباب نے ڈاکٹر صاحب کی فکر کی تائید کی اور خط کا متن تیار کیا گیا جس میں تحریر

تھا۔ ''اے نائب امام' پاکستان کے فرزندان اسلام آپ کے ہر حکم پر کٹ مرنے کیلئے تیار ہیں۔ آپ کی قیادت میں اسلامی انقلاب کی حمایت اور سامراج سے ٹکر لینے کا عہد کرتے ہیں''

یہ خط آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی جانب سے لکھا گیا۔ جب یہ نامہ امام خمینی کی خدمت میں پہنچایا گیا۔ تو امام نے جواباً'' فرمایا ''میں فرزندان اسلام کے جذبات کی قدر دانی کرتا ہوں اور مجھے ان سے یہی توقع ہے کہ وہ اپنے ملک سے بھی سامراج کو رخصت کریں گے امام نے اس موقع پر آئی۔ ایس۔ او کو انقلاب کے طلوع کی پیشگی مبارکباد دی اور دعائے خیر فرمائی۔

۱۹۷۸ء کے آخری ایام میں آغا حسین نوری امام خمینیؒ کے نمائندہ کی حیثیت سے دورہ پر پاکستان آئے اور انہوں نے لاہور میں چار روزہ قیام کے دوران اہم افراد سے ملاقاتیں کیں۔ اس موقع پر انہوں نے آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے چار نوجوانوں کو بھی خصوصی وقت دیا اور روزانہ چار روز تک یہ وفد ان سے ملاقاتیں کرتا رہا۔ اس وفد میں ڈاکٹر صاحب کی ذات نمایاں اور معتبر تھی۔

انقلاب کی آمد سے چند ماہ قبل ایرانی طلباء نے لاہور کے مال روڈ پر شاہ ایران کے ظلم کیخلاف احتجاجی مظاہرہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس مظاہرہ کی قیادت کی اور تکبیر کا پہلا نعرہ بھی آپ نے بلند کیا۔

انہی ایام میں شاہ کی حکومت فدایان خمینی پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی تھی ایک وقت میں سینکڑوں نوجوان شہید کیئے جا رہے تھے تو آئی۔ ایس۔ او پاکستان نے امام کی حمایت اور شاہ کے خلاف پہلی بار مال روڈ لاہور پر مظاہرہ کیا جس کی قیادت سفیر انقلاب نے کی اس موقع پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر سعید مہدی نے ڈاکٹر صاحب کو بلا کر کہا ''آپ واپس چلے جائیں وگرنہ ہم ماریں گے'' ڈاکٹر صاحب نے جواباً'' کہا ''ہم میدان میں واپس جانے کیلئے نہیں اترے ہم اپنا مشن پورا کریں گے اور آپ اپنا مشن پورا کریں''

یہ مارشل لاء کے عروج کا زمانہ تھا ڈاکٹر صاحب نے انتظامیہ کی طے شدہ حد عبور کی تو آپ پر بے شمار لاٹھیاں برسائی گئیں اور آپ کو ساتھیوں سمیت گرفتار

کر کے تھانہ سول لائنز کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہاں ڈاکٹر صاحب نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا جو پولیس والوں کیلیئے سر درد بن گیا جب پولیس والے گرفتار شدہ طلباء پر مقدمہ بنانے کیلیئے پتہ جات لکھنے آئے تو انہوں نے قیدیوں سے کوائف مانگے

آپ کا نام ------------؟ جواب ملا فرزند امام

والد کا نام ------------؟ جواب ملا امام خمینی

کہاں سے آئے ہو ------------؟ جواب ملا کربلا سے

ارادے کیا ہیں ------------؟ جواب ملا شہید ہونا چاہتے ہیں۔

پولیس نے لاکھ کوشش کی تشدد کا خوف دلایا مگر ہر بار ایک ہی جواب ملا۔ آخر کار پولیس حکام نے تنگ آکر چند شیعہ رہنماؤں کو بلایا شہادت کے متمنی اور کربلا کے پروانوں کو گھر لے جانے کی اپیل کی۔

۱۱ فروری ۱۹۷۹ء میں جب ایران کی سرزمین پر انقلاب اسلامی کی پوپھوٹی تو روشنی کی ایک کرن خوشبو کو اپنے دوش پر لیئے پاکستان پہنچی۔ عین انہی ایام میں "جامعۃ المنتظر" میں آئی۔ ایس۔ او کا سالانہ مرکزی کنونشن ہو رہا تھا۔ جس میں شرکاء کو مبارکباد کیساتھ ساتھ امام خمینی کی جدوجہد کا بھرپور تعارف کروایا گیا۔ اس موقع پر ایک قرارداد کے ذریعہ امام اور انقلاب کو خوش آمدید کہا گیا اور ان کے ساتھ ایفائے عہد کا اعلان ہوا۔

کنونشن میں شریک ہر نوجوان اپنی اپنی فہم کے مطابق پر مسرت تھا اور اپنے اپنے انداز میں اظہار مسرت کر رہا تھا۔ ایسے میں سفیر انقلاب انتہائی پرجوش انداز میں سٹیج پر آئے اور سامعین سے مخاطب ہوئے۔ "برادران عزیز سب سے پہلے میں آپ کو انقلاب اسلامی کی آمد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس اجتماع میں واضح کرتا ہوں کہ یہ چودہ سو سال بعد آئمہ کی سرزمین سے طلوع ہونے والا اسلامی انقلاب اور امام زمانہؑ کی سرپرستی میں قائم ہونے والی اسلامی حکومت دنیا بھر کے مسلمانوں کیلیئے نعمت خداوندی ہے۔ اس سے پہلے ہمارا فریضہ تھا کہ ہم امام زمان عجل اللہ فرجہ کے نائب حضرت آیت اللہ خمینی کی صدائے استغاثہ پر لبیک کہتے اور صدیوں پر محیط

شہنشاہیت اور سامراجیت کے خلاف برسر بیکار ہوتے۔ الحمدللہ کہ جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق امام کی صدا پر لبیک کہا اور اس صدا کو دوسرے احباب تک پہنچایا ....

برادران عزیز! آج جبکہ اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہوچکا ہے اور محروموں' مظلوموں اور محکوموں کی امید یعنی مستضعفین جہان حضرت امام خمینی مسلمانان عالم کی تقدیر بدلنے کیلئے پرچم اسلام لیکر ہمارے سامنے تشریف لائے ہیں۔ اب ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم سامراج کے زہریلے پروپیگنڈہ کے مقابلہ میں انقلاب اور امام کا نہایت دیانتداری اور خلوص سے تعارف کرائیں۔ یاد رکھنا کہ اس انقلاب اور امام کی شخصیت کو جذبات یا محبت کی زیادتی کیوجہ سے اپنے دائروں میں محدود نہیں کرنا یہ خالصتاً" اسلامی انقلاب ہے اس کا دفاع' اس کا پرچار اور اس کی خدمت ہم سب پر لازم ہے۔ لہٰذا میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنے علاقوں میں جاکر امام اور انقلاب کی ترویج کریں اور عالمی سامراج کے خلاف زمین ہموار کرنا شروع کر دیں۔ یہی آپ کا فریضہ ہے' یہی آپ کی ذمہ داری ہے اور یہی وقت کا تقاضا ہے"

آئی۔ ایس۔ او کے سالانہ کنونشن کے چند روز بعد ڈاکٹر صاحب نے قابل اعتماد اور سینئر تنظیمی برادران کا ایک اجلاس بلایا جس میں آپ نے احباب پر واضح کیا کہ "امام خمینی کی حقیقی پیروی کیلئے ہمیں سب سے پہلے ان کی تقلید کرنا ہوگی تاکہ ہم امام کے ہر حکم کو فرض کی حیثیت سے سرانجام دیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب جو اس وقت آقای سید ابوالقاسم خوئی کے مقلد تھے نے امام خمینی کی تقلید کا اعلان فرمایا اور اس طرح دوسرے احباب بھی رفتہ رفتہ امام خمینی کے مقلد بن گئے۔

انقلاب اسلامی کی آمد کے فوراً" بعد امام خمینی کی طرف سے "دو رکنی وفد پاکستان میں جماعت اسلامی کے بانی حضرت سید ابو اعلیٰ مودودیؒ" کو مبارکباد اور انقلاب کی حمایت کا ہدیہ تشکر پیش کرنے لاہور آیا تو اسلامی جمعیت طلبہ' جماعت اسلامی کے کارکنان اور آئی۔ ایس۔ او کے نوجوانوں نے ایئرپورٹ سے مولانا مودودی کی رہائش گاہ تک ان کا والہانہ استقبال کیا۔ اس موقع پر خمینی .... مودودی بھائی بھائی کے نعرے بھی بلند ہوئے جو آج بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ وفد نے امام کا اہم

پیغام مولانا صاحب کو پہنچایا اور مولانا کا ایک طویل نامہ اپنے ساتھ لے گئے۔ جس میں اسلام کی خدمت کیلئے مستقبل کا لائحہ عمل تھا۔

امام کا نمائندہ وفد علامہ سید صفدر حسین نجفی کی امام اور انقلاب کی ترویج کیلئے زحمتوں کا شکریہ ادا کرنے "جامعتہ المنتظر" بھی گیا جہاں انہوں نے علامہ صاحب کو بھی امام کا پیغام تشکر پہنچایا۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند اہم احباب بھی موجود تھے۔ جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ مرحوم نے فرمایا تھا "انقلاب اور امام کے تعارف میں ان مجاہدین کی زحمتیں قابل قدر اور قابل تحسین ہیں" چنانچہ اس وفد نے ڈاکٹر صاحب کا خلوص دل سے شکریہ ادا کیا اور آپ کی محنتوں کو سراہا۔ اس موقع کے بعد جب بھی کوئی ایرانی وفد انقلاب کی ترویج کیلئے پاکستان آتا وہ ڈاکٹر محمد علی نقوی کے نام سے آشنا ہوتا بلکہ ایرانی سفارتخانے کے انقلابی سفارتکار جونہی پاکستان آتے ڈاکٹر صاجب سے ملاقات کی خواہش کرتے۔

سفیر انقلاب نے انقلاب کی ترویج اور امام خمینی کے تعارف کیلئے لاہور میں ایک دفتر مقرر کیا جس کی مسئولیت برادر شبیر بخاری کو سونپی۔ اس دفتر سے امام کی تصاویر، آپ کی توضیح المسائل اور انقلاب کا تعارفی لٹریچر ملک بھر میں پھیلتا رہا اور ایک سال کے اندر ملک کے کونہ کونہ بلکہ گھر گھر تک امام خمینی کا پیغام پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب عموماً" کہا کرتے تھے۔ "اگر تنظیمی نوجوانوں کی کوئی محفل فکر امام خمینی کے بغیر منعقد ہوتی ہے تو وہ بے مقصد ہے۔"

۲۰ ستمبر ۱۹۷۹ء کی رات جب امریکہ کے اشارہ پر عراق نے ایران پر جارحیت کی تو صبح کی نشریات میں بی۔ بی۔ سی نے حملہ کی خبر نشر کر دی۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت اپنے گھر میں بیٹھے، ناشتہ کر رہے تھے۔ جونہی آپ نے عراقی جارحیت کی خبر سنی۔ ایک دم تڑپے اور ناشتہ چھوڑ دیا۔ پریشانی کے انہی لمحات میں آپ نے فوراً" "روزنامہ نوائے وقت لاہور" کے چیف ایڈیٹر حمید نظامی کو فون کیا اور ان پر گفتگو کے دوران واضح کیا کہ "یہ جنگ عالمی سامراج کے اشارہ پر مسلط کی جا رہی ہے اور امریکہ ایران سے نہیں بلکہ اسلام سے شکست کا بدلہ لینا چاہتا ہے لہٰذا ایسے میں بحیثیت ایک مسلم، میں آپ سے اپیل کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ آپ اسلامی انقلاب کا

بھرپور دفاع کریں اور مغربی ذرائع ابلاغ کا منہ توڑ جواب دیں۔"

اسی دوران میں آپ نے شہر میں دیگر ہم فکر احباب سے صلاح مشورہ کیا کہ ان حالات میں ہماری ذمہ داری کیا بنتی ہے۔ آخر طے پایا کہ فوری طور پر زخمی شہریوں کیلئے ادویات پہنچائی جائیں۔ چونکہ یہ ڈاکٹر صاحب سے متعلقہ کام تھا۔ چنانچہ آپ نے سب سے پہلے اپنی جیب سے پانچ سو روپے عطیہ کے طور پر جمع کرائے اور شہر کے مخیر حضرات سے رابطہ کرکے لاکھوں روپے کی ادویات خریدیں اور ایران چھوڑنے چلے گئے۔ آپ کو ویزا میں معمولی سی غلطی کی وجہ سے کئی گھنٹے سرحد پر رکنا پڑا یہاں تک کہ ویزا کی درستگی کیلئے آپ کو واپس کوئٹہ بھیج دیا گیا۔ آپ دوائیوں کے ٹرک سمیت کوئٹہ لوٹے اور ویزا درست کرانے کے بعد انہی قدموں واپس چلے گئے۔ جب آپ سرحد پر پہنچے تو وہاں کے ملازمین حیران رہ گئے اور کہنے لگے کہ ہمارا ملازم بھی اگر کوئٹہ جائے تو وہ تین دن بعد لوٹتا ہے جبکہ تم ایک شام بعد واپس لوٹ آئے ہو کس دھات کے بنے ہوئے ہو ....؟"

علاوہ ازیں ایران عراق جنگ کے ابتدائی سالوں میں پاکستان کے عوام کی طرف سے ایرانی بھائیوں کی جو مدد کی گئی اس میں علماء کرام کی تبلیغ اور ڈاکٹر صاحب کی انتھک مجاہدانہ کوششوں کا بے پناہ عمل دخل تھا۔

۱۹۸۰ء میں ڈاکٹر صاحب نے پروگرام طے کیا کہ پاکستان کے نظریاتی جوانوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ انقلاب اسلامی کو قریب سے دیکھیں' وہاں کی تبدیلیوں کا مشاہدہ کریں اور وہاں کے پاسداران' علماء کرام اور بانیان انقلاب سے ملاقاتیں کرکے روحانی غذا حاصل کریں۔ چنانچہ اس فکر کی تکمیل کیلئے آئی۔ ایس۔ او پاکستان کا پہلا وفد ڈاکٹر صاحب کی زیر قیادت ایران پہنچا۔ جہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا۔ وہاں کے ماحول میں پھیلی ہوئی دین کی خوشبو نے ان کے ذہنوں کو معطر کیا اور وہاں پر شریعت کے راج نے ان کے دلوں کو تازگی عطا کی .... پاسداران اسلام کے جذبہ جہاد نے ان کے خون کو گرمایا اور انبیاء کے ورثاء علماء کرام کی روحانیت نے ان کے اسلامی افکار کو نمو بخشی .... حضرت امام رضا علیہ السلام کی سرزمین نے ان کے ذہنوں کی زمین کو زرخیزی دی اور بت شکن خمینی کی ملاقات اور ان کے عطا کردہ افکار

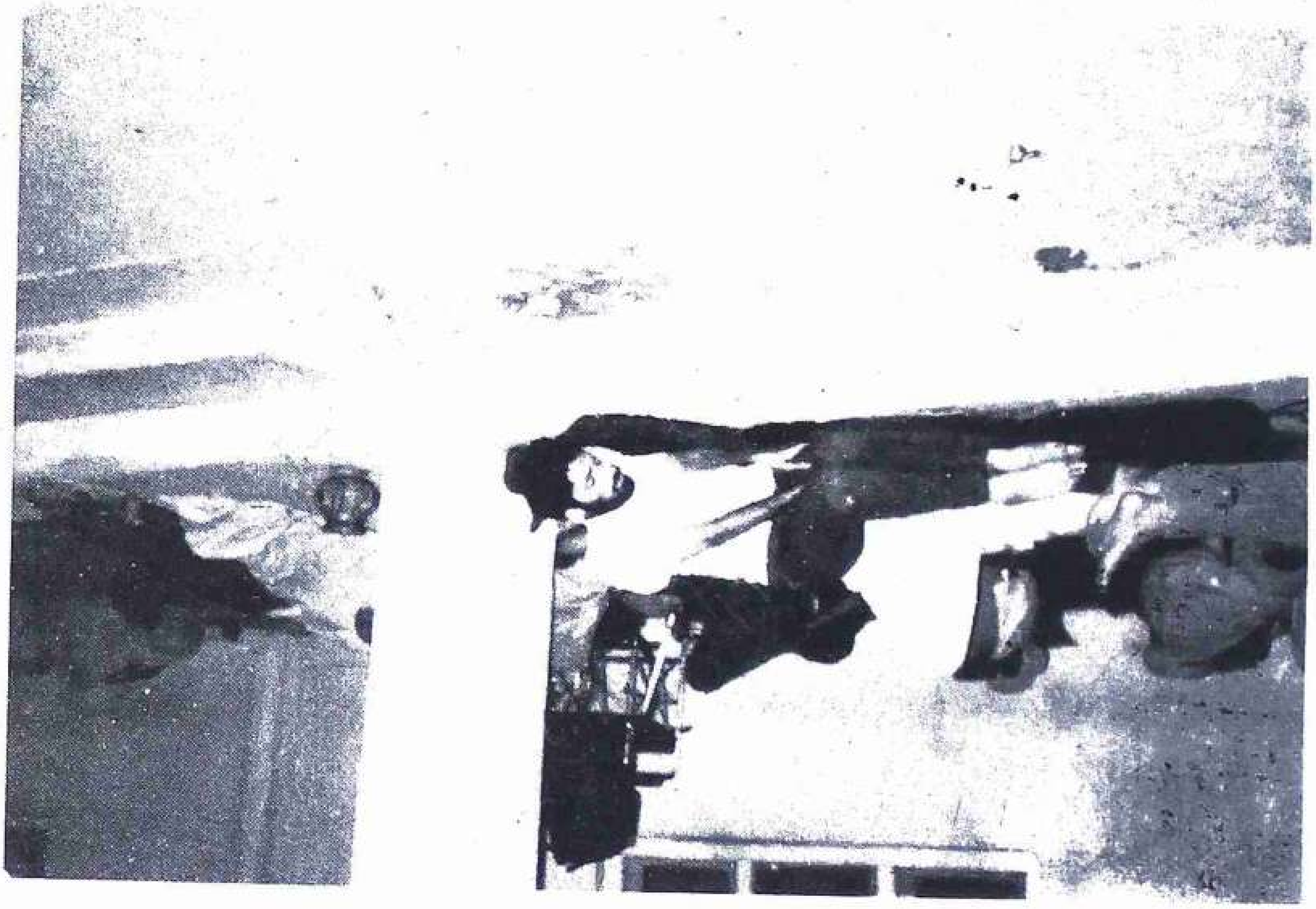

دورہ ایران کے موقع پر فٹ پاتھ پر سوجانے کا ایک منظر۔

نے ان کی زندگی اور سوچوں کے رخ موڑ دیئے۔

اس دورہ کے دوران میں سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی کے امام خمینی سے عشق اور اسلامی انقلاب سے محبت نے نوجوانوں پر گہرے نقوش مرتب کئے جو آج بھی دلوں کی لوح پر محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایران میں داخل ہونے کے بعد اپنے تنظیمی برادران کو جو پہلا درس دیا وہ کچھ یوں تھا "برادران عزیز! آپ اس وقت آئمہ کی سرزمین پر قدم رکھ چکے ہیں۔ آپ سیر و سیاحت کیلئے نہیں آئے بلکہ آپ مشاہدہ کرنے آئے ہیں کہ یہاں پر سو سالہ شہنشاہیت کا بت کیسے توڑا گیا .... صدیوں پر محیط عالمی استکبار کا طلسم کیسے ٹوٹا .... فرزند امام نے کن بنیادوں پر تحریک چلائی .... علماء کرام نے اس انقلاب کیلئے کتنی محنت کی .... نوجوانوں کی تربیت کیسے ہوئی اور انہوں نے قربانیاں کیسے دیں .... یہاں کے آج اور کل میں کتنا فرق ہے .... اس انقلاب کے تقاضے کیا ہیں اور ہمیں اس کیلئے کیا کرنا ہے ....؟"

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے برادران پر واضح کیا کہ یہاں کا خزانہ، یہاں کی ٹرانسپورٹ اور یہاں کی دیگر سہولتیں مال امامؑ کی بدولت ہیں۔ لہٰذا کسی مرحلہ پر بھی کوئی ایسا قدم نہ اٹھائیں کہ جس سے مال امامؑ آخرالزمان کے ضیاع کا گمان ہو۔ یہاں تک کہ آپ وضو اور غسل میں پانی اور کمروں میں بجلی کے ناجائز استعمال سے بھی گریز فرمائیں۔

یہاں ڈاکٹر صاحب نے اپنے عشق کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا۔ "برادران عزیز! حتیٰ المقدور کوشش فرمائیں کہ آپ کے زیادہ تر اوقات اطاعت خدا میں صرف ہوں اور آپ زیادہ سے زیادہ وقت پیر جماران خمینی بت شکن کے علاقہ "جماران" میں گزاریں تاکہ آپ کو نائب امام کی زیارت بھی نصیب ہو اور ان کے گھر کو دیکھ کر روح کو تازگی بھی ملتی رہے۔ چنانچہ عشق کی لذت میں اضافہ کیلئے ڈاکٹر صاحب برادران کو مسجد آیت اللہ کفھانی لے گئے جو "جماران" کے علاقہ میں واقع تھی۔ آپ جونہی پیر جماران کے گھر کی جانب دیکھتے تو آپ کے چہرے پر پھول کی سی تازگی آتی اور لبوں سے "خدایا خدایا تاانقلاب مہدی۔ خمینی رانگہدار" کے جملے بے اختیار

ادا ہو جاتے۔

اگرچہ حکومت ایران کی جانب سے اس وفد کو ٹرانسپورٹ، علماء کرام کی ملاقاتیں، قیام اور طعام کی اعلیٰ سہولیات میسر تھیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب زیادہ تر وقت علماء کرام کی ملاقاتوں اور مساجد میں گزارتے۔ معمولی سا کھانا کھا کر برادران کیساتھ جہاں جگہ ملتی سو جاتے۔ بعض اوقات آپ برادران کے ساتھ دائرے میں بیٹھ کر خربوزے سے روٹی کھاتے اور ایسے میں نفس امارہ کو نفس مطمئنہ کی طرف لوٹانے کا درس دیتے۔

اس دورہ کے دوران میں ایک مرتبہ جب برادران نے رات زمین پر سو کر گزاری اور صبح معمولی سا کھانا کھایا تو ایک ساتھی نے ڈاکٹر صاحب سے مزاحاً" کہا۔ "ڈاکٹر صاحب ایران کے دورہ پر آئے ہیں۔ جنگ خندق لڑنے نہیں آئے۔ آپ نے تو ہمارے پیٹوں پر پتھر بندھوا دیئے ہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "عزیز دوست! آپ لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ اپنے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ مجھ جیسا نالائق انسان جس کی انقلاب کیلئے کوئی خدمات نہیں اس قابل نہیں کہ اس پر مال امامؑ خرچ ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو پروٹوکول ہمیں دیا جا رہا ہے۔ ہماری حیثیت سے بھی زیادہ ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ مال امامؑ ہماری آسائشوں پر خرچ ہونے کی بجائے محاذ جنگ پر مصروف ان مجاہدوں تک پہنچے جو اسلام کی بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔"

یہ کارواں اپنے دلوں میں جذبات کا سمندر لیئے وطن لوٹا تو برق رفتاری سے امام کا پیغام اور انقلاب کے تاثرات پھیلانے لگا۔ انقلاب ایران کی سالگرہ کا موقع آیا تو ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر لاہور میں تمام جزوی مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بیٹھ گئے۔ آپ نے پورے ملک میں انقلاب کی ویڈیو فلمیں دکھانے کی جامع منصوبہ بندی کی اور اتحاد بین المسلمین کے سیمینار کرانے کا لائحہ عمل تیار کیا۔

آپ نے انقلاب کے تعارف کیلئے عشرہ منانے کا اعلان کیا جسے آپ کی نظریاتی فوج (آئی۔ ایس۔ او پاکستان) نے تکمیل تک پہنچایا۔ ملک بھر کے ہر ضلع میں انقلاب

کی سالگرہ کے اجتماع منعقد ہوئے جہاں شیعہ و سنی علماء کرام نے خطابات کئے اور نوجوانوں نے گاؤں گاؤں جاکر انقلاب کی فلمیں دکھائیں۔ یہ کہنا ہرگز بے جا نہ ہوگا کہ ''آئی۔ ایس۔ او کے نوجوانوں نے امام کے پیغام کو قریہ قریہ پہنچانے میں خوب حق ادا کیا اور اپنی ان حسرتوں کو پورا کیا جس کے بارے میں وہ ہر نماز کے بعد زیارتِ امام حسین علیہ السلام میں کہتے ہیں کہ ''کاش ہم کربلا میں ہوتے۔''

علماء کرام کی محنت اور نوجوانوں کی ڈاکٹر صاحب سے وابستگی نے اسلامی برادران میں انقلاب اور امام کے عشق کی وہ لو جلائی جسے سرنگوں کرنا بڑے بڑے شیطانوں کیلئے ناممکن ہوگیا۔ یہ نوجوان جہاں جاتے' جہاں بیٹھتے' جہاں گفتگو کرتے ان کے لبوں پر حقیقت موجزن ہوتی اور یہ عاشقان امام خمینی' لوگوں کو انقلاب اسلامی کی آمد کے بارے میں بتاتے۔

اخلاق پریشاں تھا' تہذیب ہراساں تھی
بدکار حضوروں سے' بدنسل جنابوں سے
عیار سیاست نے ڈھانپا تھا جرائم کو
ارباب کلیسا کی حکمت کے نقابوں سے
عیش' ایک کا لاکھوں کی غربت سے پنپتا تھا
منسوب تھی یہ حالت' قدرت کے حسابوں سے
طبقوں سے بٹی دنیا صدیوں سے پریشاں تھی
غمناکیاں رستی تھیں آباد خرابوں سے
انساں کا مقدر اور' اسلام کی عظمت بھی
آزاد ہوئے آخر شاہی کے عذابوں سے

بعض اوقات جب معتمد ساتھی ڈاکٹر صاحب سے سوال کرتے کہ آخر وہ کونسی وجوہات تھیں جن کی بناء پر آپ نے ملک کے ہر در و دیوار تک امام کا پیغام اور گھر گھر تک امام کی تصاویر پہنچائیں۔ جبکہ عالمی استعمار' اس کے ایجنٹ اور ہمارے حکمران

آپ کی فکر کے مخالفت تھے ....؟ تو آپ خوشگوار تاثرات کے ساتھ جواب دیتے کہ ''علماء کرام کی محنت اور آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی زحمات اس کی بنیادی وجوہات تھیں جبکہ ان دونوں حلقوں کا محور امام سے عشق تھا۔ آپ فرماتے کہ ہمارے نوجوانوں نے ملک میں امام کی تصاویر اور توضیح المسائل ٹرکوں کے حساب سے تقسیم کیں اور مختصر عرصہ میں خاطرخواہ نتائج حاصل کئے۔''

سفیر انقلاب کو بانی انقلاب سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ کوئی ایسا مسئلہ جو یہاں کے علماء کی دسترس سے باہر ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب فوراً دفتر امام خمینی سے رابطہ کرتے اور امام کی رائے یا حکم کے منتظر رہتے۔ ایک مرتبہ راقم نے تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر ۲۔ دیو سماج روڈ پر ڈاکٹر صاحب سے چند امور پر بحث کی تو آپ نے فوراً فرمایا امام سے پتہ کرتے ہیں جب تک امام خمینی کا سایہ ہمارے سروں پر قائم ہے اس وقت تک ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے ایران میں دفتر امام سے رابطہ کیا اور چند روز بعد مجھے وضاحت سے آگاہ فرمایا۔

میں نے ''سفیر نور'' کتاب میں علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کی امام خمینی سے عقیدت کے واقعات نقل کئے مگر مجھے ذاتی طور پر کبھی امام خمینی کی ذات پر گفتگو کے دوران میں شہید حسینی کے چہرے کے تاثرات نوٹ کرنے کا موقع نہ ملا۔ میری زندگی میں ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید وہ واحد انسان تھے جن کے لبوں پر امام کا ذکر آتے ہی ان کے چہرے پر پھول کی سی تازگی آجاتی تھی۔

قارئین پر یہ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب امام خمینی کو غیر معصوم سمجھتے تھے اور شیعہ عقیدہ کے مطابق وہ بارہ آئمہ کے قائل تھے۔ مگر امام خمینی کو آئمہ کا نائب یا ان کا جانشین اور ان کی فکر کا پیغامبر ضرور سمجھتے تھے۔ آپ کی نظر میں امام خمینی کی ذات نائب امام زمانہؑ کی حیثیت رکھتی تھی جس کے بارے میں امام آخرالزمانؑ کی وصیتیں واضح ہیں کہ ''ہمارے بعد ہمارے نائبین آپ پر جبکہ ہم ان پر خدا کی طرف سے حجت ہوں گے'' چنانچہ ڈاکٹر صاحب امام خمینی کی حیثیت کے بارے بالکل واضح تھے اور وہ دل و جان سے امام خمینی کی بات کو اپنے لیئے حجت سمجھتے تھے۔

انقلاب کی آمد کے بعد جب کچھ مخالف قوتوں نے یہ محسوس کیا کہ پاکستان میں

انقلاب اسلامی کا اثر بڑی تیزی سے سرایت کر رہا ہے تو انہوں نے مختلف ہتھکنڈوں سے انقلاب اور امام خمینی کی مخالفت کرنا شروع کر دی۔ ایسے میں استعماری قوتوں کے ایجنٹوں نے ہمارے درمیان سے چند روایتی لیڈروں اور علماء کو استعمال کیا۔ اختلاف میں تیزی آئی تو علماء حقہ اور علماء سو کی اصطلاحات سامنے آگئیں۔ ایک مرتبہ جب ڈاکٹر صاحب سے پوچھا گیا کہ علماء حقہ اور علماء سو کی پہچان کیا ہے ....؟ تو آپ نے فرمایا "جو عالم دین ولی فقیہہ امام خمینی کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مخالفت کرتا ہے وہ علماء سو میں سے ہے جبکہ وہ علماء جو خط امام کے پیرو ہیں وہ علماء حقہ ہیں اور ایسے علماء کی پیروی لازم ہے۔ آپ ہر محفل اور ہر جلسے میں نوجوانوں کو تاکید فرماتے کہ وہ ہر معاملہ میں خط امام کو پیش نظر رکھیں۔

۱۹۸۶ء میں جب امام خمینی نے فرمایا "ہر کس کہ می تواند بآید بہ جبہ بِرُود" "ہر وہ شخص جو طاقت رکھتا ہے محاذ پر پہنچے" تو یہ صدا ڈاکٹر صاحب کے کانوں تک بھی پہنچی اور آپ بغیر حیل و حجت محاذ پر جانے کیلئے تیار ہوگئے۔ یہاں تک کہ آپ نے گھر والوں کو بھی اپنے پروگرام سے آگاہ نہ کیا بلکہ محاذ پر پہنچنے کے تیسرے روز فون کے ذریعہ اہل خانہ کو اطلاع دی کہ "میں اس وقت محاذ پر ہوں" یہاں سے آپ نے اپنے والد صاحب کو لندن خط تحریر فرمایا جسکا مفہوم کچھ یوں تھا "اے والد بزرگوار .... میں اس وقت ایران کے محاذ جنگ پر مجاہدین اسلام کی خدمت میں مصروف ہوں۔ میں آپ سے خط کے ذریعہ معذرت چاہتا ہوں کہ یہاں آتے وقت آپ سے اجازت نہیں لے سکا۔ چونکہ امام کی صدائے استغاثہ میرے کانوں تک پہنچ چکی تھی اور مجھے اپنی زندگی کی وفا کے بارے میں یقین بھی نہ تھا۔ اس لئے میں کوئی لحہ ضائع کیئے بغیر یہاں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے۔

میں آپ سے شہادت کی دعا کا ملتمس ہوں خدا کرے کہ مجھے ان پاکباز نوجوانوں کے ساتھ شہادتوں کے پر سرور ماحول میں شہادت نصیب ہو۔"

جب آپ محاذ پر تھے تو آئی۔ ایس۔ او پاکستان کا وفد انقلاب کے مشاہدہ کیلئے وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ان برادران سے ملے تو وفد میں موجود برادر غلام حیدر حیدری سابق مرکزی آفس سیکرٹری آئی۔ ایس۔ او پاکستان نے آپ کو تنہائی میں بتایا کہ

آپ کے اہل خانہ آپ کیلئے خاصے پریشان ہیں۔ حیدری صاحب کی بات سن کر آپ نے جواب دیا "میرے گھر والوں سے کہنا کہ میں بخیریت ہوں .... یہاں شہادتوں کا ماحول ہے .... کچھ روز قبل امام خمینی سے ملاقات کرکے آئے ہیں اور ان کی دست بوسی کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ میں ایسے روحانی ماحول کو چھوڑ کر اور شہادت جیسی نعمتوں سے منہ موڑ کر واپس لوٹ آؤں۔"

حیدری صاحب نے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اگر آپ یہاں رہے تو پھر پاکستان میں ایسا ماحول پیدا کرنے کیلئے کون آئے گا؟........ آپ نے وعدہ کیا کہ "بشرط حیات جلد وطن لوٹ آؤں گا لیکن ابھی مجاہدین اسلام کے زخموں سے رستالہو مجھے مسیحائی خدمات پر مجبور کر رہا ہے"

جب آپ پاکستان لوٹے تو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط عزم و ہمت کے ساتھ باطل قوتوں سے برسرپیکار ہوگئے۔

آپ کی امام خمینی سے محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ اتحاد بین المسلمین کے پروگرام میں حالات کے پیش نظر چند احباب نے امام خمینی کا نام نہ لینے کیلئے رائے طلب کی۔ تو آپ نے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ امام کے نام پر کسی قسم کی مصلحت عزیز نہیں ہے اور آپ احباب پر خفا ہوئے کہ آخر آپ نے ایسا سوچا کیوں ہے ؟.........

آپ شہید باقر الصدر کے اس فرمان کہ "امام خمینی کی ذات میں اس طرح سے ضم ہو جاؤ جیسے وہ اسلام میں ضم ہو چکے ہیں" کی تفسیر تھے۔ آپ نے ایک بار فرمایا کہ "میں نے ظہور امام مہدی علیہ السلام کی نشانیوں میں ایک نشانی یہ بھی پڑھی ہے کہ جب ۳۱۳ فقیہہ زمانے میں موجود ہوں گے تو امام کا ظہور ہوگا۔ فرمانے لگے کہ اب تک میں متجسس رہا کہ وہ ۳۱۳ لوگ آخر کون ہوں گے ....؟ امام خمینی کی آمد اور ان کے کردار کے بعد یہ عقدہ بھی حل ہوگیا ہے کہ جب آپ جیسے ۳۱۳ فقیہہ موجود ہوں گے تو امام ظہور فرمائیں گے۔

روس کے سابق صدر گورباچوف کو اسلام کی دعوت اور گستاخ رسول سلمان رشدی کے خلاف امام خمینی کے فتویٰ نے پورے عالم میں ارتعاش برپا کیا تو ڈاکٹر

صاحب بے پناہ خوش ہوئے اور فرمانے لگے "امام کے ہوتے ہوئے ایک طرف محمد ﷺ کا دین پھیل رہا ہے اور دوسری جانب گستاخان محمد ﷺ پر غضب طاری ہے۔ گویا امام خمینی قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر ہیں جس میں ارشاد رب العزت ہے کہ "مسلمان آپس میں نہایت نرم اور کفار پر بڑے سخت ہیں۔"

آپ کی کوشش رہی کہ انقلاب اسلامی ایران کی کوئی خدمت سامنے ہو اور آپ اس کیلئے زحمات برداشت کرکے سرخرو ہوں۔ آپ سے جہاں تک ہوسکا آپ نے پاکستان اور ایران میں بے نظیر خدمات سرانجام دیں۔ نظریاتی، فکری، اقتصادی اور سیاسی تعاون کیلئے بھی آپ نے انقلاب ایران کی یادگار خدمت کی۔

انقلاب ایران کے بعد جب آیت اللہ طاہری پاکستان میں نمائندہ امام خمینیؒ کی حیثیت سے تشریف لائے اور انہوں نے "جامعۃالمنتظر" میں دروس کا سلسلہ شروع کیا تو ڈاکٹر صاحب نے نماز صبح کے بعد باقاعدگی سے ان کے دروس میں شرکت فرمائی اور احباب کو بھی آگاہ کیا کہ "نمائندہ امام کے دروس انقلاب پرور ہیں بلکہ مجھے تو ان سے امام خمینیؒ کی خوشبو آتی ہے"۔

سفیر انقلاب کا ایرانی انقلاب سے لگاؤ تین بنیادوں پر تھا جس کا اظہار انہوں نے ۱۱ فروری ۱۹۹۰ء میں روزنامہ جنگ لاہور کے خصوصی ایڈیشن برائے انقلاب ایران میں یوں فرمایا کہ "ایران کا اسلامی انقلاب قیادت، نظریہ اور قربانیوں کا ثمر ہے۔ جب تک وہاں کے عوام ان بنیادی، اصولوں پر قائم ہیں ہم اس وقت تک ان کا ساتھ دیتے رہیں گے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ انقلاب کی بقاء ان اصولوں میں مضمر ہے۔"

۱۹۹۰ء میں ایک مرتبہ راقم نے ایرانی قونصل خانہ لاہور کے عملہ کے رویہ کے خلاف قونصلیٹ جنرل آقای علی قمی کے نام کھلا خط لکھا۔ جس میں پاکستانی مسلمان اور انقلاب کے حمایتی نوجوان کے حوالہ سے مہذب مگر سخت زبان استعمال کی۔ جب یہ خط لاہور میں پھیلا تو قونصلیٹ جنرل نے ہم سے رابطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب سے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ملے تو کہنے لگے "یہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے حقائق ہیں ......؟" میں نے کہا "میں ثبوت کیساتھ یہ ساری چیزیں پیش کرسکتا ہوں" تو فرمانے لگے ایرانی فرشتے نہیں ہیں۔ اگر آپ کسی موقع پر محسوس

کریں کہ ان کے اقدامات سے انقلاب اسلامی کے تشخص کو مجروح کیا جا رہا ہے تو آپ ضرور تنقید کیا کریں کیونکہ ہم امام کے سپاہی ہیں اور جہاں بھی کوئی نقص یا کمی دیکھیں اسے دیانتداری کے ساتھ سلجھائیں"

خانہ فرہنگ ایران کے سابق ڈائریکٹر جنرل صادق گنجی شہید کے بعض اقدامات پر ڈاکٹر صاحب اختلاف رکھتے تھے کہ گنجی صاحب کے بعض ایسے افراد سے تعلقات ہیں اور ایسے لوگوں کی محفلوں میں دیکھے جاتے ہیں جن کو اسلامی معاشرہ احترام کی نظر سے نہیں دیکھتا اسلامی انقلاب کے سفیروں کا تشخص اسلامی حوالے سے ہونا چاہئے نہ کہ کلچر کو فروغ دیتے دیتے وہ قابل اعتراض کلچر میں گھر جائیں۔"

انقلاب اسلامی کے ابتدائی سالوں میں پاکستان کے ایک معروف شاعر نے "ہفت روزہ رضا کار لاہور" میں انقلاب کے بارے میں ایک نظم شائع کرانا چاہی تو ڈاکٹر صاحب نے تجویز دی کہ اگر شاعر کا نام شائع کیئے بغیر ممکن ہو تو شائع کردیں۔ سب ایڈیٹر نے جواز پیش کیا کہ شاعر کے نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ڈاکٹر صاحب نے جواباً" فرمایا "اے عزیز دوست انقلاب اسلامی باکردار شخصیات کی بدولت آیا ہے اور اس کی حفاظت اور ترویج باکردار لوگوں کو کرنی چاہئے۔ یہ شاعر امام کی تعریف تو لکھتے ہیں مگر پاکستان میں ان کے نمائندہ کی مخالفت کرتے ہیں"

۶ جولائی ۱۹۸۷ء کی قرآن و سنت کانفرنس کے اجتماع کے لیئے جلسہ گاہ کے اہم اور حساس مسئلہ پر علامہ سید عارف حسین الحسینی کی تجویز پر ان کے تمام رفقاء نے اختلاف کیا اور ڈاکٹر صاحب بھی دلی طور پر قائد کی تجویز سے مختلف تھے۔ مگر جونہی قائد نے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ کانفرنس "مینار پاکستان" پر منعقد ہونی چاہئے تو ڈاکٹر صاحب نے لبیک کرتے ہوئے حامی بھری اور اپنے قریبی ساتھی سے کہا "اس شخص کی بات تین حوالوں سے ہم پر حجت ہے۔ ایک یہ کہ یہ ہمارے قائد ہیں دوم یہ کہ ہمیشہ ان کی ہر بات کے پیچھے کوئی اور طاقت گویا ہوتی ہے اور سوم یہ کہ یہ امام خمینی کے نمائندہ ہیں۔ لہٰذا ان کی کسی بات کے آگے چون و چرا گناہ کرنے کے مترادف ہے۔"

یہ آپ کی امام خمینی سے محبت کا نتیجہ تھا کہ دنیا بھر میں امام کے نمائندگان سے

آپ کے روابط تھے اور آپ ان کے امر کی تعمیل بھی لازم سمجھتے تھے۔

۱۹۸۴ء میں جب سید علی خامنہ ای صدر اسلامی جمہوریہ ایران کی حیثیت سے سرکاری دورہ پر پاکستان آئے تو لاہور میں ان کے استقبال کے تمام انتظامات ڈاکٹر صاحب کی گرفت میں تھے۔ جب وہ کسی وجہ سے اسلام آباد سے لاہور مقررہ دن پر تشریف نہ لائے بلکہ ان کی آمد کو ایک روز کی تاخیر ہوگئی تو استقبالی ہجوم سے ڈاکٹر صاحب نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "ہمارے معزز مہمان کل تشریف لائیں گے لہٰذا دور دراز سے آئے ہوئے لوگوں کو گھروں کو واپس نہیں لوٹ جانا۔ یہ صدر ایران کا استقبال نہیں بلکہ امام خمینی کے نمائندہ کا استقبال ہے۔ لاہور والے حضرات کو چاہئے کہ وہ باہر سے آئے ہوئے برادران کو اپنے گھروں میں لے جائیں اور ان کی مہمان نوازی کریں۔"

دوسرے روز جونہی نمائندہ امام خمینی لاہور ایئر پورٹ پر آئے تو ڈاکٹر صاحب اور آپ کے احباب نے ان کا مثالی استقبال کیا۔ اور اس موقع پر "مرگ بر امریکہ اور یار امام خوش آمد" کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ اس تاریخی استقبال کے بعد ڈاکٹر صاحب انتہائی پرمسرت تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "یقیناً" امام خمینی خوش ہوں گے کہ اسلامیان پاکستان نے ان کے نمائندہ کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہا ہے۔"

ڈاکٹر محمد علی نقوی کی امام خمینیؒ اور انقلاب اسلامی سے محبت و عقیدت "لا ریب" تھی۔ آپ بہت جری اور مضبوط اعصاب کے مالک انسان تھے۔ بڑے بڑے حادثوں میں آپ کے چہرے پر شکن تک نہیں آئی تھی۔ مگر جب آپ نے امام خمینی کی رحلت کی خبر سنی تو آپ آئی۔ ایس۔ او کے مرکزی دفتر ۲۔ دیو سماج روڈ پہنچے۔ وہاں پر موجود برادران جونہی پرسہ دینے کیلئے ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھے تو آپ کی دھاڑیں نکل گئیں۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب اپنے والدین کی دفات پر صرف اشکبار ہوئے یہ نہیں کہ انہیں اپنے والدین کی فرقت کا غم نہیں تھا بلکہ وہ خود فرماتے تھے کہ "میرے والدین کی رحلت نے مجھے یتیم کیا تھا جبکہ امام خمینی کی رحلت نے مسلمانان عالم کو یتیم کیا ہے۔ اس لئے یہ صدمہ ذاتی صدمات سے بہت بھاری ہے"۔

امام خمینی کی رحلت پر مولانا کوثر نیازی مرحوم نے فارسی میں ایک شعر لکھا۔

حال مادر ہجر رہبر کم تر از یعقوب نیست
او پسر گم کردہ بود من پدر گم کردہ ایم

(ترجمہ :۔ رہبر کے ہجر میں میری حالت حضرت یعقوبؑ سے ہرگز کم نہیں ہے۔ ان سے ان کا بیٹا جدا ہوا تھا جبکہ مجھ سے میرا باپ بچھڑ گیا ہے)۔

جب ڈاکٹر صاحب نے سیاہ بینر پر لکھا ہوا یہ شعر پڑھا تو فرمایا "اس عبد خدا نے ہماری ترجمانی کی ہے"۔

سفیر انقلاب نے لاہور میں اسلامی انقلاب کی چودھویں سالگرہ پر امام خمینی کی ذات کے بارے میں صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی کا مراسلہ سنا جو بہترین لفظوں سے مزین اور عقیدت کی خوشبو سے معطر تھا تو فرمانے لگے کہ آج کے اس جلسہ میں ہمارے (شیعہ) کسی مقرر نے وہ فکر نہیں دی جو گیلانی صاحب کے مراسلہ میں تھی گیلانی صاحب کی محنت نے جلسہ کا حق ادا کر دیا ہے۔" ہم گاڑی میں روانہ ہوئے تو کہنے لگے "تسلیم میاں! آئندہ آپ بھی ایسے ہی خوبصورت اور بامقصد مراسلات لکھنے اور پیش کرنے کی کوشش کریں کیونکہ امام کی خوبصورت فکر کو اگر خوبصورت الفاظ اور خوبصورت انداز میں پیش کیا جائے تو پیغام میں اثر پیدا ہو جاتا ہے۔"

امام خمینی کی ذات سے آپ کے عشق کا اثر براہ راست آپ کے بچوں پر بھی تھا۔ ایک مرتبہ ہم چار پانچ احباب تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر میں بیٹھے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے دو سالہ معصوم بیٹے موسیٰ رضا بھی آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے موسیٰ کو گود میں لیا اور کمرہ میں لگی ہوئی تین تصاویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "موسیٰ امام کی تصویر کونسی ہے۔ تو موسیٰ نے انگلی کے اشارہ سے امام کی تصویر بتائی۔ ہم نے اخذ کیا کہ ایسا معصوم بچہ جس نے ابھی تک زبان نہیں کھولی مگر کھلی آنکھوں سے امام کی معرفت کر لی ہے۔ اسی طرح آپ کے دو بچے سلمان اور دانش جب بھی آئی۔ ایس۔ او کے کنونشن میں آتے تو ان کے سینے پر امام کی تصویر ضرور لگی ہوتی تھی۔

اپنے دو صاحبزادوں کے درمیان میں حالات حاضرہ کو انہماک سے سنتے ہوئے۔

جس قدر ڈاکٹر صاحب انقلاب اور امام سے عشق رکھتے تھے اس قدر ایران کی اعلیٰ شخصیات کو بھی آپ کی معرفت اور آپ سے محبت تھی۔ کراچی میں مقیم آیت اللہ سید علی خامنہ ای کے نمائندہ آغا بہاء الدینی نے ایک بھری محفل میں فرمایا کہ ''میں نے پاکستان میں ایک نوجوان بھی ایسا نہیں دیکھا جو امام خمینی اور انقلاب اسلامی ایران سے عشق رکھتا ہو اور اس کا تعلق ڈاکٹر محمد علی نقوی سے نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام کی محبت کا اصل محور ڈاکٹر نقوی کی ذات ہے''۔ ان سے جب ایران میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں تاثرات لیئے گئے تو انہوں نے فرمایا کہ ''ڈاکٹر صاحب سے ان کا تعلق عاشق معشوق کا تھا۔'' علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بعد یہ اعزاز ڈاکٹر صاحب کی ذات کو حاصل ہے کہ ان کی شہادت پر ایران کی اعلیٰ شخصیات نے ذاتی طور پر تعزیت کی اور ایرانی نشرواشاعت میں کئی روز تک آپ کی زندگی کے پہلو زیر بحث رہے۔

یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید نے شعوری طور پر امام خمینی کی معرفت کی اور شعوری طور پر اپنے نظریہ پر قائم رہے۔ وہ امام خمینی کا اس قدر عرفان رکھتے تھے کہ انہوں نے ہمیشہ امام کے فرمان کو اپنے لئے واجب سمجھا اور اس کی جزیات نکالنے یا منطق تلاش کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ آپ کا نظریہ تھا کہ کسی شخصیت کو ایک بار درک کر لینے کے بعد اس کی ہر بات پر رائے قائم کرنا معرفت کے متضاد ہے۔

سفیر انقلاب کو قریب سے جاننے والے احباب آج بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے امام یا نمائندہ امام کے کسی فرمان سے بھی بال برابر انحراف نہیں کیا بلکہ ان کے ہر حکم کو واجب جان کر ادا کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے اپنے نظریہ سے وفا کی خاطر پولیس کے تشدد' گرد و پیش کے جبر' روزگار کے ستم' اپنوں کی زیادتیاں اور غیروں کے ظلم برداشت کیئے .... آپ کے سر پر ضربیں' آپ کے نحیف جسم پر تشدد کے نشانات' آپ کے دل پر سینکڑوں زخم یہاں تک کہ آپ کے جسم میں پیوست گولیاں امام خمینی سے عشق کا نتیجہ تھیں .... آپ نے ہر ظلم مسکرا کر سہا' وطن کے اندر اور وطن سے باہر مصائب و مشکلات کے کٹھن ترین مراحل سے گزرے مگر

کسی بھی مرحلہ پر آپ کے پاؤں میں لغزش پیدا ہوئی نہ چہرے پر کوئی شکن نظر آئی ...... آپ نے زندگی کا ہر مشکل مرحلہ فراموش کیا مگر امام خمینی کی ملاقات اور ان کی دست بوسی آپ کیلئے سرمایہ حیات بن گئی۔

ڈاکٹر صاحب کی ذات رازوں کا سمندر تصور کی جاتی تھی جو بات ان کے دل تک پہنچ جاتی یا ذہن کی لوح پر لکھی جاتی، لبوں سے اس کا اظہار بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ مگر امام سے ملاقات کے لمحات کو انہوں نے کئی بار اپنے احباب کے سامنے دہرایا اور ہر بار نئی لذت حاصل کی۔ سفیر انقلاب بتایا کرتے تھے کہ جب وہ ایران کے محاذ پر مصروف خدمت تھے تو ایک روز ان کے لشکر کو "جماران" قم لایا گیا تاکہ وہ زیارتیں اور سیر و تفریح کرلیں جب یہ لشکر اسلام امام خمینی کے علاقہ میں پہنچا تو انہیں اچانک یہ خبر دی گئی کہ آج ان کی ملاقات امام سے کرائی جائے گی۔ یہ خبر سن کر مجاہدین کے فرط مسرت سے آنسو چھلک پڑے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی حالت بیان کرتے تھے کہ ان کی داڑھی اور بال بڑھے ہوئے تھے۔ ان کا کوٹ بھی ستھرا نہ تھا۔ پینٹ کی حالت تو ویسے ناگفتہ بہ تھی۔ مگر یہ باتیں اور خیالات مرچکے تھے صرف اور صرف امام کی زیارت کا اشتیاق زندہ تھا۔ چنانچہ مجاہدین وقت مقررہ سے قبل ملاقات گاہ تک پہنچ گئے۔ آخر امام تشریف لائے۔ باری باری انہوں نے مجاہدین سے مصافحہ کیا اور دعا دی۔ عاشق امام فرماتے تھے کہ "انہیں امام کی دست بوسی کی لذت اور سرور تازیست نہیں بھولے گا بلکہ جب بھی تصور میں وہ لمحات آتے ہیں وہی لذت حاصل ہونا شروع ہو جاتی ہے"

ہر وہ محفل جس میں امام کا ذکر ہوتا آپ کی پسندیدہ محفل ہوتی تھی اور وہ افراد جو امام ور ان کی فکر کا تذکرہ کرتے تھے آپ کو محبوب لگتے تھے۔ آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ امام کا ذکر وسیع پیمانے پر ہو اور ان کا آفاقی پیغام بلا تفریق تمام مسلمانوں بلکہ غیر مسلم تک بھی پہنچے۔ ایسی محافل جس میں امام کی ذات کو محدود کرنے کی کوشش کی جاتی آپ کو بھلی نہ لگتی تھیں۔ بلکہ آپ فرماتے کہ جو شخص امام کی فکر یا ذات کو شیعہ دائرہ میں محدود کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ظلم کرتا ہے۔ ایک موقع پر آپ نے کسی کا واقعہ نقل کیا کہ وہ شخص امام کی برسی پر ایران گیا تو امام کے مزار کے گرد چند

سکھوں کو ماتم کرتے دیکھا۔ جب اس نے سکھوں سے گریہ و ماتم کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ امام خمینی ایرانیوں کے امام (قائد) نہیں تھے بلکہ وہ دنیا بھر کے تمام حریت پسند انسانوں کے امام تھے کیونکہ انہوں نے موجودہ زمانہ کے حبس زدہ ماحول میں ہمیں سانس لینے کا فن سکھایا تھا۔"

عاشق امام، سفیر انقلاب کی دلی خواہش تھی کہ دنیا کا ہر مظلوم، ہر محکوم، ہر مستضعف امام خمینی کو اپنا امام (رہبر) تسلیم کرے اور ان کی صدا پر لبیک کہہ کر وقت کے ہر ظالم، ہر حاکم، ہر جابر، ہر فاسق و فاجر سے ٹکرا جائے۔

ایک موقع پر امام کے حوالہ سے آپ نے اپنی تشنہ مسرت کا ذکر فرمایا کہ "کاش بیت المقدس امام کے ہاتھوں آزاد ہوتا اور امام اس میں نماز کی امامت کراتے اور ہم ان کی اقتداء میں نماز ادا کرتے۔"

چونکہ ڈاکٹر صاحب مزاجاً غیور، حریت پسند اور حق پرست مجاہد تھے۔ اس لئے امام خمینی کے بارے آپ کا نظریہ کچھ یوں تھا کہ

عطا کیا ہے ہمیں اس نے زندگی کا شعور
یہ سانس لینے کا ہم کو ہنر دیا اس نے
شفق کے رنگ بکھیرے ہیں اس نے عالم پر
سیاہ شب کو لباسِ سحر دیا اس نے

مؤقر ذرائع کا کہنا ہے کہ سفیر انقلاب نے انقلاب اسلامی ایران کے تحفظ کیلئے ہر ممکنہ قربانی پیش کی۔ آپ نے نہ صرف ایران کے محاذوں پر مجاہدین اسلام کے زخموں کا علاج کیا بلکہ آپ نے پاکستان میں ایران مخالف قوتوں اور ایجنسیوں کے افراد سے بھی جاندار ٹکر لی۔ آپ کے ذاتی ذرائع اس قدر مستحکم تھے امریکہ کا جو گروہ بھی پاکستان میں ایران کے خلاف سازشیں تشکیل دینے آتا آپ کو اس کی مکمل اطلاع ہو جاتی یا سعودی عرب کا کوئی ایجنٹ وطن عزیز میں فرقہ واریت کو استحکام دینے کی غرض سے آتا تو آپ کو اس کی نقل و حرکت کی رپورٹ پہنچ جاتی۔

جونہی آپ کی شہادت کی اطلاع ایران موصول ہوئی تو وہاں کی کئی تنظیموں نے آپ کی شہادت کے پوسٹر شائع کرائے جو کئی ماہ تک ایران کے در و دیوار پر چسپاں رہے۔ وہاں آپ کی مجالس ترحیم ہوئیں۔ جس میں آپ کے صاحبزادے سید سلمان نقوی نے بھی شرکت کی۔ ذرائع ابلاغ میں آپ کی شہادت کا کئی روز تک ان الفاظ میں تذکرہ ہوتا رہا کہ "پاکستان کے نوجوانوں کی امید' انقلاب اسلامی کے پرستار' امام خمینی اور شہید حسینی کے جانثار ساتھی' امریکہ کے کٹر دشمن اور پاکستان کے ڈاکٹر مصطفیٰ چمران وطن اور اسلام دشمن قوتوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔"

☆☆☆☆☆

تحریک جعفریہ و سفیر انقلاب

۶ جولائی ۱۹۷۷ء کو ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت معزول ہوئی تو اس کی کوکھ سے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے جنم لیا۔ بھٹو کے خلاف "قومی اتحاد" کی تحریک کی حرارت کو محسوس کرتے ہوئے ضیاء الحق نے نظام مصطفیٰ کے نفاذ کا اعلان کر دیا۔ چونکہ "قومی اتحاد" میں شامل تمام مذہبی جماعتوں کا تعلق "فقہ حنفی" سے تھا۔ اس لئے ضیاء الحق نے نظام مصطفیٰ کو بھی "فقہ حنفی" کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جو مکتب اہل بیت کے پیروکاروں پر گراں گزری۔ فقہ جعفریہ سے تعلق رکھنے والی ملک کی اہم اور موثر آبادی کو نظام مصطفیٰ کے نفاذ پر قطعاً" اعتراض نہ تھا بلکہ یہ ان کی دیرینہ خواہش تھی مگر وہ اپنی فقہ پر دوسری فقہ کے تسلط کے حق میں نہ تھے۔ اہل تشیع کا مطالبہ تھا کہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے بعد ہر فقہ کے پیرو کاروں کے فیصلہ جات اس کی فقہ کے مطابق ہوں جبکہ ضیاء الحق اپنے مفادات اور مخصوص مقاصد کی تکمیل کیلئے ایک سمت میں بہے جا رہا تھا۔

علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم جو اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن تھے نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مقاصد کو درک کرتے ہوئے نظریاتی کونسل کی رکنیت سے استعفا دے دیا اور قومی حقوق کے تحفظ کیلئے متحرک ہوگئے۔

حالات کے تیزی سے بدلتے ہوئے تیور دیکھ کر ملت جعفریہ کے عمائدین نے ماضی کی طرح حکومت کے عزائم کے خلاف تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۲، ۱۳ اپریل ۱۹۷۹ء کو بھکر میں پوری قوم کو اکٹھا کرکے اسے حکومت کے عزائم سے آگاہ کیا گیا۔ جب پوری قوم نے قائد کے افکار سے اتفاق کیا تو "تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان" کا قیام عمل میں آگیا۔

چونکہ میرا مقصد یہاں تحریک جعفریہ کا تاریخی پس منظر اور حالات لکھنا نہیں بلکہ اس کی پوری تفصیل "سفیر نور" میں شائع ہوچکی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس پوری تاریخ میں "سفیر انقلاب" کے کردار کو تلاش کرنا ہے اور دیکھنا یہ ہے کہ ایک نوجوان نے قومی معاملات میں کس طرح اٹھان لی، اس کی تان میں کتنا درد تھا، وہ کن کن مراحل

سے گزرا، کہاں سے چلا اور کہاں تک چلا ....؟

جب علامہ مفتی جعفر حسین نظریاتی کونسل کے رکن تھے تو سفیر انقلاب اپنے چند برادران کے ہمراہ مفتی صاحب کو قائل کرتے تھے کہ حکومت کے کسی عہدہ پر رہ کر حکومت کے خلاف تحریک چلانا ناممکن نہیں تو بصد مشکل ضرور ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب کو استعفاء کے مرحلہ پر لانے میں نوجوان گروپ کا گہرا عمل دخل ہے۔

بھکر کے اجتماع کا اعلان ہوا تو آئی۔ ایس۔ او پاکستان نے تمام تر انتظامات اپنے ہاتھوں میں لئے اور قوم کو سرخرو کرنے کی ٹھان لی۔ سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی جو اس وقت اپنی پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔ لاہور میں بیٹھے ملک بھر سے مربوط رہے اور لحہ بہ لحہ بھکر کے انتظامات سے آگاہ ہوتے رہے۔

کنونشن سے ایک روز قبل سفیر انقلاب اپنے اہم تنظیمی احباب کے ہمراہ بھکر پہنچے۔ وہاں کے منتظمین سے ملے، اپنے تنظیمی نوجوانوں کی محنتوں کو سراہا اور اہم برادران کیساتھ لائحہ عمل تیار کیا۔

۱۲ اپریل کو ملک بھر سے قافلے بھکر پہنچنا شروع ہوئے تو آئی۔ ایس۔ او کے نوجوانوں نے انہیں خوش آمدید کہا اور جلسہ گاہ کو اپنی گرفت میں رکھا۔ ایک موقع پر جلسہ کے دوران تیز آندھی آئی تو سفیر انقلاب نے سٹیج پر کھڑے ہو کر صدا بلند کی "دوستو! پولز کو مضبوطی سے تھام لو۔ آج سے تمہارا پہلا امتحان شروع ہے اگر معمولی سی آندھی نے قوم کے سروں پر شامیانے گرا دیئے۔ تو پھر ثابت ہو جائے گا کہ تم مستقبل میں گرنے والے طوفانوں کو بھی نہیں روک سکتے۔" آپ کے یہ جملے سن کر نوجوان پولز سے چمٹ گئے اور آندھی کو شکست دی۔

۱۳ اپریل کو "تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان" کا وجود عمل میں آیا اور اس کی قیادت علامہ مفتی جعفر حسین کو سونپی گئی۔ جب مفتی صاحب کی قیادت کا اعلان ہونے کا وقت آیا تو ایک آدھ نامور خطیب سٹیج پر آئے اور کہنے لگے "مفتی صاحب ہمارے برخوردار ہیں، علامہ مرزا یوسف حسین لکھنوی کی موجودگی میں قیادت کا اہل اور کون ہو سکتا ہے ....؟" یہ وہ پہلا موقع تھا جب سفیر انقلاب سٹیج کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سن کر اپنے چند نظریاتی احباب کے ساتھ اٹھے اور باآواز بلند نعرہ لگایا۔

ایک ہی قائد' ایک ہی رہبر مفتی جعفر، مفتی جعفر

پھر یہ نعرہ اس شد و مد سے بلند ہوا کہ مخالفین کی آواز شور میں دب گئی اور قوم کو ایک پاکباز 'جری' بے داغ اور صاحب درد قائد میسر آیا۔

سفیر انقلاب اور ان کے رفقاء کا یہ نعرہ سند بن گیا اور ہر اس مقام پر گونجا جہاں کہیں قیادت کے خلاف کسی بھی جعلی قیادت نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ اپریل ۱۹۸۲ء کو ڈیرہ غازی خان کے ایک معروف جلسہ میں جب عقیل ترابی کیلئے جلسہ کے بانی نے "قائد ملت جعفریہ" کا جملہ ادا کیا تو اس وقت آئی۔ ایس۔ او کے نوجوان اٹھے اور انہوں نے وہی نعرہ بلند کیا۔

ایک ہی قائد' ایک ہی رہبر مفتی جعفر، مفتی جعفر

جب منبر مجالس پر گرفت رکھنے والے پیشہ ور مقررین' قصر قیادت میں دراڑیں نہ ڈال سکے تو انہوں نے قیادت سے مربوط علماء حقہ کے خلاف عقائد کی جنگ کا آغاز کر دیا تاکہ سادہ لوح عوام جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے ہاتھوں سے اپنی تباہی کی داستان رقم کریں۔ جنگ کے بنیادی نکات آئمہ سے مدد طلب کرنا' عزاداری و زنجیر زنی' تخلیق آئمہ' تشہد میں شہادت ثالثہ اور سیدہ کا غیر سید سے نکاح وغیرہ وغیرہ تھے۔ چار پانچ سال تک اختلافات کا زہر اس قدر پھیلا کہ پوری ملت جعفریہ مسموم ہوگئی۔

جارحیت کرنے والوں کا نشانہ علماء حقہ بنے۔ قوم واضح طور پر دو گروہوں میں تقسیم ہوئی۔ جارح "غالی" اور نشانہ بننے والے "مقصرین" ٹھہرے۔ منبر پر مسلط افراد نے مدارس اور مساجد میں بیٹھے ہوئے علماء کے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ انبیاء کے وارث علماء پر سب و شتم تک ہونے لگا۔

جب نوبت یہاں تک پہنچی تو سفیر انقلاب تڑپے اور اپنے احباب کو اکٹھا کر کے

فرمایا۔

مسافران گرفتہ دل ! پھر علم اٹھاؤ
کہ زائچوں کی عبارتیں پھر بدل گئی ہیں

آپ نے مرکزی احباب کو صورتحال، پس منظر اور مستقبل کے خدشات سے آگاہ کیا اور ان سے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ "وہ عقائد کی طوفانی جنگ میں علماء حقہ سے مربوط ہوں اور قوم کی رگوں میں پھیلی ہوئی زہر کا تریاق معلوم کریں۔ سب سے پہلے خود کو مطمئن کریں اور پھر دلائل کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر معاشرہ میں نکلیں اور تمام تر اعتراضات کا جواب دیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے ان حالات میں علماء سے استفادہ کیا اور قوم میں رخنہ پھیلانے والوں کی تہہ تک پہنچے۔ آپ نے حقائق اور انکشافات پر مبنی کتب اور رسائل کا ایک تھیلا بنایا جسے لیکر آپ ہر متاثرہ مقام تک گئے۔ یہ تھیلا ہروقت آپ کے ساتھ ہوتا تھا اور آپ جب بھی کسی قومی اجتماع میں پہنچتے یا کسی محفل میں جاتے تو آواز بلند کرتے "عقیدے ٹھیک کروا لو۔ عقیدے ٹھیک کروا لو" چنانچہ آپ کا یہ تھیلا "عقائد کا تھیلا" مشہور ہوگیا۔

آپ نے طوفانی حالات میں نہایت صبر اور بے جگری سے جنگ لڑی جہاں بھی گئے دلائل کے انبار لگا دیئے اور اعتراض کرنے والوں کو لاجواب کرکے قائل کیا۔ آپ کا مؤقف تھا کہ عقائد کی اس جنگ کے پیچھے استعماری ایجنٹ کار فرما ہیں اور یہ سارا طوفان انقلاب اسلامی ایران کے خلاف برپا کیا گیا ہے۔ تاکہ دنیا بھر میں اس کے حمایتی نفاق کا شکار ہوں۔

ایک طرف سفیر انقلاب نے ملک بھر میں نظریاتی دوستوں کے تعاون سے عوام کو حقائق سے آگاہ کیا جبکہ دوسری جانب منبر پر امام خمینی اور علماء حقہ کے خلاف شعلے اگلنے والوں کی زبان بند کی۔ ڈاکٹر صاحب کی نظریاتی فوج نے ملک بھر میں سازشی ٹولہ کا مجالس کے اندر اور باہر مقابلہ کیا اور انہیں زبان منہ میں رکھنے پر مجبور کر دیا۔ اس

سلسلہ میں کئی نوجوان تشدد کا نشانہ بھی بنے یہاں تک کہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے سابق مرکزی صدر برادر ثاقب نقوی بھی اس حادثہ کی زد میں آئے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ انہوں نے محسن ملت علامہ سید صفدر حسین نجفی جیسی عظیم مرتبت شخصیت کے خلاف زبان دراز کرنے والے ایک معروف مقرر کی شدید مزاحمت کی تھی۔ جس کے بعد لاہور میں ایک ہنگامہ برپا ہوا اور کئی سالوں تک برادر ثاقب نقوی تنظیمی دائرے سے باہر رہے اور وہ ان لوگوں میں شامل ہوگئے جن کے بارے کہا جاتا ہے۔

وہ لوگ جو شب کی سلطنت میں ہتھیلیوں پر چراغ لائے
صلیب بردوش' آبلہ پا صعوبتوں کے حصار میں ہیں

سفیر انقلاب اور ان کے رفقاء نے ہر سطح پر قائد ملت جعفریہ علامہ مفتی جعفر حسین کے ہاتھ مضبوط کرنے کیلئے شب و روز کوششیں کیں۔ چونکہ تحریک کے قیام کے ابتدائی ایام میں علماء کرام و عمائدین تنظیمی پلیٹ فارم پر زیادہ فعال نہ تھے اور نہ ہی تنظیمی ڈھانچوں اور تقاضوں سے زیادہ ہم آہنگ تھے۔ اس لئے آئی۔ ایس۔ او پاکستان اور آئی۔ او پاکستان کے تجربہ کار نوجوانوں نے بنیادی امور کو انتہائی محنت اور لگن سے نبھایا۔ تحریک کا پہلا دستوری ڈھانچہ تیار کرنے میں تنظیمی نوجوانوں نے بہت سی جماعتوں کے دستور پڑھے۔ فعال تنظیموں کے دستور اور پالیسیاں زیر غور لائیں' اپنے علماء کرام کی فکر کو درک کیا اور قومی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر "دستوری ڈھانچہ" پیش کر دیا۔ علماء کرام کی مشاورت اور نظارت کے بعد یہ دستور تیار ہوا جسے آج بنیادی اکائی کی حیثیت حاصل ہے۔

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان کے ابھی تنظیمی ادارے تشکیل نہیں پائے تھے کہ جنرل ضیاء الحق نے زکواۃ و عشر آرڈیننس جاری کر دیا۔ جس کی تشریحات مکتب تشیع کی "فقہ" سے متصادم نظر آئیں۔ چنانچہ تحریک کے قائدین نے ضیاء الحق کے فقہ جعفریہ کے خلاف بڑھتے ہوئے رجحانات کو روکنے کیلئے ۵ جولائی ۱۹۸۰ء کو اسلام آباد میں کنونشن کے انعقاد کا اعلان کیا۔

چونکہ تحریک کے پلیٹ فارم پر یہ پہلا قومی اجتماع تھا اور قائد ملت جعفریہ علامہ مفتی جعفر حسین کی پہلی صدائے استغاثہ تھی اس لئے علماء کرام بالخصوص آئی۔ ایس۔ او پاکستان نے اسے حکومت سے پہلا معرکہ گردان کر شب و روز محنت کی۔ سفیر انقلاب اس کنونشن کے منتظمین اعلیٰ میں سے تھے جو بیک وقت کئی امور سرانجام دے رہے تھے۔ ملک بھر میں نشرواشاعت، کنونشن کے انتظامات اور وہاں پر کسی بھی حادثہ سے نمٹنے کی منصوبہ بندی ان کے ذمہ تھی۔ یاد رہے کہ سفیر انقلاب اپنے قافلہ کو لاہور سے اسلام آباد موٹر سائیکلوں پر لے گئے تھے۔

جب ۵ جولائی کو یہ طے پایا کہ شرکاء کنونشن کل صبح ۶ جولائی کو مرکزی سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کریں گے تو درمیانی رات قائدین کیلئے بہت پرخطر اور کٹھن گزری۔ راولپنڈی میں ہونے والی رات کی خفیہ میٹنگ میں ڈاکٹر محمد علی نقوی نے مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ آپ میٹنگ میں شامل بھی رہے اور وقفہ وقفہ سے باہر کے حالات سے باخبر بھی ..... اس رات ایجنسیاں اور حکومتی خفیہ ادارے حالات کی صورتحال سے آگاہ ہونے کیلئے انتہائی بے قرار تھے انہوں نے مختلف روپ دھار کر اجلاس میں شریک ہونے کے لاکھ جتن کیئے مگر سفیر انقلاب کی منصوبہ بندی سے ہربار ناکام لوٹے۔ آخر ایک موقع پر یہ نوبت بھی آئی کہ ایجنسیوں نے آپ کو گرفتار یا اغواء کرنے کا منصوبہ بنایا مگر حالات کی شدت کے پیش نظر وہ ایسا نہ کرسکیں۔

خفیہ اداروں کو کسی حد تک یہ معلوم ہوچکا تھا کہ کل شیعہ نوجوانوں نے حکومت کیلئے جو پریشان کن قدم بھی اٹھایا اس کی قیادت ڈاکٹر محمد علی نقوی کریں گے لہٰذا وہ ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس موقع پر سادہ لباس میں ملبوس پولیس کے چند افراد نے آپ کے ایک دوست کو گرفتار کیا۔ آپ کو اطلاع ملی تو آپ دوڑ کر ان پولیس کے افراد کے پاس گئے اور کافی تکرار کے بعد اپنے معتمد ساتھی کو چھڑا لائے۔ اسی رات ڈاکٹر صاحب نے اپنے نہتے ساتھیوں کو آنسو گیس، لاٹھی چارج اور فائرنگ کے مقابلے کیلئے بھی تیار رکھا۔

۶ جولائی کے روز عوام کی کثیر تعداد مدرسہ آیت الحکیم راولپنڈی میں موجود تھی اور پولیس نے انہیں گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ پولیس کا ارادہ تھا کہ یہ سینکڑوں افراد

جلوس میں شامل نہ ہوسکیں۔ ڈاکٹر صاحب نے پولیس کی نقل و حرکت سے ان کی نیت جانچ لی اور اعلان فرمایا کہ ہمارا قافلہ ٹھیک ۱۰ بجے جلوس کی شکل میں روانہ ہوگا۔ مگر اپنے عوام کو راز سے آگاہ کیا کہ وہ ایک ایک دو دو کرکے مقام مقررہ تک پہنچ جائیں۔ آخر ایسا ہی ہوا کہ عوام ۱۰ بجے سے قبل مدرسہ سے نکل گئے اور پولیس ہاتھ دھرے رہ گئی۔

۶ جولائی ۱۹۷۶ء کو جب ملت جعفریہ نے قائد ملت جعفریہ کی قیادت میں مرکزی سیکرٹریٹ کا گھیراؤ کرنا چاہا تو پولیس نے خاصی مزاحمت کی ایک موقع پر جب پولیس نے آنسو گیس کے شیل پھینکے تو ڈاکٹر صاحب شیل پھٹنے سے پہلے ان پر شیر کی طرح جھپٹتے اور اسے واپس پھینک دیتے یوں وہ شیل پولیس کے درمیان پھٹتا۔

ایک مرحلہ پر جب پولیس نے فائرنگ کیلئے پوزیشنیں سنبھالیں اور جلوس کے آگے ایک لائن لگا دی کہ وہ اس کو عبور نہ کرے تو اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے نوجوانوں کی صفیں درست کیں اور اعلان کیا کہ "جو شہادت کیلئے تیار ہے وہ قطار میں آجائے۔ یہ اعلان سن کر پورا جلوس کچھ دیر کیلئے رکا اور سفیر انقلاب نے اس اثناء میں نوجوانوں میں کفن تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ آپ نے پہلا کفن خود پہنا اور جرنیل کی طرح تمام قطاروں کے آگے کھڑے ہوگئے۔

جلوس میں شریک علماء' ذاکرین' عمائدین اور عوام اس منظر کو دیکھ کر اشکبار تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر موت دکھائی دے رہی تھی مگر آئی۔ ایس۔ او کا ہر نوجوان "یا حسین" کا نعرہ لگاتا ہوا شہادت کے طلبگاروں کی صفوں میں شامل ہو رہا تھا۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ پولیس کی طے شدہ حد جو بھی عبور کرے گا وہ گولیوں کا نشانہ بنے گا۔ ایسے میں ڈاکٹر محمد علی نقوی نے "یا حسین" کا نعرہ بلند کیا اور کفن پوش الرٹ ہوگئے۔ مارچ شروع ہوا۔ پولیس نے اپنی بندوقیں لوڈ کیں .... ہر آنکھ حد پر ٹھہری کہ اتنے میں سفیر انقلاب نے پھر "یا حسین" کا نعرہ بلند کرکے پولیس کی حد کو عبور کیا .... گولیوں کیلئے تنا ہوا سینہ آگے بڑھتا گیا اور سینے پہ وار کرنے والی بندوقیں مورچوں میں گھستی گئیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب پولیس اور فوج کی تمام تر پابندیوں کو توڑ کر سیکرٹیریٹ کے قریب جا پہنچے اور گھیراؤ کو آخری شکل دی۔ تاریخ

گواہ ہے کہ پاکستان میں پہلی بار کسی جماعت نے مرکزی سیکرٹیریٹ کا گھیراؤ کیا اور قوم
شاہد ہے کہ اس گھیراؤ میں ڈاکٹر محمد علی نقوی کا کردار نمایاں تھا۔

٦ جولائی کو جب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ملت جعفریہ کے سامنے گھٹنے ٹیکے تو
اس نے قائدین کو مذاکرات کی دعوت دی۔ علامہ مفتی جعفر حسین کی زیر قیادت پانچ
رکنی وفد مذاکرات کیلئے "پریذیڈنٹ ہاؤس" پہنچا۔ ایک مرحلہ پر جب اس اعلیٰ وفد کی
تاخیر ہوئی تو قوم میں یہ تاثر ابھرا کہ شاید قائدین اغواء یا محصور کر لیئے گئے ہیں تو ان
سنگین لمحات میں سفیر انقلاب اور ان کے رفقاء نے حکومت کو وارننگ دی کہ

"اگر ان کے قائدین کو ایک گھنٹہ کے اندر اجتماع میں نہ لایا گیا تو وہ مرکزی
سیکرٹریٹ پر حملہ کر دیں گے"۔ سفیر انقلاب کے اس اعلان سے حکومت اس قدر
لرزاں ہوئی کہ انہیں تحریک کے قائدین کو فی الفور عوام میں لانا پڑا۔

٦ جولائی کے مذاکرات کی کامیابی کے بعد علامہ مفتی جعفر حسین نے قوم کو
مبارکباد دی اور انہیں "معاہدہ اسلام آباد" کے بارے میں بتایا کہ "آج کے بعد
حکمران ہماری فقہ پر کسی دوسری فقہ کو مسلط نہیں کریں گے اور ہر موقع پر فقہ جعفریہ
کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔"

اس عظیم فتح کے بعد سفیر انقلاب جب اسلام آباد سے لاہور کیلئے عازم سفر
ہوئے تو راستے میں احباب سے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ احباب نے ان کی جرات
کو خراج تحسین پیش کیا تو انہوں نے اپنے ضعیف قائد کی عظمت اور احباب کے ا
کو سراہا۔ اس سفر میں آپ نے دیگر زاویوں کے علاوہ تین نکات پر روشنی ڈالی۔

١۔ یہ کہ سیکرٹیریٹ کے گھیراؤ کے مناظر کو زیر بحث لایا اور پاڑا چنار کے مجاہد
عالم دین علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شخصیت اور جرات کی مدحت کی۔

٢۔ اس کنونشن میں ابھرے ہوئے قوم کے بین الاقوامی تشخص اور معیار
برقرار رکھنے کی مستقل منصوبہ بندی کی خواہش کا اظہار فرمایا۔

٣۔ آپ نے احباب پر واضح کیا کہ ضیاء الحق فطرتاً" ایک کینہ پرور انسان
اور وہ شیعہ قوم سے اپنی اس شکست کا انتقام ضرور لے گا۔ چونکہ "لڑاؤ
حکومت کرو" اس کی سرشت میں ہے لہٰذا وہ ہمارے مقابلہ میں ایک متشدد گ

تشکیل دے گا جو ہم سے ٹکر لیکر ہمارے تحرک کو محدود اور ہماری فکر کو مجروح کرنے کی بھرپور کوشش کرے گا۔

آخر وہی ہوا جو آپ کی دور اندیش نظروں نے دیکھا۔ علامہ سید عارف حسین الحسینی قائد بنے، قوم کے معیار اور تشخص نے بین الاقوامی سطح کو چھوا اور ضیاء الحق نے مذہبی متشدد گروہ تشکیل دے کر ملت جعفریہ پر ضرب لگانے کی کوشش کی۔

معاہدہ اسلام آباد کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے احباب کے ایک وفد کیساتھ علامہ مفتی جعفر حسین کی رہائش گاہ واقع گوجرانوالہ گئے جہاں ا سے مستقبل کی مستقل منصوبہ بندی کے بارے میں مفصل بات چیت کی۔ آپ کا مؤقف تھا کہ "تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان" کے دائرہ کار کو بڑھا کر عوام کو اعتماد میں لایا جائے تاکہ وہ کسی بھی مرحلہ پر ظالم حکومت کا مقابلہ کرسکیں چونکہ مفتی صاحب تحریک کو ایک ملکی جماعت بنانے میں برق رفتاری کے قائل نہ تھے وہ چاہتے تھے کہ حکومت کی کروٹوں کے مطابق تحریک کو استوار کیا جانا چاہیے۔ انہیں یقین تھا کہ ضیاء الحق بہت جلد اسلامی رٹ کو بھول جائے گا اور وہ ایک مقام پر آکر اسلامی نظام کے نفاذ سے انحراف کا مرتکب ہوگا۔

تنظیمی نوجوانوں کا اصرار تھا کہ قائد ملت جعفریہ ملک گیر دورہ جات کرکے عوام سے رابطہ مہم کا آغاز فرمائیں اور انہیں تحریک کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کریں۔ چنانچہ علماء کرام اور عمائدین قوم سے مشورہ کے بعد مفتی صاحب نے دورہ جات کا سلسلہ شروع کیا جسے کامیاب بنانے میں آئی۔ ایس۔ او پاکستان نے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ مفتی صاحب جہاں بھی جانے کا ارادہ کرتے اس کی اطلاع ڈاکٹر محمد علی نقوی کو دیتے اور ڈاکٹر صاحب آئی۔ ایس۔ او کے پلیٹ فارم سے متعلقہ ڈویژن اور ضلع کو قائد کی آمد کی اطلاع پہنچا دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ قائد ملت جعفریہ جہاں تشریف لے جاتے ان کا والہانہ استقبال ہوتا اور عوام کے جم غفیر سے انہیں بات کرنے اور ان تک اپنا پیغام پہنچانے کا موقع میسر آتا۔

مفتی صاحب ابھی تحریک کا تنظیمی ڈھانچہ اور جماعتی بنیادیں استوار کر ہی رہے تھے کہ دست قضا نے ان کی زندگی کا رخ موڑ دیا اور وہ ۲۹ اگست ۱۹۸۳ء کو سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

حضرت علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم نے اپنی سوا چار سالہ قیادت میں اپنی بیماری اور ضعیف العمری کو بالائے طاق رکھ کر بے پناہ قومی خدمت کی۔ علم و حلم کا یہ بیکراں سمندر اپنی موجوں سے قوم کی کشتی کو کنارا عطا کرگیا .... وہ کسی مقام پر مصلحت کا شکار ہوئے نہ کسی مرحلہ پر ظلم کی طرفداری کی .... وہ پیر سالی میں بھی چٹانوں کی طرح آمریت کے سامنے سینہ سپر رہے اور قومی مفادات کو جان سے عزیز تر سمجھا .... وہ زندگی کی جوان سانسوں سے روح کی تھرتھراتی منزل تک حکومت کے متعصبانہ اقدامات سے برسر پیکار رہے۔ اسلئے

اس حسن پاکباز کی آتی ہے اب بھی یاد
نور سحر کے ساتھ کبھی چاندنی کے ساتھ

تحریک نفاذ جعفریہ پاکستان کی ناؤ کے پہلے ناخدا اس دار فانی سے رخصت ہو تو تاک میں بیٹھے ہوئے مخالفین کو مسند سنبھالنے کا موقع مل گیا۔

چنانچہ تحریک کے دستور کی پرواہ کئے بغیر اپنوں نے غیر دستوری قائد کی تاج پوشی ک دی اور راولپنڈی کی "علی مسجد" میں مولانا حامد علی موسوی کی دست بوسی کا سلس شروع ہوگیا۔

جب یہ خبر ڈاکٹر محمد علی نقوی تک پہنچی تو آپ نے احباب کو اکٹھا کیا اور فرمای

اٹھو ! وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اس موقع پر آپ نے واضح کیا کہ عیار حکمران نے ۱۹۸۰ء کی شکست کا انتقام لینے کی ٹھان لی ہے کیونکہ جعلی قیادت کے گرد فوجی جرنیلوں اور خفیہ اداروں کے افسران کا جھرمٹ اس امر کی دلیل ہے۔ آپ نے احباب پر زور دیا کہ موجودہ صورتحال میں انہیں پہلے سے کہیں زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

دستوری قیادت کے انتخاب کیلئے تحریک کے دستور کے تشنہ مراحل زیر تکمیل تھے کہ آپ سے آئی۔ ایس۔ او کے مرکزی برادران نے قیادت کے بارے میں استفسار کیا کہ موجودہ حالات میں کونسی شخصیت موزوں ہے ......؟ احباب کے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا "میری نظر میں پاڑا چنار کے جوان عالم دین سید عارف حسین الحسینی ان حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے نہایت موزوں ہیں۔ آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایران کے اسلامی انقلاب سے ہم آہنگ ہیں' روحانی سطح پر بھی وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے اور علاقائی حوالے سے وہ نہایت دلیر شخصیت ہیں۔"

۱۰ فروری ۱۹۸۴ء کو جب بھکر میں علامہ مفتی جعفر حسین کے جانشین کے انتخاب کیلئے اجلاس کا اعلان ہوا تو سفیر انقلاب ایک روز پہلے وہاں پہنچے اور عمائدین سے صلاح مشورے کرتے رہے۔ آپ وہاں پر ہونے والے فیصلہ جات اور اجلاس کی کاروائی سے مسلسل لاہور کے احباب کو آگاہ کرتے رہے اور ایک لمحہ وہ بھی آیا جب آپ کی حسرت عملی صورت میں سامنے آئی یعنی علامہ سید عارف حسین الحسینی قائد ملت جعفریہ منتخب ہوگئے۔

سفیر انقلاب قائد کا اعلان سنتے ہی لاہور روانہ ہوئے اور ان کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگئے کیونکہ دوسرے روز قائد نے لاہور پہنچنا تھا۔ ۱۱ فروری کو "سفیر نور" علامہ سید عارف حسین الحسینی کربلا گامے شاہ لاہور پہنچے تو "سفیر انقلاب" ڈاکٹر محمد علی نقوی نے احباب اور عوام کے ساتھ آپ کا والہانہ استقبال کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب "سفیر انقلاب" نے "سفیر نور" کی دست بوسی کی۔

جب علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ "جامعۃ المنتظر" پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے چند معتمد احباب کے ساتھ ان سے نشست کی۔ جب قائد ملت جعفریہ کو افتخار ملت جعفریہ کا تعارف کرایا گیا تو انہوں نے فرمایا "ڈاکٹر صاحب کو کون

نہیں جانتا۔؟" مختصر ملاقات کے بعد جب ڈاکٹر صاحب احباب کے ساتھ گھر کو واپس لوٹے تو فرمانے لگے "اس شخص کے لہجہ کا درد اور پیشانی کا نور شہید بہشتی اور شہید مطہری جیسا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں بھی ہمیں ایک روحانی قائد نصیب ہوا ہے"۔

آپ نے اپنے ان احساسات و جذبات کا اظہار "مدرسہ آیت الحکیم راولپنڈی" میں بھی قائد کے روبرو کیا تھا کہ "ہم آپ کو شہید بہشتی اور شہید مطہری کی حیثیت سے دیکھتے ہیں" آپ کے یہ جملے سن کر قائد ملت جعفریہ کی آنکھیں چھلک گئی تھیں۔ اگرچہ قائد نے اس وقت آپ کے لیئے کوئی جملہ ادا نہ فرمایا تھا مگر یقیناً" ان کے روح کی آواز یہی ہوگی کہ "ڈاکٹر صاحب ہم بھی آپ کو ڈاکٹر مصطفیٰ چمران کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔"

چونکہ سفیر نور اور سفیر انقلاب مزاجا" ہم آہنگ تھے اور ان حضرات کی فکر کے زاویے بھی تقریبا" ایک جیسے تھے اس لئے شروع ہی سے ان کے دل ایک ساتھ دھڑکنا شروع ہوگئے اور یوں یک جان دو قالب کی عملی تصویر سامنے آئی۔

ابتدائی ایام میں سب سے بڑا مسئلہ حقیقی قیادت کے تعارف کا تھا جو خاصا مشکل اور محنت طلب تھا۔ کیونکہ عوام کے سامنے ایک قیادت کا اعلان ہوچکا تھا اور مجالس عزا میں معروف مقررین اس کا تعارف کراچکے تھے۔ چونکہ اس وقت علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت سے مربوط علماء کرام کی گرفت مخالف گروہ سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے عوام کو حقائق سے آگاہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری آئی۔ ایس۔ او پاکستان اور آئی۔ او پاکستان کے دوش پر ٹھہری اور کچھ عرصہ بعد مدارس دینیہ کے طلباء کی تنظیم "جمعیت طلبہ جعفریہ" نے بھی خاصی معاونت کی۔

آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے لاہور میں تحریک کے صوبائی دفتر کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور خاصی تگ و دو کے بعد "دیو سماج روڈ" لاہور پر ایک عمارت خرید لی۔ اس عمارت کی قیمت ادا کرنے کیلئے مخیر حضرات کے علاوہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے ہر یونٹ نے چندہ دیا اور اس عمارت کو "امامیہ سنٹر" کا نام دیا گیا۔

امامیہ سنٹر میں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ، امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان اور امامیہ آرگنائزیشن پاکستان کے مرکزی دفاتر قائم ہوئے اور یہاں پر ہونے والے تمام امور کی سرپرستی ڈاکٹر صاحب نے فرمائی۔

جب یہ سنٹر عوامی رابطوں کا مرکز بنا تو اس وقت ڈاکٹر صاحب کی ملازمت ضلع شیخوپورہ میں تھی۔ آپ روزانہ گھر سے اسپتال جاتے اور واپسی پر سیدھا "امامیہ سنٹر" آتے اور رات گئے تک دفتری امور کا جائزہ لیتے۔ دفتر کی صفائی اور عملہ کی عوام سے ملنساری پر خصوصی توجہ دیتے۔ بسااوقات یہاں ایسا بھی ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب تھکے ہارے ملازمت سے آتے تو دفتر میں پڑے ہوئے برتن دھوتے، اور دفتر میں جھاڑو تک دیتے۔ اس کتاب کے سلسلہ میں لیئے گئے انٹرویوز کے دوران میں میرے سامنے بیسیوں احباب نے روایت کی ہے کہ انہوں نے کئی بار ڈاکٹر صاحب کو اس دفتر کی نالیاں تک صاف کرتے دیکھا ہے۔ جب کبھی آپ سے ایسا نہ کرنے کو کہا جاتا تو آپ فرماتے "اگر میرے امام اول حضرت علی علیہ السلام یہودی کے باغ کی نالی صاف کرسکتے ہیں تو میں ان کا حقیر سا غلام امام زمانہ علیہ السلام کے دفتر کی نالی صاف کیوں نہیں کرسکتا......؟"

امامیہ سنٹر کے قیام کے بعد عیدالقربان کے موقع پر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ لاہور نے قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کی مہم چلائی۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب دفتر میں فون پر تمام حامی مومنین سے رابطہ میں مصروف تھے اور چند احباب کھالیں اکٹھی کر رہے تھے۔

چونکہ افراد کی کمی تھی اس لئے اگر کسی گھر سے کھال لے جانے کا فون آتا تو ڈاکٹر صاحب خود موٹر سائیکل پر سوار ہوتے اور کھال لے آتے۔ شام تک کھالیں اکٹھی ہوتی رہیں تو گرمی کے باعث ان سے بو پھیلنے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں پر موجود دو نوجوانوں سے کہا "عزیز دوستو! یہ کھالیں مال امام ہیں لہٰذا ان کی حفاظت ہمارا فریضہ ہے دوکان سے نمک لائیں تاکہ انہیں لگایا جائے۔ نمک لایا گیا تو دونوں دوست پریشان ہوئے کہ آخر نمک کون لگائے گا...؟ ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی شرٹ کی آستین چڑھائیں اور کھالوں پر نمک لگانا شروع کر دیا۔ آپ کو دیکھ کر دوسرے احباب

بھی معاون ہوئے اور یوں کئی گھنٹوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ احباب کے بقول اگر اس دوران میں کوئی فون آجاتا اور لوگ ڈاکٹر صاحب سے پوچھتے کہ حضور آپ عید کے روز دفتر میں کیا کر رہے ہیں تو آپ جواباً" فرماتے "نکما بیٹھا ہوں"

آپ کی عجز و انکساری اور قومی تنظیم سے محبت کے انداز کو دیکھ کر ان افراد میں بھی کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوا جو کام کرنے کو عار محسوس کرتے تھے۔

ابتدائی ایام میں تحریک کا دفتر مالی مسائل کا شکار تھا جبکہ عوام دور دراز علاقوں سے رابطوں کیلئے آتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی کے اخراجات کسی حد تک ڈاکٹر صاحب اپنی تنخواہ سے پورے کرتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ آپ دیر تک دفتر میں کام کرتے رہتے اور رات کو یہاں سو جاتے اور صبح سویرے یہیں سے ملازمت کیلئے نکل جاتے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ آپ رات کو دفتر میں سوئے ہوئے ہوتے تھے کہ مہمان آجاتے آپ اوڑھنا بچھونا ان کے حوالے کرتے اور خود میز یا کرسیوں کو ملا کر سو جاتے اگر میز کرسیاں بھی خالی میسر نہ آتیں تو آپ صحن میں پڑی ہوئی نماز کی صف کو نیچے بچھا کر سر کے نیچے اینٹیں رکھ لیتے اور یوں آپ کی رات بسر ہو جاتی۔

ایک مرتبہ تحریک کے کارکنان نے آپ سے شکوہ کیا کہ تحریک ملکی سطح کی جماعت ہے جبکہ اس کے دفتر میں سونے کیلئے گدے اور سرہانے تک میسر نہیں۔ آپ نے احباب کی بات سنی اور ٹھنڈی آہ لے کر فرمایا۔ "آپ کو کیا معلوم کہ ملت اسلامیہ کے قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی کے دفتر کی کیا حالت ہے اور وہ دو ملازمین کے درمیان بوسیدہ گدے اور پھٹے پرانے سرہانے پر کیسے سوتے ہیں؟"

یہ وہ ایام تھے حب تحریک جعفریہ کی مالی حالت بہت کمزور تھی یہاں تک کہ تحریک کے صوبائی دفتر کے اخراجات تک پورے نہیں ہوتے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب ہی کی محنتوں سے دفتر کا بھرم رہتا تھا۔ ان حالات میں آپ نے لاہور شہر کے مومنین کے گھروں میں سینکڑوں صندوقچیاں بنوا کر رکھ دیں اور مومنین سے گزارش کی کہ وہ اپنی نذر نیاز' صدقات اور امام ضامن کی رقم وغیرہ ان میں ڈالیں۔ آپ ایک کارکن کے ذریعہ ماہوار ان صندوقچیوں کو اٹھواتے اور ان میں سے مومنین کی نیاز حاصل کرتے جس سے کسی حد تک دفتر کے اخراجات پورے ہو جاتے۔

ان ایام میں آپ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے مرکزی دفتر کے امور کی نگرانی بھی کرتے اور تحریک کے دفتر میں بحیثیت کارکن خود بھی مصروف کار رہتے۔ آپ نے نوجوانوں پر واضح کیا کہ "حالات اسی بات کے متقاضی ہیں کہ قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شخصیت اور قیادت کا تعارف ملک کے گوشہ گوشہ میں کرایا جائے اور ان کے دورہ جات کو حتی الامکان کامیاب بنایا جائے"۔

قائد ملت اسلامیہ کے تعارفی پوسٹر لاہور سے شائع ہوئے تو سفیر انقلاب نے لاہور کے در و دیوار پر یہ پوسٹر اپنے ہاتھوں سے چسپاں کئے۔ تحریک کے پروگرام کی تشہیر کیلئے آپ نے سینکڑوں بار دیواروں پر لکھائی کی، پوسٹر لگائے اور ویگنوں پر نعرے لکھے۔ آپ کے جذبہ کو دیکھ کر تھکے ہارے نوجوانوں کی بیٹری چارج ہوتی اور وہ رات بھر کام کرتے رہتے۔

سفیر انقلاب دفتر میں بیٹھے ہوتے تو کسی علاقہ کا کوئی شخص بھی جونہی دفتر میں آتا آپ سب سے پہلے اس سے علاقہ میں قیادت کے بارے رجحانات کا استفسار کرتے اور جب وہ جانے لگتا تو آپ اسے قائد کی تصاویر اور تعارفی لٹریچر تھما دیتے اور قیادت کے پرچار کی تاکید فرماتے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۸۵ء میں مجھے کسی تنظیمی کام کے سلسلہ میں لاہور آنا پڑا چونکہ میں اس وقت گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان میں زیر تعلیم تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے ڈیرہ اسماعیل خان کے عوام کی قائد سے وابستگی کے بارے میں سوالات کئے۔ جب میں نے مثبت صورتحال واضح کی تو فرمانے لگے۔ "جہاں علامہ غلام حسن جاڑا صاحب جیسی مقتدر اور بزرگ شخصیت موجود ہو۔ وہاں ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مزید برآں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہمیں قیادت کے پرچار کیلئے ان علاقوں میں مشکلات کا سامنا ہے جہاں دینی مدارس نہیں ہیں۔ جہاں علماء حقہ کا عوام سے رابطہ کمزور ہے اور جہاں تنظیمی فکر کا فقدان ہے۔ تاہم ہمارے نوجوان برق رفتاری سے مصروف جہاد ہیں اور انشاء اللہ بہت جلد ہم اپنی قیادت کو ملت اسلامیہ کی واحد نمائندہ قیادت کے طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ آپ نے اس موقع پر جو پر اعتماد گفتگو کی وہ علامہ محمد اقبالؒ کے اس شعر کی عکاس تھی۔

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسہ اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

☆☆☆☆☆

قیادت کے تعارف کا پہلا نشرو اشاعتی مرحلہ لاہور سے شروع ہوا جس کی سرپرستی سفیر انقلاب نے فرمائی۔ پشاور سے اخوند زادگان نے علامہ سید عارف حسین الحسینی کا مختصر تعارف اور تصویر شائع کروائی جبکہ پاکستان بھر میں منظّم ترویج کیلئے ڈاکٹر صاحب نے تصاویر' تعارف' ماہنامہ راہ عمل اور ہفت روزہ رضاکار کے خصوصی ایڈیشن شائع کرائے۔

آپ نے علامہ سید صفدر حسین نجفی و دیگر علماء کرام سے رابطہ کرکے انہیں قیادت کا بھرپور تعارف کرانے اور عوام کو مائل کرنے کی اپیل کی اور ساتھ ہی ان سے ملک بھر کے خطباء مساجد کو تاکیدی خطوط لکھوائے تاکہ وہ جمعہ اور دیگر اجتماعات میں حقیقی قیادت کو متعارف کرائیں۔

دوسری جانب آپ نے اپنی نظریاتی قوت امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان کو خبردار کیا کہ وہ اپنی دیگر مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر قیادت کے تعارف کیلئے اپنی توانیاں صرف کریں اور وہ شہروں سے نکل کر دیہاتوں تک علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم کے جانشین کا تعارف کرائیں' ان کی تصاویر پہنچائیں اور عوام کو حقیقت حال سے آگاہ کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے معتمد احباب کے کچھ گروپ تشکیل دیئے۔ جنہیں چھ ماہ کے اندر "دو قیادتوں کے وجود اور عوامی رجحانات" کی جامع رپورٹ پیش کرنے کی تاکید کی۔ جب ملک بھر کی صورتحال آئینہ کی طرح آپ کے سامنے آئی تو آپ نے وہاں کے تقاضوں کے مطابق منصوبہ بندی کی اور آخر کار کامیابی کے پرچم گاڑھے۔

اپریل ۱۹۸۴ کو پشاور میں علامہ سید عارف حسین نے اپنی کابینہ کا انتخاب کیا تو ڈاکٹر صاحب کو ان کی خداداد صلاحیتوں اور رجحانات کے باعث نشرواشاعت کی اہم مسئولیت کیلئے منتخب کیا گیا۔

جب آپ نے پاکستان میں علماء کرام اور تنظیمی برادران کے ذریعہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرلی تو آپ کو خیال آیا کہ اگر ایران کے جید علماء کرام علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت کی تائید فرما دیں۔ تو مخالفین کے پروپیگنڈہ کا پانسہ پلٹ جائے گا۔

یہ وہ دور تھا جب امام خمینیؒ دنیا بھر میں اپنے نمائندگان مقرر فرما رہے تھے جن کے ذریعہ وہ انقلاب اسلامی کا پیغام عوام تک پہنچانے کے خواہاں تھے۔ جب ڈاکٹر صاحب کی یہ فکر ایران میں زیر تعلیم طلباء تک پہنچی تو انہوں نے اس سے کسب فیض کیا اور اس کیلئے سب سے زیادہ جدوجہد علامہ سید محمد جواد ہادی نے کی۔ ادھر پاکستان میں جب قیادتوں کے تعارف کا ٹکراؤ عروج پر پہنچا تو ولی فقیہہ امام خمینی کی طرف سے علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ کیلئے نمائندہ ولی فقیہہ کی تائیدی سند پاکستان پہنچ گئی۔ جس کی اشاعت کے بعد مخالف گروپ کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور مخالفین جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔

علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ کو نمائندہ ولی فقیہہ کی سند ملنے پر ڈاکٹر صاحب کو روحانی تسکین پہنچی اور آپ نے تنظیمی اجتماعات میں اس بات پر زور دیا کہ برادران قائد ملت اسلامیہ کو نمائندہ ولی فقیہہ کی حیثیت سے متعارف کرائیں۔

آپ نے کئی بار خود بھی اسی بات کا اظہار فرمایا کہ علامہ عارف حسین الحسینیؒ کی ذات ان کیلئے بے حد محترم ہے کہ وہ ملت جعفریہ پاکستان کے سربراہ ہیں اور ان کی ہر بات اس لئے حجت بھی ہے کہ وہ نائب امام ولی فقیہہ حضرت امام خمینیؒ کے نمائندہ ہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ نمائندہ ولی فقیہہ کی حمایت ولی فقیہہ کی حمایت ہے اور ولی فقیہہ کی حمایت امام زمان علیہ السلام کی حمایت ہے۔

جب علماء کرام اور تنظیمی برادران کی محنت کے طفیل قائد ملت اسلامیہ کا تعارف عوام تک پہنچ گیا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے چند اہم احباب کے ساتھ قائد عظیم

الشان سے ملکی دورہ جات کی گزارش کی۔ باہمی صلاح مشورہ کے بعد قائد نے آمادگی کا اظہار فرمایا مگر بات دورہ جات کی کامیابی پر مشروط ٹھہری۔ چنانچہ تبلیغاتی امور علمائے کرام نے سنبھالے جبکہ انتظامی امور کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب نے قبول کی۔ اس سلسلہ میں سفیر انقلاب نے دن رات محنت کرکے دورہ جات کا شیڈول تیار کیا اور ہر علاقہ کی صورتحال کے مطابق منصوبہ بندی کی۔ بعض اہم مقامات پر آپ قائد کے دورہ جات سے قبل تشریف لے گئے وہاں کے باا‌ثر لوگوں سے ملے اور انتظامات کا جائزہ لیا۔

آپ نے تحریک جعفریہ اور اس کی قیادت کو مضبوط کرنے کیلئے اتنے طویل اور کٹھن سفر کیئے جنہیں سوچ کر حواس جواب دینے لگتے ہیں۔ آپ کی ان مسافتوں کے ھسفر احباب آج بھی گواہ ہیں کہ آپ کے پاس ایک سفری بستر (Sleeping Bag) ہوتا تھا۔ جسے آپ سر کے نیچے رکھ کر آرام کرلیتے اور سردی کی شدت میں اس میں لپٹ کر ٹرین کے فرش اور اسٹیشنوں کے فٹ پاتھ پر بھی سو جاتے۔

ملک بھر میں قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی کے دورہ جات کی بے پناہ کامیابی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کئی بار برادران کے سامنے اظہار فرمایا کہ "انقلاب اسلامی ایران امام خمینی اور قائد حسینیؒ کے پرچار میں تنظیم آئی۔ ایس۔ او پاکستان کا گہرا عمل دخل ہے" چونکہ آپ ذہنی طور پر تنظیم کے حق میں تھے اس لئے آپ نے محسوس کیا کہ طلباء کے علاوہ بھی ملت کی دیگر تنظیمیں وجود میں آئیں اور اس طرح وہ بھی اپنے پلیٹ فارمز سے متحرک ہوں۔ چنانچہ آپ نے ملک گیر تنظیم سازی کی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں امامیہ ڈاکٹرز، امامیہ انجینئرز، امامیہ وکلاء، امامیہ ٹیچرز، امامیہ ایمپلائز ویلفیئر آرگنائزیشن اور امامیہ کسان جیسے پلیٹ فارمز تشکیل پائے اور مثبت نتائج دیئے۔ کچھ عرصہ بعد حالات کے پیش نظر امامیہ کو "اسلامک" میں تبدیل کردیا گیا اور آج کل اسلامک ایمپلائز ویلفیئر آرگنائزیشن متحرک اور فعال ہے۔

جس طرح آئی۔ ایس۔ او کی بنیاد رکھتے وقت آپ کا نظریہ تھا کہ ملک بھر میں مختلف پلیٹ فارمز پر کام کرنے والے امامیہ طلباء ایک مرکزی پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور ان کا تشخص ایک جماعت کے حوالے سے ہو اسی طرح تحریک جعفریہ کے قیام

کے بعد آپ کی خواہش تھی کہ تمام ملی تنظیمیں تحریک میں ضم ہو جائیں اور ملک بھر میں ایک تشخص کیساتھ مضبوطی سے کام کریں۔

☆☆☆☆☆

آئی۔ او سے اختلاف

ملت جعفریہ کی ملک گیر تنظیم امامیہ آرگنائزیشن پاکستان (آئی۔ او پاک) سے آپ کے اختلافات کی اہم وجہ بھی یہی تھی کہ وہ تحریک جعفریہ سے علیحدہ تشخص کے ساتھ کام کرنے کے خواہاں تھی۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب ایک وقت میں قومی سطح کے ایک پلیٹ فارم کے قائل تھے۔

چونکہ امامیہ آرگنائزیشن پاکستان ملت جعفریہ کی تاریخ کا ایک معتبر باب ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ طائرانہ نظر میں اس کا جائزہ لیا جائے تاکہ اس عنوان کو رقم کرنے اور بعد میں اس سے اختلاف کرنے میں سفیر انقلاب کا کردار واضح ہو۔

مئی ۱۹۷۲ء کو امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور یہ کارواں یقین محکم اور عمل پیہم کیساتھ منزل کی جانب رواں ہوا۔ دو سال کے مختصر عرصہ میں اس قافلہ میں اضافہ بھی ہوا اور اس سے چند سالار بھی بچھڑے۔ چونکہ اس الٰہی تنظیم کا نصب العین "تعلیمات قرآن اور سیرت حضرت محمد و آل محمد علیہم السلام کے مطابق نوجوان نسل کی زندگی استوار کرنا اور انہیں عہد حاضر کی تاریکیوں، فتنہ پردازیوں اور چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا تاکہ وہ اچھے انسان اور مومن بن کر دین مبین کی سربلندی اور اپنی اخروی نجات کا سامان فراہم کر سکیں" تھا، اس لئے ابتدائی سالوں میں محسوس کیا گیا کہ جو برادران تربیت حاصل کر کے تعلیم سے فارغ ہوکر معاشرہ میں جا رہے ہیں یہ ان کی ذمہ داری میں شامل ہے کہ وہ جہاں معاشرہ میں خود ایک حقیقی مومن ہوں وہاں اپنی تنظیم آئی۔ ایس۔ او کے برادران کو روحانی، فکری اور مالی تعاون بھی فراہم کریں۔ چنانچہ اس نظریہ کے تحت دسمبر ۱۹۷۴ء کو "امامیہ آرگنائزیشن پاکستان" کی بنیاد رکھی گئی اور آئی۔ او، آئی۔ ایس۔ او کی "Parent Organization" کہلائی۔

سفیر انقلاب ۷۷-۱۹۷۶ء میں آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے مرکزی صدر بنے آپ جونہی تعلیم اور تنظیم کی مسئولیت سے فارغ ہوئے مرحلہ وار آگے بڑھے اور ۱۹۷۸ء میں باقاعدہ طور پر آئی۔ او پاکستان کے رکن بن گئے۔ آپ ۱۹۸۴ء تک آئی۔ او سے مربوط رہے اور اسی دوران میں وہ تمام تر امور بااحسن انجام دیتے رہے جن کی

تکمیل کیلئے آئی۔ او کا قیام عمل میں آیا تھا۔

ایک مرحلہ پر آپ نے محسوس کیا کہ آئی۔ او اپنے تنظیمی دائروں کو وسعت دے رہی ہے اور ان اہداف سے انحراف کر رہی ہے جو اس کی خشت اول میں شامل تھے چنانچہ آپ نے خاصی بحث و تمحیص کے بعد آئی۔ او کو خیرباد کہا۔

آئی۔ او سے آپ کے اعلان لاتعلقی نے تنظیمی حلقوں میں بھونچال برپا کیا اور کئی سالوں تک اس حساس مسئلہ پر گفتگو ہوتی رہی۔ آپ نے اس نازک موڑ پر اپنی ذات کو تحریک جعفریہ کیلئے وقف کر دیا جبکہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی سرپرستی کیلئے آئی۔ ایس۔ او کے سابق ممبران پر مبنی "امامینز" (Imamians) نام کی ایک نئی تنظیم کی بنیاد رکھی۔

۱۹۸۹ء میں پہلی بار مجھے ماہنامہ العارف کیلئے ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کرنے کا موقع ملا تو میں نے آئی۔ او کے بارے ان سے کھل کر سوالات کئے۔ یہاں تک کہ ہماری گفتگو مناظرانہ رنگ اختیار کر گئی۔

☆ آپ نے آئی۔ او سے اعلان بیزاری کیوں کیا؟۔

○ جب تک آئی۔ او اپنے بنیادی اغراض و مقاصد (آئی۔ ایس۔ او کی سرپرستی) سے انصاف کرتی رہی میں اس سے مربوط رہا اور جب میں نے محسوس کیا کہ اس میں غیر تنظیمی افراد داخل ہو رہے ہیں اور تنظیم کے اغراض و مقاصد میں نمایاں تبدیلی آئی ہے تو میں نے اسے چھوڑنا بہتر سمجھا ہے۔

☆ آئی۔ او اگر معاشرہ میں ملت کے افراد کو فعال کرتی ہے اور قومی طاقت کے طور پر منظر عام پر آکر اسلامی معاشرہ کا قیام عمل میں لاتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟۔

○ اس مقصد کیلئے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان موجود ہے۔

☆ "کیا امامینز آئی او کا نعم البدل ہے۔"

○ امامینز (Imamians) آئی۔ او کا نعم البدل نہیں بلکہ آئی۔ او کے بنیادی اہداف کا نعم البدل ہے۔

☆ کیا "آپ امامینز اور آئی۔ او کا ٹکراؤ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

○ ایسا ہرگز نہیں اگر آج بھی آئی۔ او اپنے دستور میں یہ جملہ شامل کردے کہ اس تنظیم میں کوئی غیر آئی۔ ایس۔ او شامل نہیں ہوگا ہم آج امامیز کے خاتمہ کا اعلان کرتے ہیں۔

☆ بعض حلقوں کی طرف سے یہ تاثر پیش کیا جاتا ہے کہ ملت جعفریہ کے بعض تعلیم یافتہ لوگ تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان میں علماء کرام کے زیر اثر کام کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہیں جبکہ وہ آئی۔ او کے پلیٹ فارم پر متحد ہیں اور اس طرح سے وہ قومی قوت میں اضافہ کا باعث ہیں۔

○ اگر کچھ لوگ علماء کرام کے ماحول میں کام کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا شکار ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ علیحدہ تنظیمیں، دستور، ڈھانچے اور قیادتیں منظر عام پر نہ لائیں بلکہ تحریک کے دائرہ میں داخل ہوکر اسے وسعت بخشیں اور ایسا ماحول پیدا کریں جو ہر فرد کیلئے قابل قبول ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ متحرک تنظیموں میں اختلاف رائے ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ مثبت اور تعمیری اختلاف تنظیموں کا حسن ٹھہرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب آئی۔ او کے اہم رہنماؤں کے کردار، اخلاق اور خلوص کو سراہا کرتے تھے اور جہاں نظریاتی سطح پر انہیں اختلاف ہوتا تھا برملا اظہار بھی فرماتے تھے۔ ایک مرحلہ پر انہوں نے آئی۔ او سے بھرپور اختلاف کیا مگر زندگی کے آخری ایام میں آئی۔ او کے دو سابق چیئرمین جناب احمد رضا خان اور جناب افسر حسین خان سے پے در پے ملاقاتیں کرکے اختلافات کی خلیج کو ختم کیا اور ماضی کی چند تلخیوں کو یکسر فراموش کرکے تنظیموں کو یک جان کرنے کی نتیجہ خیز کوشش کی۔

برادر افسر حسین خان کے بقول کہ ڈاکٹر صاحب کے آئی۔ او سے اختلافات جزوی تھے صرف انہیں طریقہ کار سے اختلاف ہوتا تھا وہ امام خمینی اور شہید حسینی کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہتے تھے جبکہ آئی۔ او کے دیگر رہنما پس جبہ ارکان کی تربیت کرنے کے خواہاں تھے شاید وہ سرکاری ملازمتوں وغیرہ کے حوالہ سے ایسا کرنے کے قابل نہ تھے۔ بعض احباب کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو آئی۔ او کی روایتی شیعیت سے بھی اختلاف تھا جبکہ آپ نظریاتی اور انقلابی شیعیت کے حق میں تھے۔ آئی۔ او

کے رہنما گردوپیش کے نتائج کو سامنے رکھ کر منصوبہ بندی کرتے تھے جبکہ ڈاکٹر صاحب اپنے اسلامی ہدف کے حصول کیلئے گردوپیش کے حالات سے بے نیاز ہو کر مسائل میں کود پڑتے تھے اور علامہ اقبال کی فکر کی تفسیر بن جاتے تھے کہ

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

☆....☆....☆....☆....☆

چونکہ آپ کی تحریک اور قیادت سے وابستگی شعوری تھی اس لئے آپ اپنے نظریہ میں نہایت واضح تھے۔ آپ نے تحریک جعفریہ سے یہاں تک وفا کی کہ آپ کو بعض علماء کرام سے شدید اختلاف کرنا پڑا۔ جن ایام میں علامہ سید عارف الحسینی شہید کی قیادت عروج پر تھی ان دنوں وفاق علماء شیعہ کے پلیٹ فارم سے خاصا تحرک دکھائی دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب "تحریک" اور "وفاق" کے اختلافات کی بازگشت بہت دور تک سنائی دی۔

ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب اپنے قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی کے ہمراہ ملک کے ایک معروف دینی مدرسہ میں گئے تو وہاں پر موجود ایک عالم دین نے قائد کی شان میں نہایت سخت زبان استعمال کی۔ اس موقع پر تو ڈاکٹر صاحب اور ان کے چند رفقاء سب کچھ برداشت کر گئے مگر اس روز کے بعد آپ نے ان حضرات کی کھل کر مخالفت کی۔ ایک مرحلہ پر آپ نے احباب کی محفل میں فرمایا "کسی شخص کا لباس محترم نہیں ہوتا بلکہ اس کا نظریہ محترم ہوتا ہے۔"

آپ اپنے نظریہ میں نہایت واضح تھے اور کبھی بھی ابہام کا شکار نہیں ہوئے۔ ہمیشہ دلائل اور برہان سے بات کی اور اپنے نظریہ پر قائم رہے۔

سفیر انقلاب کی زندگی میں ایک نازک مرحلہ ایسا بھی آیا جب تحریک جعفریہ اور اس کی قیادت علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کے بارے میں ایک نکتہ پر آپ کو علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم سے معذرت کے ساتھ اختلاف کرنا پڑا۔ حالانکہ علامہ صفدر حسین صاحب کے بارے میں ڈاکٹر صاحب فرمایا کرتے تھے کہ "یہ وہ شخصیت ہیں جنہوں نے مجھے اپنے والدین اور دین کی پہچان کرائی ہے۔"

تاریخ آج بھی گواہی دیتی ہے کہ سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید نے "سفیر نور" علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کا کسی مرحلہ پر بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ بلکہ کربلا کے ان وفادار شہداء کی سیرت ادا کی کہ جو وقت شہادت ایک دوسرے کو امام حسینؑ کیطرف اشارے کرکے کہتے تھے "دشت کربلا میں فرزند زہراء کو تنہا نہ چھوڑنا۔"

قیادت کے ابتدائی ایام میں جب علامہ سید عارف حسین الحسینی نے حضرت امام خمینی کے فرمان کی تعمیل کرتے ہوئے "یوم القدس" منانے کا اعلان فرمایا اور خود مظاہرہ کی قیادت کیلئے لاہور تشریف لائے تو آپ نے لاہور کے تمام آئمہ مساجد اور مدارس جعفریہ کے علماء کرام سے رابطہ فرمایا اور ان سے اسرائیل و امریکہ کے خلاف بیت المقدس کی آزادی کیلئے مظاہرہ میں بھرپور شرکت کی استدعا کی۔ یہ وہ ایام تھے جب جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء نے عوام کے سروں پر خوف کی بھیانک چادر تان رکھی تھی اور اس کے جبر کی حبس سے عوام کی سانس گھٹ رہی تھی۔ جب لاہور کی انتظامیہ کو علامہ سید عارف حسین الحسینی کے مظاہرہ اور منصوبہ کا علم ہوا تو انہوں نے آئمہ مساجد اور کئی علماء کو ہراساں کرنا شروع کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مظاہرہ کے روز قیادت کو اپنوں کی طرف سے معذرت کے فون آنا شروع ہوگئے۔ جب اس صورتحال کا ڈاکٹر صاحب کو علم ہوا تو آپ نے لاہور کے تنظیمی احباب کو اکٹھا کیا اور فرمایا "دوستو آج فرزند زہراء' نمائندہ ولی فقیہہ قائد ملت جعفریہ ہمارے شہر لاہور میں شیطان بزرگ امریکہ اور اسکی ناجائز اولاد اسرائیل کے خلاف قبلہ اول کی آزادی کیلئے مظاہرہ کرنے تشریف لائے ہیں' آمر کے ایجنٹوں اور انتظامی مشینری نے خوف پھیلا کر ہمارے لوگوں کو مظاہرہ میں شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ کچھ اہم شخصیات دن کے اجالے میں قائد کا ساتھ دینے میں ٹال مٹول کر رہی ہیں جبکہ ان سے وہ لوگ اچھے تھے جنہوں نے رات کے اندھیرے میں فرزند زہراءؑ کو چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا آج وفا کی رسم نبھانے کا وقت آگیا ہے ہمیں ہر حال میں اپنے قائد کے گرد رہنا ہوگا ...... خدا نہ کرے اور یہ نوبت نہ آئے کہ ہمارے قائد کسی مشکل مرحلہ پر ہمیں دائیں بائیں تلاش کریں یا ان پر صدائے استغاثہ بلند کرنے

کی گھڑی آ پہنچے"

اس روز کا پر خوف منظر دیکھنے والے شاہد ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے محبوب قائد کے گرد پروانے کی طرح گھومتے رہے اور کئی مقامات پر پولیس کے دائرے توڑے۔ اس مظاہرہ کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب پولیس نے مظاہرین پر اپنی بندوقیں تان لیں مگر ایسے میں ڈاکٹر صاحب اپنے چند احباب کے ہمراہ قائد کے آگے آئے اور دفاعی دیوار کی صورت اختیار کر گئے۔

☆☆☆☆☆

سانحہ کوئٹہ اور سفیر انقلاب

۱۹۸۵ میں علامہ سید عارف حسین الحسینی نے فیصلہ کیا کہ وہ مفتی صاحب کے سفر کو ہر حالت میں جاری رکھیں گے اور اس سلسلہ میں حکومت کے ساتھ طے شدہ "معاہدہ اسلام آباد" پر عمل در آمد کیلئے حکومت وقت کو یادداشت پیش کریں گے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ ٦ جولائی کو ملت جعفریہ قومی دن کے طور پر منائے گی اور ہر صوبائی دارالحکومت میں اجتماعات کر کے حکومت سے وعدہ وفا کرنے کا مطالبہ کرے گی۔

اس فیصلہ کے تحت کراچی کے علاوہ لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں ٦ جولائی کے روز اجتماع منعقد ہوئے۔ لاہور اور پشاور میں اجتماعات پر امن رہے جبکہ کوئٹہ میں حکومت نے مظاہرین پر گولیاں برسا کر بیس کے قریب افراد کو شہید اور درجنوں کو شدید زخمی کیا۔ جب اس ظلم کے بعد بھی حکومت کے دل کی آگ نہ بجھی تو انتظامیہ نے سینکڑوں افراد کو گرفتار کر کے کرفیو کا اعلان کر دیا اور "علمدار روڈ" کی شیعہ آبادی کی بجلی پانی بند کر کے کربلا کی یاد تازہ کر دی۔ شہر کے اندر خوف کی فضا نے اقتدار سنبھالا اور شہر کے باہر تعزیتی وفود کے راستے مسدود کر دیئے گئے۔ ان حالات میں قائد کے فرمان پر ملک بھر کے علماء کرام اور تحریک کے کارکنان کے وفود کوئٹہ پہنچے مگر ان میں سے اکثر گرفتار ہوئے اور ان پر جبر و تشدد کے پہاڑ توڑ دیے گئے۔

وحشت کے اس ماحول میں ڈاکٹر صاحب اپنی حکمت عملی کے تحت پہلے تعزیتی وفد میں کوئٹہ پہنچنے میں کامیاب ہوگئے اور علمدار روڈ کے ایک مکان میں مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے بیٹھ گئے۔ پولیس نے انہیں گرفتار کرنے کیلئے کئی بار چھاپے مارے مگر وہ ہر بار پولیس کو چکمہ دے گئے۔ اسی دوران میں آپ نے چوبیس گھنٹے فاقہ میں گزارے اور ایک موقع پر درختوں کے کچے پھل کھا کر اپنے نحیف جسم کو سہارا دیا مگر کچے پھل کھانے سے آپ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔

ایسی فضا میں جب اطلاعات کے تمام ذرائع منقطع تھے آپ کہیں نہ کہیں سے تحریک کے مرکزی آفس اور قائد کو صورتحال سے آگاہ کرتے۔ ایسے ماحول میں جہاں پرندے کا پر مارنا بھی تقریبا" ناممکن تھا ...... سڑکیں اور گلیاں ویران تھیں ...... انسانوں کی آبادی کا تصور تک نہیں ہوتا تھا ...... پولیس اور فوج نے ماحول کو گرفت

میں لیا ہوا تھا نہ جانے ڈاکٹر صاحب کیسے اور کن راستوں سے اخبارات کے دفتر پہنچ جاتے اور وہاں اپنے قائد، اور عوام کے خیالات شائع کرواتے۔ آپ کے ایک قریبی رفیق نے روایت کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب سائیکل پر سوار ہو کر مختلف روپ بدلتے ...... کبھی اخبار فروش کی شکل میں اور کبھی دیہاتی گاہک کے روپ میں شہر کا جائزہ لیتے۔ آپ کی سرگرمیوں اور بے قراری سے لگتا تھا کہ آپ نے طے کر لیا تھا۔

سو گئیں شہر کی سبھی گلیاں
اب میرے جاگنے کی باری ہے

آپ کی بیداری اس قدر پر اثر اور مفید تھی کہ قائد عظیم الشان کو دعائیہ جملے کہنا پڑے "خدا کرے کہ ڈاکٹر صاحب گرفتار نہ ہوں" سفیر انقلاب ایک ماہ سے زائد عرصہ کوئٹہ میں رہے جب حالات قدرے معمول پر آئے تو آپ وہاں سے لوٹے اور اپنے قائد کو تمام صورتحال سے آگاہ فرمایا۔ آپ نے قائد سے گزارش کی کہ وہ حکومت پر اپنے گرفتار شدہ کارکنان کی رہائی اور مقدمات کے خاتمے کا مطالبہ کریں جبکہ تحریک اور آئی۔ ایس۔ او دباؤ میں اضافہ کرے۔

سید عارف حسین الحسینی نے صدا بلند کی تو ڈاکٹر صاحب اور ان کی نظریاتی فوج نے حکومت کی نیندیں حرام کر دیں۔ جب حکومت کے خفیہ اداروں نے یہ محسوس کر لیا کہ حکومت کو زچ کرنے میں ڈاکٹر نقوی کا ہاتھ ہے تو انہوں نے آپ کے گھر پر چھاپے مارے اور ایجنسی کے ایک فرد کو آپ کے گھر کے سامنے سڑک پر درویش کے روپ میں چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی سرگرمیاں نوٹ کرنے والے سڑک پر بیٹھے ہوئے شخص کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا تو آپ نے تحریک کے صوبائی دفتر میں اپنے معتمد ساتھیوں کو آگاہ فرمایا جب یہ احباب اس شخص کو اٹھا لائے تو اس نے اپنا تعلق معروف ایجنسی سے بتایا اور اپنے مقاصد کا اعتراف کیا۔

۱۹۸۶ کو جب کراچی میں تحریک کے تنظیمی اجلاس میں کوئٹہ کے اسیران کو رہا

کرانے کیلیئے لائحہ عمل تیار ہونے لگا تو اجلاس تذبذب کا شکار ہوا مگر ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے لانگ مارچ کی تجویز پیش کی جسے طویل بحث کے بعد قبول کر لیا گیا اور قائد نے یکم مئی ۱۹۸۶ کو لانگ مارچ کرنے کا اعلان فرمایا اور سفیر انقلاب نے تمام تر انتظامی ذمہ داریاں قبول کر لیں۔

ڈاکٹر صاحب اجلاس کے خاتمہ پر لاہور عازم سفر ہوئے تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ "مارکر" (پنسل) لے لیں اور ابھی سے لانگ مارچ کے بارے میں **چلو چلو کوئٹہ چلو** کے نعرے لکھنا شروع کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ آپ نے لاہور پہنچنے تک بیسیوں ٹرینوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر چاکنگ کی۔ علاوہ ازیں آپ نے دوران سفر منصوبہ بندی کی اور ملک کی شخصیات کو اس اعلان کی کامیابی کیلیئے خط لکھے۔ ملتان پہنچتے ہی آپ نے ڈاک لفافے لیئے اور وہیں سے یہ خطوط احسان جعفری صاحب نے ارسال کر دیئے۔

آپ نے لاہور پہنچتے ہی لانگ مارچ کی کامیابی کیلیئے شب و روز ایک کر دیئے۔ نشرواشاعت اور پروپیگنڈہ سے آمر حکمران کے ہاتھوں کے طوطے اڑائے۔ آپ نے ملک کے اہم شہروں کے دورہ جات کرکے عوام کو آمادہ کیا اور اپنی ملت کے ریٹائرڈ فوجیوں اور ٹرین ڈرائیوروں سے رابطے کیئے تاکہ کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ انتظامات سنبھالیں اور ٹرینوں کو کوئٹہ تک لے جائیں۔

اس دوران میں آپ کو ہری پور ضلع نوشہرہ میں وکلاء کے اجتماع سے خطاب کرنے کی دعوت ملی تو آپ مقررہ تاریخ سے قبل ایک روز، لاہور سے اپنی گاڑی میں دو احباب کے ساتھ روانہ ہوئے۔ آپ نے گاڑی میں لانگ مارچ کے پوسٹر، گوند کے ڈبے، پینٹ اور برش ساتھ لیئے اور ہری پور پہنچنے تک تمام راستہ میں چاکنگ کی اور جگہ جگہ پوسٹر لگائے۔ جب آپ ہری پور پہنچے تو سیاہی لگے کپڑے اتارے، رنگ بھرے ہاتھ دھوئے اور پھر بار کونسل میں خطاب کرنے چلے گئے۔

جب حکومت نے لانگ مارچ کی تحریک کے آگے گھٹنے ٹیکے اور وقت کے آمر نے ملت جعفریہ کے سامنے دوسری بار شکست کا اعتراف کیا تو ڈاکٹر صاحب آئی۔ ایس۔ او کے مرکزی صدر برادر سید امتیاز علی رضوی کو ساتھ لیئے قائد کی خدمت میں

پشاور پہنچے اور انہیں کوئٹہ جانے کی گزارش کی تاکہ شہداء کے پسماندگان کی دلجوئی ہوسکے۔ اس موقع پر قائد نے ڈاکٹر صاحب سے دل کی بات کی کہ وہ پہلے سے جانے کا ارادہ کر چکے ہیں البتہ انہیں رقم کا مسئلہ درپیش ہے کیونکہ وہ خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتے۔ قائد کے یہ جملے سن کر ڈاکٹر صاحب نے حامی بھری کہ وہ بسم اللہ کرکے راولپنڈی سے ٹرین پر روانہ ہوں اور لاہور میں انہیں مطلوبہ رقم پیش کر دی جائیگی۔

سفیر انقلاب' سفیر نور سے وعدہ کرکے لاہور لوٹے اور یہاں کے صاحب ثروت حضرات کے دروازوں پر دستک دی۔ یہاں کے عوام بالخصوص شیخ تاجر برادری نے آپ کی صدا کے درد کو محسوس کیا اور آپ نے دو روز میں ایک لاکھ روپے اکٹھے کر لیئے۔

عوامی لانگ مارچ سے قبل حکومت بلوچستان نے تمام اسیر رہا کر دیئے۔ کوئٹہ سے قائد ملت جعفریہ کو حالات سے آگاہ کر دیا گیا اطلاع ملتے ہی علامہ سید عارف حسین الحسینی نے کوئٹہ جانے پر نظرثانی فرمائی البتہ اس سلسلہ میں اپنے معتمد رفیق سفیر انقلاب سے فون پر رابطہ کیا۔ آپ تحریک کے صوبائی دفتر میں موجود تھے جب آپ سے قائد نے مشورہ کیا تو آپ نے فون پر ہی ایک منٹ کی اجازت لی ...... آدھ منٹ کیلئے سوچا اور پھر عرض کی "آغا صاحب آپ بسم اللہ پڑھ کر روانہ ہوں" اور یوں قائد آپ کی تجویز پر پشاور سے کوئٹہ کیلئے عازم سفر ہوگئے۔

جب قائد لاہور پہنچے تو ڈاکٹر صاحب آپ سے ملے جمع شدہ رقم اپنے آقا کے سپرد کی اور عرض کی کہ آپ کے ساتھ یہاں سے دو افراد جا رہے ہیں کسی بھی مرحلہ پر رقم کے حوالہ سے پریشان نہیں ہونا آپ جو حکم دیں گے یہ برادران تعمیل کریں گے۔ آپ خود بھی قائد کیساتھ ہمسفر ہوئے اور قائد سے عوام کی عقیدتوں کا ماحول دیکھ کر بقول شاعر فرمایا۔

اے محبوب قائد !

وقت کی آنکھ شبنمی سی ہے
جبر کی شب ذرا کڑی سی ہے

تیرے پاؤں میں ظلم کی زنجیر
ٹوٹ جائیگی عارضی سی ہے

آخر وہی ہوا کہ جبر کی کڑی رات نے دم توڑا .... آزادی کی شفق طلوع ہوئی ..... ظلم کی زنجیریں ٹوٹیں ...... قائد کے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے زندانوں کے دروازے کھلے اور اسیران کوئٹہ لبیک یا حسینی کہتے ہوئے سلاسل سے باہر آئے۔ انہوں نے قائد کا تاریخی استقبال کیا یاد رہے کہ قائد کی روانگی سے استقبال کے اختتام تک کے تمام پروگرام ڈاکٹر صاحب کے طے شدہ تھے

قائد ذی وقار شہداء کے مزاروں اور ان کے پسماندگان کی صف ماتم پر تشریف لے گئے تو شہداء کی ارواح اور ان کے ورثاء نے محبوب قائد پر واضح کیا کہ اے فرزند زہراء آپ پر ہماری جانیں قربان ہیں جہاں تک ہماری قربانیوں اور ظالموں کے ظلم کا تعلق تو

حسینیت کا تو چودہ صدیوں سے آج تک قاعدہ یہی ہے
بدن سے تیروں کو توڑ دینا گلے سے خنجر کو کاٹ دینا

جب کوئٹہ کے حالات معمول پر آگئے تو سانحہ میں شدید مجروح ہونے والے برادران کو ڈاکٹر صاحب نے لاہور بلوا لیا اور انہیں یہاں ہر قسم کی طبی سہولت فراہم کی۔ جو زخمی اسپتال سے فارغ کر دیے جاتے ان کی مزید دیکھ بھال اور مرہم پٹی کیلئے آپ نے تحریک کے صوبائی دفتر میں منی اسپتال قائم کر لیا جہاں آپ ان کی نگہداشت کیلئے ہمہ وقت حاضر رہتے۔ آپ نے باقاعدگی سے مجروحین کی خدمت کی یہاں تک کہ آپ کو عام طور پر رات کے پچھلے پہر گھر جانا نصیب ہوتا۔

ایک رات آپ کو مرہم پٹی کرتے اور وقت پر دوائیاں وغیرہ دیتے دیتے رات کے دو بج گئے آپ دو بجے گھر روانہ ہوئے۔ تقریباً" ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ایک زخمی ٹانکے کھلنے کے باعث درد سے چیخنے لگا ڈاکٹر صاحب ابھی سوئے ہی تھے کہ ڈیوٹی پر مامور

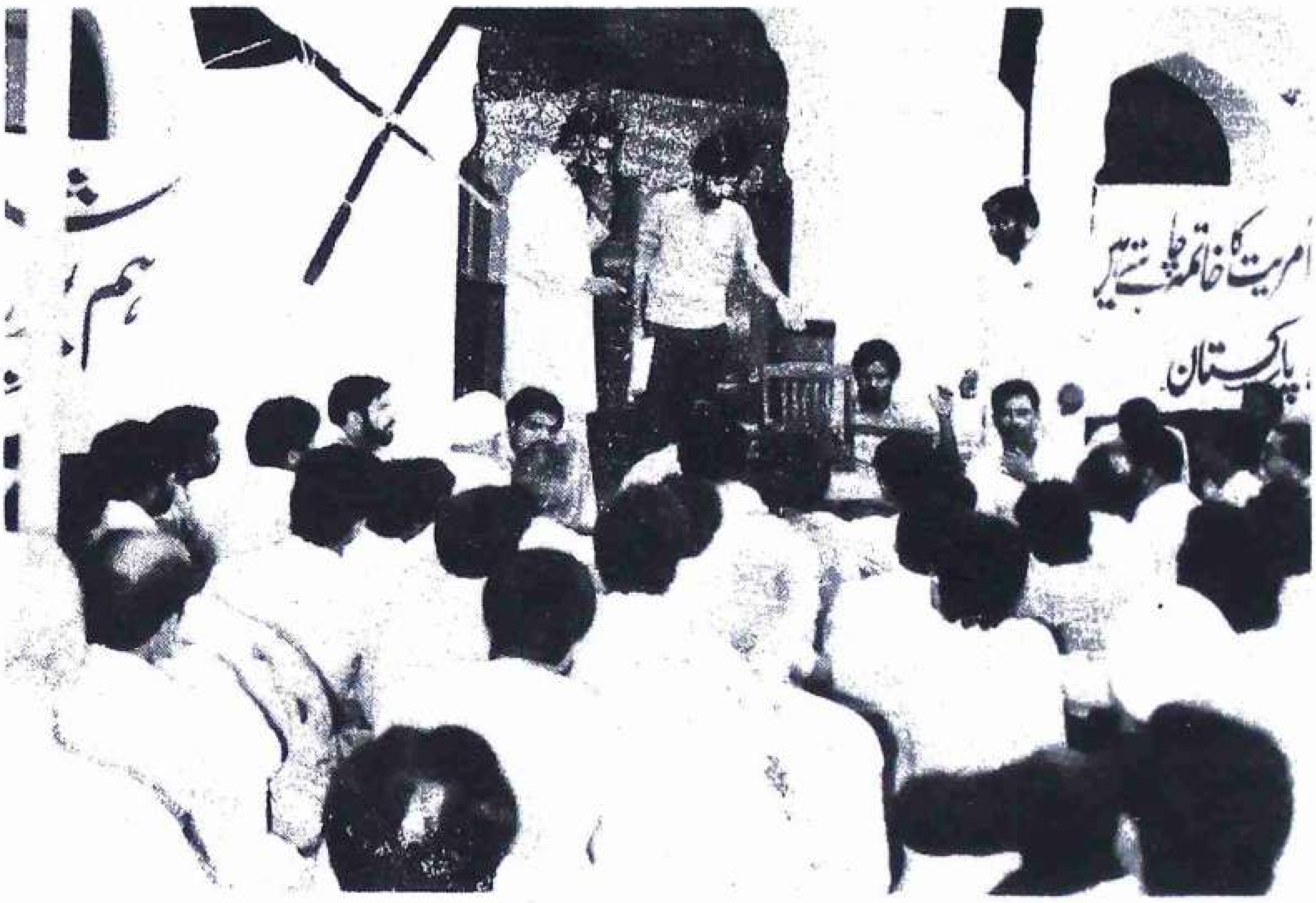
امریت کا خاتمہ چاہتے ہیں
پاکستان

برادر قاسم حسن نے آپ کو فون کر کے نیند سے بیدار کر دیا آپ نے غشی کے عالم میں برادر کی بات سنی فوراً" بستر چھوڑ کر گاڑی پر سوار ہوئے اور مریض کے پاس پہنچ گئے۔

جب آپ سے کہا گیا کہ آپ آرام فرما لیتے صبح آجاتے تو آپ نے فرمایا کہ " یہ عام زخمی نہیں ہیں یہ وہ مجروح ہیں جنہوں نے میرے محبوب قائد کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے گولیاں کھائیں ہیں انہوں نے اپنے جوان بھائی' بیٹے اور اپنے جسم کے ٹکڑے قربان کئے ہیں کیا ہم ان کیلئے آرام بھی قربان نہیں کر سکتے؟"

بقول برادر قاسم حسن کہ ڈاکٹر صاحب نے ان مریضوں کے پیشاب آلود کپڑے تک صاف کیئے اور یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی کہتے تھے کہ "ان برادران کی قربانیوں کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔"

اپریل ۱۹۸۶ء میں پاکستان کی تاریخ کے بڑے آمر نے علامہ سید عارف حسین الحسینی کے لانگ مارچ کے اعلان اور ان کے عوام کے جذبوں کے آگے گھٹنے تو ٹیک دیئے مگر اس نے درک کر لیا کہ ملت جعفریہ سے ٹکرانا اس کی حکومت یا اداروں کے بس کا روگ نہیں۔ حکمرانوں اور ان کے خفیہ اداروں نے طے کیا کہ ملت جعفریہ کے گلے میں ایک ایسا مخالف جماعتی طوق ڈال دیا جائے جو اس کے تحرک کو محدود کر دے۔ چنانچہ ٦ ستمبر ۱۹۸٦ء کو ملک میں شیعہ مخالف ایک ایسی تنظیم کو جنم دیا گیا جو حکمرانوں کے خیالات سے بھی کہیں زیادہ کارگر ثابت ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب کی ۷ جولائی ۱۹۸۰ کی پیشگوئی نے ان کی دور اندیشی کو سچ ثابت کر دکھایا جب آپ نے اسلام آباد کے معرکہ کی کامیابی کے بعد واپسی پر احباب سے فرمایا تھا کہ "آمر حکمران کے پاس ہمارے مقابلہ کیلئے صرف ایک حربہ باقی ہے کہ وہ فرقہ وارانہ بنیادوں پر کسی رجعت پسند گروہ کو ابھارے اور اسے ہمارے پاؤں کی زنجیر بنا دے"۔

شیعہ مخالف تنظیم نے پہلی بار جھنگ سے دہشت گردی کا آغاز کیا اور انہوں نے صادق حسین عزادار کو شہید کیا۔ جب یہ اطلاع تحریک کے صوبائی دفتر میں پہنچی تو یہاں سے قائدین جھنگ روانہ ہوئے۔ جھنگ کے مومنین میں خاصا غم و غصہ تھا جبکہ پولیس حکومتی اشاروں کے باعث شیعوں کو دبانے کے تمام حربے استعمال کر رہی تھی

ایک مرحلہ پر پولیس نے امام بارگاہ میں آنسو گیس کے گولے پھینکے اور شدید لاٹھی چارج کیا۔ اس موقع پر کمالیہ کے ایک جوان امتیاز حسین سر پھٹنے کی وجہ سے شہید ہوگئے۔ جب مظاہرین امام بارگاہ کے اندر آگئے تو وہاں کا مجسٹریٹ "شریف نوریا" للکارتا ہوا گیٹ پر آیا "شیعو بے غیرتو کہاں چھپ گئے ہو" یہ جملے ڈاکٹر صاحب کے کانوں سے ٹکرائے تو آپ اکیلے آگے بڑھے اور اس کے منہ کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "خبردار اگر زبان دراز کی تو ......" ایسے میں آپ پر لاٹھیوں کی بارش ہوئی اور آپ گرفتار کر لیئے گئے۔

آپ جیل پہنچے تو وہاں پر پہلے سے اسیر برادران کو حوصلہ دیا اور انہیں تاکید فرمائی کہ یہاں ذات سے زیادہ اپنے نظریہ کو ترجیح دینا۔ نہانے کیلئے پانی طلب نہ کرنا بلکہ وضو کیلئے پانی مانگنا' زیادہ کھاکر سو نہیں جانا بلکہ کم کھاکر عبادت کرتے رہنا اور پھر ایسے میں امامؑ کو یاد کرنا"

☆☆☆☆☆

قرآن و سنت کانفرنس اور سفیر انقلاب

فرقہ واریت کے اٹھنے والے طوفان' آمر حکمرانوں کے بھیانک خیالات اور ملک کی ابتر صورت حال کے پیش نظر مارچ ۱۹۸۷ کو تحریک کو فقہ کے دائرہ سے نکال کر ملک کے سیاسی افق پر لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کے نام اور تاریخ کا اعلان قائد ملت جعفریہ نے فرمایا اور طے پایا کہ ٦ جولائی ۱۹۸۷ کے روز یہ "قرآن و سنت کانفرنس" موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوگی جس میں ملت اسلامیہ کے قائد معاہدہ اسلام آباد کی یاد تازہ کرنے' فرقہ واریت کو روکنے' حکمرانوں کو ملکی سالمیت کا احساس دلانے' تحریک کو بطور سیاسی جماعت پیش کرنے اور ملک کے مظلوم اور محکوم عوام کی نجات کیلئے اپنے سیاسی لائحہ عمل کا اعلان فرمائیں گے۔

اس کانفرنس کی سرپرستی علامہ سید ساجد علی نقوی کو سونپی گئی جبکہ تمام تر انتظامات کے نگران ڈاکٹر محمد علی نقوی ٹھہرے۔ کانفرنس کے اعلان سے اختتام تک ڈاکٹر صاحب نے کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر دن رات اس کی کامیابی کیلئے کام کیا۔ آپ نے اعلان سے انعقاد تک تحریک کے صوبائی دفتر لاہور میں ڈیرے ڈال دیے جہاں سے نشرو اشاعت' پیغامات' خطوط اور ملک بھر میں اپنے عوام سے رابطے استوار کیئے۔ آپ کی ہدایات پر درجنوں اقسام کے ہزاروں پوسٹر اور سٹکرز شائع ہوئے جو وطن عزیز کے چپہ چپہ پر چسپاں دکھائی دیئے۔ کارکنان آج بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ سفیر انقلاب نے یہ پوسٹر اور سٹکرز کئی مقامات پر اپنے ہاتھوں سے لگائے۔

آپ نے موٹر سائیکل سواروں کے قافلے تشکیل دیے جنھوں نے لاہور سے اسلام آباد' ملتان' فیصل آباد اور سرگودھا تک چاکنگ کی۔ آپ نے ملک بھر کے خود بھی دورہ جات کیئے اور قریہ قریہ سے آنے والے قافلوں کی رپورٹس تیار کیں۔

بعض اوقات جب ٦ جولائی کی "قرآن و سنت کانفرنس" کامیابی اور عوامی جوش و خروش کا تذکرہ ہوتا تو ڈاکٹر صاحب ایک واقعہ سناتے کہ "اس کانفرنس کی کامیابی کیلئے علامہ سید ساجد علی نقوی و دیگر زعمائے قوم کام میں مصروف تھے۔ سفر کے دوران میں ایک مقام پر پیاس نے ہمیں ستایا ہم ایک "کھوکھا" پر بوتلیں پینے کیلئے

رکے تو "کھوکھے" کے اندر یا علیؑ مدد کا سٹکر لگا ہوا دکھائی دیا۔ میرے استفسار پر وہ کھوکھے کا مالک شیعہ نکلا۔ چنانچہ میں نے اسے ٦ جولائی کی کانفرنس کے بارے میں آگاہ کیا اور اس سے بھی ٧٥ روپے چندہ لیا"

کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں آپ کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ تحریک کے صوبائی دفتر کے دوستوں نے مزاحاً" مشہور کر دیا کہ "آج کل ڈاکٹر صاحب کے پاس جو مریض بھی آتا ہے آپ اس کے نسخہ پر ٦ جولائی' موچی دروازہ چلو...... صبح دوپہر شام ضرور لکھتے ہیں"

آپ نے کانفرنس سے پندرہ بیس روز قبل قائد ملت جعفریہ کو آگاہ کر دیا کہ کانفرنس میں شرکت کے خواہاں افراد کی تعداد کو اپنے دامن میں سمانا "موچی دروازہ" کے بس کا روگ نہیں رہا لہٰذا وہ یونیورسٹی گراؤنڈ کے بارے میں نظر ثانی فرمائیں۔

جب خدا کے برگزیدہ عبد اور ملت جعفریہ کے قائد کو اپنی روحانیت اور احباب کی رپورٹس نے عوام کے سمندر کی نوید دی تو انہوں نے مینار پاکستان پر قرآن و سنت کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا۔

تحریک کے دیگر قائدین اور منتظمین نے اس سے اختلاف کیا ان کا خیال تھا کہ مینار پاکستان کے گراؤنڈ کا پیٹ بھرنا بصد مشکل ہے مگر علامہ سید عارف حسین الحسینی نے فرمایا "یہ فیصلہ اٹل ہے" ڈاکٹر صاحب سمیت جو افراد قائد کی روحانی طاقت سے آگاہ تھے انہوں نے آپ کے چہرے کے تیور اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر سر خم کر لیئے۔

چونکہ یہ فیصلہ آخری دو روز میں ہوا اسلیئے منتظمین کیلیئے دو ماہ کے کیئے گئے انتظامات تبدیل کرنا بظاہر ناممکن تھا مگر ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے "اللہ اکبر" کا نعرہ بلند کیا اور دو روز کے اندر "مینار پاکستان" میں انتظامات کو مکمل کر کے سوچنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔

آپ نے سکیورٹی کے تمام امور اپنے ہاتھ میں رکھے۔ ہر کارکن اور امامیہ اسکاؤٹس کو اس کی ذمہ داریاں تفویض کیں اور آپ نے اپنے پیغمبر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جنگ احد کے موقع پر دیے گئے احکامات کی سنت ادا کرتے ہوئے

احباب کو حکم دیا کہ وہ کسی بھی مرحلہ پر اپنے مقررہ مقام سے تل بھر نہ ہٹیں۔ آپ نے کانفرنس سے ایک روز قبل اور کانفرنس کے روز اپنے مواصلاتی نظام سے ہر کارکن اور محافظ کو اس کے مقام پر کئی بار چیک کیا۔

کانفرنس کے بیسیوں کارکنان کا کہنا ہے کہ انہوں نے کانفرنس کے آخری دو روز میں ڈاکٹر صاحب کو کہیں سوتے نہیں دیکھا شاید یہی وجہ تھی کہ آپ جیسا انتھک اور فولادی جسم و عزم کا شخص کانفرنس کے روز تقریباً ڈیڑھ بجے دوپہر بے ہوش ہوگیا اور آپ کو توانائی دینے کیلئے گلوکوز کی بوتل لگانی پڑی۔

آپ ہوش میں آئے تو آرام کیئے بغیر پھر مصروف کار ہوگئے۔ ڈیوٹی پر حاضر تمام کارکنان کو ہوشیار کرکے خود قائد ملت اسلامیہ کو لینے چلے گئے۔ آپ جونہی پنڈال میں اپنے محبوب قائد کے ساتھ آئے تو پنڈال استقبالی نعروں سے گونج اٹھا۔ زمین اور آسمان کے درمیان ایک ارتعاش آیا قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی سٹیج پر تشریف لائے تو لاکھوں ہاتھ دعا کیلئے اٹھے اور ہر زبان پر یہ دعا موجزن ہوئی۔

خدایا خدایا تا انقلاب مہدی
زندہ رہے خمینی زندہ رہے حسینی

آج بھی اگر ٦ جولائی ١٩٨٧ کی ویڈیو فلم میں اس تاریخی کانفرنس کا منظر دیکھیں تو ڈاکٹر محمد علی نقوی فرط جذبات میں ڈوب کر وجد کی حالت میں

خدایا خدایا تا انقلاب مہدی
زندہ رہے خمینی زندہ رہے حسینی

کے نعرے لگاتے ہوئے واضح نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ زندگی گزارنے والے احباب کا کہنا ہے کہ انہوں نے پہلی بار ڈاکٹر صاحب کو وجد کی کیفیت میں جھومتے دیکھا۔

اسی کانفرنس کے اختتام پر ایک صحافی نے آپ سے انٹرویو کیا ”جو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہے“ گفتگو یوں ہوئی۔

☆ ”سنا ہے کہ آپ اس تاریخی کانفرنس کے نگران تھے“

○ ”نہیں میں اس کانفرنس کا کارکن تھا“

☆ ”کیا آپ کی نظر میں یہ کانفرنس کامیاب رہی ہے؟“

○ اس میں کوئی شک نہیں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں یہ ہماری بہت بڑی کامیابی ہے“

☆ ”کیا آپ اس کی کامیابی پر خوش ہیں؟“

○ ”الحمد اللہ میں بے حد خوش ہوں“

☆ ”آپ کچھ مزید کہنا چاہیں گے؟“

○ ”میری دعا ہے کہ ہمارے تمام قافلے بخیریت گھروں کو پہنچ جائیں“

جب ۷ جولائی کو تمام کارواں بخیریت پہنچ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے اپنے رب کا شکر ادا کیا اور صوبائی دفتر تحریک میں لاہور کے کارکنان کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ اس قدر خوش کیوں ہیں۔؟ تو آپ نے فرمایا۔ میں صرف اجتماع کو دیکھ کر خوش نہیں ہوا بلکہ میری خوشی کی وجہ یہ ہے کہ ”پاکستان کے قیام کے بعد پہلی مرتبہ اہل تشیع کی قیادت نے باقاعدہ طور پر ملکی امور میں مداخلت کرنے اور ملک میں سامراج کی مداخلت کو روکنے کا اعلان کیا ہے اور ساتھ ہی فرقہ سے بالا تر ہوکر ملک کے محروم اور محکوم عوام کے حقوق کی بازیابی اور قیام پاکستان کے مقاصد کے حصول کیلئے اپنی جدوجہد کا آغاز اور لائحہ عمل پیش کیا ہے“

○○○○

تحریک کا وسیع النظریاتی سفر شروع ہوا تو سفیر انقلاب کارواں ساز ٹھہرے۔ اتحاد بین المسلمین کا پیغام پھیلانے کیلئے مذہبی جماعتوں کے قائدین سے روابط ہوئے یا جمہوریت کے استحکام کیلئے سیاسی پارٹیوں کے رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں ڈاکٹر صاحب تقریباً“ ہر مذاکراتی ٹیم میں شامل رہے۔

مؤقر ذرائع کے مطابق جب مذاکراتی گروہ تشکیل دیے جاتے تو علامہ سید عارف حسین الحسینی علماء کرام میں سے علامہ سید ساجد علی نقوی اور غیر علماء میں سے ڈاکٹر محمد علی نقوی کی شمولیت کی تاکید فرماتے۔ ایک مرتبہ لاہور میں تحریک کے کچھ معروف لوگ ایک سیاسی جماعت کے قائد سے ملک کی صورتحال کا جائزہ لینے اور انہیں اپنے مؤقف سے آگاہ کرنے چلے گئے تو قائد ملت جعفریہ یہ اطلاع پاکر قدرے پریشان ہوئے مگر انہیں جونہی پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس وفد میں شامل ہیں تو پھر ایک دم مطمئن ہوگئے اور فرمانے لگے "ڈاکٹر بھائی کے ہوتے ہوئے تحریک کے مؤقف کی فکر نہیں کرنی چاہیے"

عظیم قائد ڈاکٹر صاحب کو فرط محبت و شفقت میں ڈاکٹر بھائی کہا کرتے تھے دور سے دیکھتے تو آپ کے روحانی چہرے سے نور کی کرنیں پھوٹ پڑتیں' آپ کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی اور آپ اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کا استقبال کرتے اور بسا اوقات آپ کی پیشانی پر بوسہ بھی دیتے۔

قائد شہید کا معمول تھا کہ اگر کوئی ان کی دست بوسی کرنے لگتا تو وہ جنبش سے ہاتھ کھینچ لیتے شاید وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے عوام ان کی دست بوسی تک محدود رہیں اور انہیں روایتی مرشد کا روپ دے دیں۔ ایک مرتبہ ذاتی طور پر میرے ساتھ بھی یہی نوبت آئی کہ آپ ڈیرہ اسماعیل خان تشریف لائے تو ایئرپورٹ پر حجتہ الاسلام والمسلمین علامہ غلام حسن جاڑا' خورشید انور ایڈووکیٹ اور راقم جہاز تک گئے اور اپنے معزز مہمان اور قائد کو خوش آمدید کہا اس موقع پر قائد محبوب نے دونوں ہاتھوں سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے فرط عقیدت میں دست بوسی کی کوشش کی تو آپ نے ہاتھ کھینچ لیئے .... پھر آپ نے میری جانب دیکھا تو آپ کو میری تشنہ حسرت کا جواب میری آنکھوں سے ملا آپ نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھا .... لب چولے معلوم نہیں کیا فرمایا ..... مجھے اب سمجھ آتی ہے کہ آپ کا دست' سر پر شفقت ہی نہیں تھا بلکہ آپ نے میری تعمیر کا افتتاح فرمایا تھا۔

خیر ! بات ہو رہی تھی کہ قائد عموماً" اپنی دست بوسی نہیں کرنے دیتے تھے البتہ پاکستان میں دو چار افراد ایسے ہیں کہ جب وہ دست بوسی کرتے تو قائد اپنا دست

مبارک کبھی نہ کھینچتے ان میں ایک ڈاکٹر محمد علی نقوی کی ذات گرامی تھی۔

عالم قائد کی مجاہد بھائی سے محبت اس قدر مستحکم تھی کہ قائد ملت اسلامیہ جب کسی نئے منصوبہ کے بارے میں سوچتے یا ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں اپنی قوم اور ملک کی فلاح کیلئے کوئی نیا پروگرام ابھرتا تو فی الفور رابطہ کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ خود فرمایا تھا کہ بعض اوقات رات کے وقت قائد صاحب کا پشاور سے فون آتا کہ "ڈاکٹر بھائی اگر آپ کے پاس وقت ہے تو آپ صبح ناشتہ میرے ساتھ کریں"۔ لہٰذا میں بذریعہ کوچ رات کو روانہ ہوتا اور صبح پشاور پہنچ جاتا۔ وہاں قائد نئے منصوبوں پر سیر حاصل گفتگو فرماتے اور سمت دیتے"۔

یہی حالت ڈاکٹر صاحب کی بھی تھی کہ جونہی آپ کو "سفیر نور" کی زیارت کا اشتیاق تڑپاتا یا کوئی اہم قومی مسئلہ رونما ہوتا تو آپ فوراً" قائد کی خدمت میں پیش ہو جاتے۔ ایک دفعہ آپ پنجاب یونیورسٹی میں کسی کام سے گئے ہوئے تھے آپ کے بہنوئی سید اعجاز نقوی بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ راستہ میں موٹر سائیکل چلاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں ضیاء الحق کے اعلان ریفرنڈم کے خلاف ایک سوچ نے انگڑائی لی اور آپ نے اپنے بہنوئی سے کہا کہ وہ انہیں اسٹیشن چھوڑ آئیں۔ آپ گھر لوٹے اور کپڑے تبدیل کیئے بغیر سیدھا اسٹیشن پہنچے اور وہیں سے پشاور روانہ ہوگئے۔ راستہ میں آپ سے بہنوئی نے تکرار بھی کی کہ وہ کل چلے جائیں مگر آپ نے فرمایا "زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ گھر تو لوٹ ہی آنا ہے" آپ پشاور پہنچے، قائد کو اپنا پلان بتایا، جو انہیں بے حد پسند آیا اور انہوں نے اس پر عمل در آمد کی اجازت دی۔

آپ کی قیادت سے وابستگی اور قیادت کا آپ پر اعتماد دیکھ کر اپنی صفوں کے چند مخالفین نے کہا تھا کہ "عارف حسینی تو ڈاکٹر نقوی کے گرد گھومتے ہیں"

ڈاکٹر صاحب کو اپنے قائد سے اس قدر عقیدت تھی کہ فون پر گفتگو کرتے ہوئے احتراماً" اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ قائد کی شہادت کے بعد آپ اپنے دفتر میں مصروف کار تھے کہ ایک نوجوان، شہید قائد کی خوبصورت تصویر لایا۔ آپ دیکھتے ہی بے اختیار کھڑے ہوگئے، تین بار تصویر کو بوسہ دیا اور اسے فریم کرنے اور اپنے گھر

بھجوا دینے کی تاکید فرمائی۔

☆☆☆☆☆

لاہور کی مرکزی قرآن و سنت کانفرنس کی کامیابی کے بعد ڈاکٹر صاحب اور آپ کے احباب نے فیصلہ کیا کہ تحریک کو اپنا سیاسی سفرایک نئی اٹھان اور درد سے شروع کرنا چاہیئے لہٰذا اس سلسلہ میں قران و سنت کانفرنسز کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔ چنانچہ اس ضمن میں ملتان، فیصل آباد اور ڈیرہ اسماعیل خان میں یاد گار "قرآن و سنت کانفرنس" کا انعقاد ہوا جن کے انتظامات میں سفیر انقلاب نے بحیثیت فرزند قرآن و سنت تاریخی کردار ادا کیا۔

۴ مارچ ۱۹۸۸ء کو ملتان کی کانفرنس کے اختتام پر جب قائد کچھ دیر کیلئے آرام فرمانے چلے گئے تو ڈاکٹر صاحب جنہوں نے ان کے ساتھ راولپنڈی روانہ ہونا تھا جلسہ گاہ "قلعہ قاسم باغ" میں رہے یہاں تک کہ آپ نے کارکنان کیساتھ دریاں لپیٹیں اور کرسیاں سمیٹیں۔ آپ کام سے فارغ ہوئے تو قائد کے پاس آگئے جہاں سے سیدھے راولپنڈی چلے گئے اور گاڑی خود چلائی۔ جب آپ سے کسی دوست نے پوچھا کہ آپ مسلسل دو روز سے کام میں مصروف ہیں آرام کر لیں تو آپ نے فرمایا "تھکاوٹ کا تعلق اپنی ذات سے ہے جب ہمارا سفر خدا کی ذات کیلئے ہے تو پھر تھکاوٹ کیسی ......؟"

۱۸ مارچ کو فیصل آباد کی قرآن و سنت کانفرنس کے وقت آپ نے انتظامی امور کے ساتھ ساتھ حفاظتی اقدامات پر خاصی توجہ دی کیونکہ یہاں فرقہ وارانہ فساد کا خطرہ قوی تھا۔ جب کانفرنس کے دوران میں آندھی نے نظام درہم برہم کیئے تو آپ نے ڈیوٹی پر مامور ہر کارکن سے رابطہ کیا اور انہیں اپنے مقام پر چوکنا رہنے کی ہدایت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر جب قائد ملت اسلامیہ نے ایک ضیافت میں سیاست اور صحافت

سے متعلقہ شخصیات اور صحافیوں سے ملکی اور بین الاقوامی صورتحال پر گفتگو کی اور ان کے تابڑ توڑ سوالات کے منہ توڑ جوابات دیے تو ڈاکٹر صاحب بے حد خوش ہوئے۔ اس محفل کی گفتگو کے بعد آپ نے اپنے احباب سے پوچھا کہ آیا کسی نے یہ گفتگو ریکارڈ کی ہے .....؟ جب جواب منفی میں ملا تو آپ نے بے حد افسوس کیا اور زندگی بھر اس گفتگو کے انداز کو یاد کرتے رہے۔ آپ اس محفل میں قائد کی دور اندیشی اور ملکی حالات پر گرفت کے اس قدر معترف تھے کہ آپ جب "سفیر نور" کتاب کے مسودہ کا جائزہ لے رہے تھے تو ایک مقام پر فرمایا "کاش تسلیم بھائی ہمارے پاس فیصل آباد میں قائد کی گفتگو کا ریکارڈ ہوتا اور آپ اسے یہاں نقل کرتے" آپ نے مزید فرمایا کہ "ہمیں تو اس روز سے یقین ہوگیا تھا کہ ایسا شخص پاکستان میں تو کجا دنیا کے کسی کونہ میں بھی ہوتا۔ امریکہ اور اس کے ایجنٹ اس کی سانسیں گوارہ نہ کرتے۔"

۱۷ جون ۱۹۸۸ء کو ڈیرہ اسماعیل خان کی کانفرنس ہوئی تو آپ مئی کی گرمی میں کانفرنس کے انتظامات کا جائزہ لینے کیلئے پہنچے پھر اس سلسلہ میں لاہور سے فون کے ذریعہ مربوط رہے اور کانفرنس سے ایک دو روز قبل پھر تشریف لائے تمام کارکنان کی حوصلہ افزائی کی۔ سٹیج کا نظام سنبھالنے والے افراد کے بارے معلومات طلب کیں۔

یہاں بھی کانفرنس کے اختتام پر ضلع کونسل کے ارکان کی جانب سے قائد ملت اسلامیہ کو عشائیہ دیا گیا جہاں آپ نے علاقائی سیاست دانوں سے ملکی حالات پر مفصل اور مدلل گفتگو کی جس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "کہ ماشاء اللہ قائد محترم کو اب تو اردو بولنے پر خاصی گرفت حاصل ہوگئی ہے اور سیاسی سطح پر دیگر سیاسی رہنماؤں سے بہت ممتاز نظر آتے ہیں خدا نظربد سے محفوظ رکھے"

ڈیرہ اسماعیل خان کی کانفرنس کے بعد آپ کا خیال تھا کہ سندھ میں ایک "قرآن و سنت کانفرنس" کا انعقاد ہو۔ مگر آپ اسی سال حج پر چلے گئے جہاں سعودی حکومت نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ آپ پابند سلاسل ہی تھے کہ ادھر آپ کے محبوب اور ملت اسلامیہ کے افتخار علامہ سید عارف حسین الحسینی ۵ اگست ۱۹۸۸ء کی دم صبح اپنے مدرسہ "جامعتہ المعارف" پشاور میں شہید کر دیئے گئے اور یوں "سفیر نور" اور سفیر انقلاب" کی ہمسفری کا درخشاں باب ختم ہوگیا۔

آپ کو اپنے قائد کی شہادت کی اطلاع سعودیہ کے تاریک زندانوں میں دو روز بعد موصول ہوئی .... آپ پر کیا بیتی اور اس خبر کو کیسے سنا اور برداشت کیا یہ بات بیان کی محتاج نہیں۔

آپ سعودیہ میں کیوں اور کیسے گرفتا ہوئے اس کا تذکرہ اگلے صفحات پر آئے گا تاہم آپ کی رہائی ملت جعفریہ پاکستان کے پر زور مظاہروں اور دباؤ کی بدولت ہوئی۔ آپ کو چار ساتھیوں سمیت سعودی حکومت نے پاکستانی حکومت کے حوالے کیا۔ آپ کے علاوہ دیگر احباب رہا کر دیئے گئے جبکہ پاکستانی تفتیشی ٹیمیں آپ کو "سہالہ کیمپ اسلام آباد" لے گئیں جہاں کچھ روز تک آپ سے تفتیش کی۔

تحریک جعفریہ کے سفر کا تیسرا مرحلہ :۔

ڈاکٹر صاحب جب جیل سے رہا ہوئے تو قائد شہید کے چہلم کا اعلان ہو چکا تھا اور اس وقت کے قائم مقام صدر تحریک نفاذ فقہ جعفریہ پاکستان علامہ سید ساجد علی نقوی لائحہ عمل تیار کر رہے تھے۔ آپ جیل سے سیدھا مدرسہ "آیت الحکیم" راولپنڈی چلے گئے اور علامہ سید ساجد علی نقوی کو شہید قائد کا پرسا دیا آپ نے وہاں پر موجود کارکنان سے شکوہ بھی کیا کہ ابھی تک اسلام آباد اور راولپنڈی میں قائد شہید کے چہلم کے اشتہار چسپاں نہیں ہوئے۔

آپ نے قائد ملت جعفریہ سے مفصل ملاقات کی اور ان کی اجازت سے لاہور آگئے۔ آپ کی کوشش تھی کہ اطلاع کیئے بغیر چپکے سے لاہور پہنچیں تاکہ کارکنان کوئی جلوس وغیرہ نہ نکال سکیں۔ تاہم آپ سیدھا تحریک کے دفتر پہنچے تو کارکنان نے آپ کا تعزیتی خیر مقدم کیا۔ آپ کو قائد کی شہادت کا پرسا دیا اور آپ نے یتیم بھائیوں کو دلاسے دیئے۔

آپ نے ہر ملاقاتی سے اپنے قائد کی شہادت کی تعزیت لی اور برادران کو قائد

کے چہلم کے اجتماع کی کامیابی کیلیئے کام کرنے کی تاکید فرمائی۔

آپ نے لاہور میں اپنے معتمد احباب اور تحریک کی سپریم کونسل کے ممبران علماء کرام سے آئندہ قیادت کے چناؤ کے سلسلہ میں صلاح مشورے کیئے دورانِ بحث تین شخصیات زیر بحث آئیں جن میں سے ایک شخصیت آپ کے ساتھ سعودی عرب میں قید بھی رہی تھی اور عوام کا ایک طبقہ اس وقت کے حالات کے پیش نظران کا حامی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے تمام امور پر غوروفکر کرنے کے بعد علامہ سید ساجد علی نقوی کو فہم و فراست، قائد شہید سے آپ کی وابستگی اور تحریک کی خدمات اور علم و حلم کی بنیاد پر متوقع قائد قرار دیا۔

تحریک کی مرکزی اور سپریم کونسل نے دستوری تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ٦ ستمبر ۱۹۸۸ کو قائد شہید کی مقتل گاہ پر ملت جعفریہ کی قیادت کا علم علامہ سید ساجد علی نقوی کے ہاتھوں تھمایا اور قائد شہید کے مقتل پر واضح کیا کہ

قائد تیرا کارواں رکا نہیں تھما نہیں

سفیر انقلاب پشاور میں اپنے شہید قائد کی مقتل گاہ پر پہنچے۔ تو ساون کے بادل کی طرح ٹوٹ کے روئے۔ جب مقتل سے روانہ ہونے لگے تو آپ کی نظر وہاں دیوار پر چسپاں ہاتھ سے لکھے ہوئے ایک کاغذ پر پڑی جس پر درج تھا کہ

ہمارے بعد بھی رونق رہے گی مقتل میں
ہم اہل دل کو بڑے حوصلے میں چھوڑ آئے

اگرچہ آپ کو شعر و شاعری سے کبھی لگاؤ نہیں رہا مگر بعض اوقات شعر کی گہرائی اور مطلب آپ کے جذبات کی ترجمانی کرتا تو آپ داد دیتے۔ آپ نے یہ شعر پڑھ کر وہاں ایک طالب علم کو بلایا اور اسے تاکید کی کہ اس شعر کو بینر پر خوبصورت لکھوا کر مقتل کی دیوار پر لگوا دیں۔

مقتل سے عہد وفا کرنے کے بعد آپ واپس لاہور آگئے جب آپ کو چند احباب کے ساتھ "پیواڑ" جانا پڑا تو اداس چہرے کے ساتھ مزار پر پہنچے۔ قوم کو یتیم کرکے پتھروں کے نیچے سو جانے والے قائد کی آرام گاہ کے پاؤں کی جانب بیٹھے۔ دھاڑیں مار کر روئے اور مناجات کیں۔ آپ کو اپنے قائد کی شہادت کا بے حد دکھ تھا اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "شہید قائد کا خون ہماری گردنوں پر قرض ہے۔"

قائد کی مرقد کو بوسہ دینے کے بعد نڈھال نڈھال واپس لوٹے تو احباب سے فرمایا "حکمرانوں نے ہمارے قائد کو دو مرتبہ شہید کیا ایک مدرسہ میں قاتل نے گولی چلا کر اور دوسرا سازشیوں نے "پیواڑ" میں دفنا کر .... بڑا قاتل اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ قائد شہید کے جانشین کے ہاتھ مضبوط کیئے جائیں اور ان کے خط پر اپنا سفر جاری رکھا جائے" انشاء اللہ

ان کی یادوں کا اجالا انکی خوشبو کا سرور
ہجرتوں کے دشت میں رختِ سفر بن جائیگا

تحریک جعفریہ کی تیسری قیادت نے سفر کا آغاز کیا تو ڈاکٹر صاحب پہلے قدم سے ہمقدم ہوگئے۔ آپ کیلئے نئی قیادت کیساتھ چلنا' ان کے مزاج کو سمجھنا اور ان کی ترجیحات کا ادراک رکھنا قطعاً" مشکل نہ تھا جیسا کہ آپ کیلئے علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت کے ابتدائی ایام میں ہوا۔ آپ علامہ سید ساجد علی نقوی کے' قائد شہید کی قیادت کے زمانہ سے ہمرکاب تھے اور آپ دونوں شخصیات کو علامہ سید عارف حسین الحسینی کے اعتماد کی علامت سمجھا جاتا تھا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۸۸ء کو قائد شہید کے چہلم کے موقع پر "لیاقت باغ" راولپنڈی میں علامہ سید ساجد علی نقوی نے پہلی بار بحیثیت قائد ملت جعفریہ اپنے عوام سے خطاب فرمایا اور پہلے خطاب ہی میں ڈیرہ اسماعیل خان کے "روٹ" عزاداری کی بحالی کیلئے کال دے دی۔ آپ نے اسی موقع پر فرمایا کہ "جس طرح حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے امام بھائی کے مشن پر اپنے فرزندان "عون و محمد" قربان کیئے تھے انشاء

اللہ اسی طرح میں بھی اپنے دو صاحبزادے عون و محمد عزاداری سید الشہداءؑ کے راستہ میں قربان کروں گا"

قائد ملت جعفریہ نے حکومت پر واضح کیا کہ "اگر ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک ماہ سے رکے ہوئے روضے اور شبیہات اپنے مقررہ روٹ سے برآمد نہ کرائے گئے تو پھر ۳۰ ستمبر کو ملک بھر کے عزاداران حسینؑ تمام پابندیوں کو توڑ کر ماتمی جلوس نکالیں گے اور عاشور کے تمام تقاضے پورے کریں گے"۔

قائد کا اعلان سنتے ہی عوام نے "قائد کے فرمان پر جان بھی قربان ہے" کے نعرے بلند کیئے اور اجتماع کے اختتام پر، پرعزم اپنے گھروں کو لوٹے۔

قیادت کا اعلان جہاں عوام پر حجت بنا وہاں ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید نے اپنے قائد کی صدائے استغاثہ پر لبیک کہا اور "کربلائے ڈیرہ اسماعیل خان" کی منصوبہ بندی میں مصروف ہوگئے۔ آپ قائد سے مفصل پروگرام لیکر لاہور آئے اور آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے مرکز کو ہدایات دیں۔ مرکزی امور طے کر لینے کے بعد ۳۰ ستمبر سے چار روز قبل ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے۔ آپ نے وہاں کے قائدین اور آئی۔ایس۔او کے اہم برادران سے ملاقاتیں کیں اور صورتحال کا جائزہ لیا۔ آپ نے دیگر شہروں سے آئے ہوئے با اعتماد تنظیمی ساتھیوں کی ٹیمیں تیار کیں جنہوں نے مختلف روپ میں شہر بھر کے لوگوں، مخالف عناصر کی سرگرمیوں اور حکومتی اداروں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیا اور ڈیرہ کے جذباتی نوجوانوں کو دلائل کیساتھ قابو میں لایا۔ آپ نے فرمایا کہ "ہمارا مقصد بغاوت نہیں بلکہ مرکز کی پالیسی کے مطابق ہم پہلے مرحلہ میں مذاکرات سے مسئلہ کا حل چاہیں گے اور اس کے بعد پر امن احتجاج کریں گے"

بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر ان ایام میں نوجوانوں کے درمیان ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت نہ ہوتی تو وہ بہت کچھ کر گزرتے۔ میری زندگی کا یہ پہلا موقع تھا جب میں نے سفیر انقلاب کو قریب سے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ ان حالات میں مسلسل مصروف کار رہے۔ مرکز سے مسلسل رابطہ، مختلف شہروں کے قائدین سے صورتحال پر گفتگو اور ڈیرہ کے بزرگوں اور نوجوانوں کے اجلاس میں باقاعدگی سے

شہید قائد کے مزار پر نظریاتی رفقاء کے ساتھ قرآن خوانی کرتے ہوئے

شرکت اور انہیں مرکز کی پالیسی سے آگاہ رکھنا آپ کی مصروفیات تھیں۔

۲۹ ستمبر ۱۹۸۸ء کے روز جب ڈیرہ کو آنے والے تمام راستے سرحد حکومت نے بند کر دیئے اور ۳۰ ستمبر کے روز کرفیو کا اعلان کیا تو ڈاکٹر صاحب اپنی حکمت عملی کے تحت سینکڑوں افراد کو مقام مقررہ پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ یہاں بھی پولیس نے آپ کو گرفتار کرنے کی کوشش کی مگروہ کامیاب نہ ہو سکے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نے ہمیں اطلاع دی تھی کہ وہ ڈاکٹر نقوی کو محفوظ مقامات تک محدود رکھیں کیونکہ ان کی گرفتاری کیلئے خصوصی ٹیمیں روانہ ہو چکی ہیں۔ چونکہ مرکز کی جانب سے دو شخصیات علامہ سید افتخار حسین نقوی اور ڈاکٹر محمد علی نقوی تمام امور کے مسئول تھے اس لیئے خفیہ اداروں کی نگاہیں آپ پر مرکوز تھیں۔

یہ بات ڈاکٹر صاحب کے علم میں آچکی تھی کہ سرحد کا حکمران فضل حق قائد شہید کے قتل میں ملوث ہے اور وہ علامہ سید ساجد علی نقوی کے پہلے اعلان پر ضرب کاری لگانے کا فیصلہ کر چکا ہے لہٰذا آپ نے بااعتماد ساتھیوں کو آگاہ فرمایا کہ وہ ہر حادثہ کیلئے تیار رہیں۔ جہاں سے جلوس نے برآمد ہونا تھا وہاں آپ نے ایک ”منی اسپتال“ قائم کرایا جہاں طبی امداد کے تمام لوازمات رکھوائے۔ آپ نے اس موقع پر مختلف بلڈ گروپ رکھنے والے نوجوانوں کا گروپ تشکیل دیا تاکہ ایمرجنسی کی حالت میں زخمیوں کو خون فراہم کیا جاسکے۔

میں اس بات کا گواہ ہوں کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو صرف رہنما کی حیثیت سے ہدایات دیتے نہیں دیکھا بلکہ آپ ہر مشکل مرحلہ میں پہلے خود آگے بڑھے اور پھر نوجوانوں کو کھینچا۔ یہاں تک کہ جب جلوس نکالنے کا وقت آیا۔ آپ نے قائد محترم سے رابطہ کیا انہیں صورتحال سے آگاہ فرمایا اور ان سے ہدایات لیں۔ آپ قائد سے رابطہ کرکے نوجوانوں میں آئے تو فرمایا کہ ”قائد نے فرمایا ہے کہ علم عباس اٹھاؤ ..... قدم بڑھاؤ ...... امام زمانہ عجل اللہ فرجہ آپ کے حامی و ناصر ہوں“

آپ نے اس موقع پر نوجوانوں سے کہا کہ وہ جلوس کی روانگی سے پہلے دو رکعت نماز ادا کر لیں اور خدا سے اپنی نصرت کی دعا کریں۔ چنانچہ نوجوانوں کی کثیر تعداد نے نماز ادا کی۔ روضہ امام حسین علیہ السلام کی زیارت کی اور

کا نعرہ بلند کرتے ہوئے شہادت کیلئے تیار نظر آئے۔ آپ کی حکمت عملی سے صفیں درست ہوئیں۔ جب عصر کا وقت آیا تو ۱۴ اور ۲۷ کے قافلے علم عباسؑ اٹھا کر سڑکوں پر نکلے جن پر پولیس نے وحشیانہ فائرنگ کی۔ جس کے نتیجہ میں ۱۲ افراد شہید اور درجنوں زخمی ہوگئے۔ آپ نے لاشیں بھی اٹھائیں اور زخمیوں کو طبی امداد بھی فراہم کی۔ آپ نے ڈیرہ کا اسپتال ایک روز پہلے دیکھ لیا تھا اس لیئے ایمرجنسی میں آپ اپنے زخمیوں کے ساتھ اسپتال آئے اور ڈاکٹروں سے مفصل گفتگو کی۔

دوسری صبح جب شہداء کے لاشوں کو غسل و کفن دینے کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب اکثر شہداء کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیتے رہے۔ نماز جنازہ کیلئے صفیں درست ہوتیں تو آپ "الصلواۃ ... الصلواۃ" کی صدا دیتے اور نماز جنازہ کے اختتام پر یا حسینؑ ...... یا حسینؑ کے پر درد جملے بلند کرتے اور ماحول میں درد پیدا کر دیتے۔

جب ہم ایک شہید کا جنازہ اس کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلایا اور آہستہ سے کہا کہ "روٹ بحال کرنے کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ انشاء اللہ کل پرسوں آپ لوگوں کا روٹ بحال ہو جائیگا اور آپ حسب روایت نوحہ و ماتم کرتے ہوئے گزریں گے" البتہ مجھے یہ بات اپنی ذات تک محدود رکھنے کی تاکید فرمائی اور اپنی بھیگی ہوئی پلکوں سے شہید کے جنازہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "عزیز دوست دنیا کی طاقتور ترین چیز خون ہے" آپ کا یہ تاریخی جملہ سنا تو بے ساختہ خیال آیا۔

فوج حق کو کچل نہیں سکتی
فوج چاہے کسی یذید کی ہو
لاش اٹھتی ہے پھر علم بن کر
لاش جب بھی کسی شہید کی ہو

جب ڈیرہ شہر کی سڑکیں شہداء کے خون کی طاقت سے آزاد ہوئیں تو بھکر موڑ پر رکے ہوئے احباب ڈیرہ پہنچے جن میں برادر ثاقب نقوی نمایاں تھے۔ جنہوں نے بھکر موڑ پر قافلوں کے جذبات کو گرمائے رکھا تھا۔ رات کو ہماری نشست آئی۔ ایس۔ او ڈیرہ ڈویژن کے ڈویژنل صدر برادر ظفر انصاری کے گھر ہوئی جہاں ڈاکٹر صاحب نے احباب کے سامنے ڈیرہ کے عوام کے جذبات اور آئی۔ ایس۔ او کے برادران کی وفاؤں کو نہایت عمدہ الفاظ میں بیان فرمایا اس موقع پر آپ نے چند برادران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "ثاقب بھائی ان برادران کے ایک "ترانہ شہادت" نے مومنین کے جذبات کو عروج تک پہنچایا ہے۔ یقیناً ان برادران کا ترانہ سن کر رگوں میں خون کھولنے لگتا تھا۔ آپ نے ترانہ سنانے کی خواہش کی اور جب آئی۔ ایس۔ او کے ڈیرہ کے برادران مرکزی کنونشن کیلئے لاہور آئے تو آپ نے یہاں بھی ان سے ترانہ پیش کرنے کو کہا اور ان سے ترانہ سن کر فرمایا کہ "آپ برادران نے پھر سارا منظر ذہن میں دوڑا دیا ہے۔"

آپ اتنے بڑے سانحہ کے موقع پر بھی ہر ایک چیز پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ آپ نے برادران کا ترانہ سن کر محسوس کر لیا تھا کہ لہو کو گرمانے میں "ترانہ شہادت" کا اثر ہے چنانچہ آپ اس لیئے خواہش کا اظہار فرماتے تاکہ کسی بھی مرحلہ پر جذبات سرد نہ ہونے پائیں۔

اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ حواس پگھلا دینے والے ماحول میں آپ نہ صرف اپنے حواس کو برقرار رکھتے بلکہ آپ کا ہاتھ ہزاروں افراد کی نبضوں پر ہوتا تھا اور آپ مشکل ترین لمحات کی دھڑکنوں کو اپنی گرفت میں رکھتے تھے۔ قومی معاملات میں مذاکرات کرنے پر آتے تو بڑے بڑے بیورو کریٹس کے ذہن سُن کر دیتے... للکار نے پہ آتے تو فولادی لوگوں کے ماتھے سے پسینے کے نالے بہاتے۔ ہر قومی سانحہ کو کربلا سے تشبیہہ دیتے اور ہر کربلا میں کربلا کو زندہ کرتے اور ایسے مواقع پر فرماتے "حسینیوں کے مشکیزوں کا یزیدیوں کے تیروں سے پرانا رشتہ ہے"

قائم ہے اک روایت دیرینہ ظلم کی
بازو بدل گئے، کبھی خنجر بدل گئے

☆☆☆☆☆

تحریک کا سیاسی سفر اور سفیر انقلاب

گیارہ سال کے بعد ملک کے جسم پر لپٹی ہوئی آمریت کی چادر اتری تو تحریک جعفریہ نے دیگر سیاسی جماعتوں کی طرح جمہوریت کے استحکام کیلئے اپنا سیاسی کردار ادا کیا۔ نومبر ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات کا اعلان ہوا تو تحریک جعفریہ بھی بحثیت ایک سیاسی جماعت میدان سیاست میں اتری۔ چونکہ حالات کے پیش نظر تحریک کا کسی جماعت سے سیاسی الحاق نہ ہوسکا اسلیئے اسے اپنے پلیٹ فارم سے الیکشن لڑنا پڑا۔ تحریک نے ملک بھر کے حلقوں میں اپنے امیدوار نامزد کیئے تو علی رضا آباد لاہور کیلئے ڈاکٹر صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ آپ تحریک جعفریہ کی جانب سے ایم۔ پی۔ اے کے امیدوار ٹھہرے اور چند روز کنویسنگ کرنے کے بعد وہاں کے نواب رضا عباس قزلباش کے حق میں دستبردار ہوگئے۔ مگر انہیں تحریک کی حمایت کیلئے آماد کیا۔

بعض احباب کا خیال تھا کہ سیاست دان بننا ڈاکٹر صاحب کے مزاج کا حصہ نہیں تھا اور بعض احباب کی رائے تھی کہ اگر ڈاکٹر صاحب اپنے حلقہ انتخاب میں مصروف ہو جاتے تو پھر ملک بھر کے تحریکی حلقے منصوبہ بندی سے محروم رہتے۔ بہر طور آپ نے ذات کی بجائے قوم کے مفاد کو ترجیح دی اور تحریک کے صوبائی آفس میں بیٹھ کر تمام سیاسی حلقوں کی پلاننگ کی اور بعض حلقوں میں دورہ جات کرکے مخالفین کو ناکوں چنے چبوائے۔

آپ اس بارے میں بڑے واضح تھے کہ اس وقت تحریک جعفریہ ملک میں مروجہ نظام سیاست اور انتخابات میں کسی طور پر بھی فٹ (Fit) نہیں ہے۔ اگر چہ آپ پر واضح تھا کہ تحریک اپنے نام اور علیحدہ پلیٹ فارم سے ایوان تک نہیں پہنچ سکتی تاہم سیاسی میدان میں داخل ہونے پر آپ مطمئن تھے۔ فرماتے تھے کہ انتخابات کی کامیابی سے زیادہ کامیابی یہ ہے کہ برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار اہل تشیع کی نمائندہ جماعت اپنے پلیٹ فارم سے ملکی سیاست میں حصہ دار ہو رہی ہے اور اس انتخاب میں جو تجربہ حاصل ہوگا وہ ہماری آئندہ کی سیاست پر اثرات مرتب کرے گا۔

۱۹۸۸ کے انتخابات کے بعد ملک کے حالات یکسر بدل چکے تھے۔ نہ آمریت کی

سیاہ رات کا راج تھا نہ جمہوریت کے دن کا شباب .... تحریک جعفریہ جو آمر کے عوامل کا رد عمل تھی عمل کے خاتمے کے بعد اس کا رد عمل بھی سست پڑ رہا تھا اور اس کی کوئی سمت نمایاں نہ تھی۔ سیاسی سطح پر تحریک کو آمریت کی باقیات بھی سخت مخالف جانتی تھیں اور جمہوریت کے دعویدار بھی ان سے ناخوش تھے کہ تحریک ان کے ووٹ بنک کیلئے خطرہ ثابت ہوئی تھی اور وہ چند حلقوں میں اپنی شکست کا موجب بھی تحریک کو قرار دیتے تھے۔

تحریک کے پاس اپنے شہید قائد کے قاتلوں کی گرفتاری کا مطالبہ بذات خود ایک تحریک تھا چنانچہ جون ۱۹۸۹ء میں یہ خون ناحق مقتل سے نکل کر بازاروں میں بولا .... قاتل گرفتار ہوئے ...... انہوں نے اعتراف جرم کیا ..... صوبہ سرحد کا سابق حکمران فضل حق قاتلوں کا سرغنہ ٹھہرا تو ملت جعفریہ کے زخموں کی ٹیس درد بن کر اٹھی اور ملک میں بھونچال برپا کر گئی۔

ایسے میں سفیر انقلاب تڑپے اور قانونی راستوں سے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانے کی ٹھانی۔ آپ نے تحریک جعفریہ اور آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے کارکنان کو احتجاج کا لائحہ عمل دیا۔ لاہور میں بڑے بڑے مظاہرے کروائے اور تمام مظاہروں میں شریک رہے۔

ملت جعفریہ کے دباؤ کی بدولت جب سرحد کے حکمران کو سرحد کی زمین تنگ نظر آئی تو وہ پنجاب میں نواز شریف کے پہلو میں آبیٹھا۔ مگر یہاں بھی ڈاکٹر صاحب اور ان کے احباب کے دباؤ نے اسے کسی بل میں نہ گھسنے دیا۔ ان ایام میں ڈاکٹر صاحب کے احباب نے اس قدر جانفشانی سے کام کیا کہ انہیں فضل حق کے پل پل کی خبر موصول ہوتی رہی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اس وقت کے وزیر داخلہ اعتزاز احسن اور پولیس کے آئی۔ جی فضل حق کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کرتے مگر ڈاکٹر صاحب انہیں قاتل کی ہر لمحہ کی نقل و حرکت سے آگاہ کرتے۔

ایک مرحلہ پر جب فضل حق کا سالہ اور قتل کیس کا بڑا ملزم سینٹر ہاشم بھی پناہ کیلئے لاہور آیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کو نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جب اسے لاہور کی زمین تنگ نظر آئی تو وہ خوف کے مارے آزاد کشمیر بھاگا جہاں سے وہ سعودی

عرب نکل گیا۔ مگر اس دوران میں اس کی تمام خبریں ڈاکٹرصاحب کو موصول ہوتی رہیں۔

ان ایام میں قاتلوں کو انعام و اکرام دینے والا کیپٹن ماجد گیلانی ملک سے فرار تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے بیرون ملک اپنے احباب سے روابط استوار کرکے اس کے بارے میں معلومات لینے کی بھرپور کوشش کی اور یہ خبر ملک کے بڑے اخبارات میں بھی شائع ہوئی کہ تحریک جعفریہ کے کارکنان نے بیرون ملک بھی ماجد گیلانی کو تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔

جب پنجاب میں نواز شریف نے چند روایتی شیعہ رہنماؤں سے نوکریوں اور پلاٹوں کے عوض فضل حق کی حمایت میں بیان دلوائے تو ڈاکٹر صاحب پہ یہ بات گراں گزری اور آپ نے اپنے احباب کو ہدایت کی کہ وہ ان حضرات پر اپنی تشویش کا اظہار کریں۔ جب ایک مرحلہ پر حکومت پنجاب نے دو شیعہ افراد سے پریس کانفرنس کرانا چاہی تو ذرائع سے ڈاکٹر صاحب کو علم ہوگیا کہ آج حکومت پنجاب کا محکمہ اطلاعات و نشریات سرکاری اخراجات پر دو عام افراد سے فضل حق کی حمایت میں پریس کانفرنس کروا رہا ہے تو ایسے میں آپ نے ایک گروپ تشکیل دیا جس نے ہوٹل میں پہنچ کر نقلی رہنماؤں کو گریباں سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے سڑک پر لے آئے۔

حکومت کی مصلحت پسندانہ کاروائیوں کے پیش نظر جب ملتان میں شہید حسینی کے فرزندان نے صدر غلام اسحاق خان کی گاڑی کو احتجاجاً" روکا یا اسلام آباد کے مرکزی سیکرٹریٹ کو آئی۔ ایس۔ او کے نوجوانوں نے گھیرے میں لیا تو ملک بھر کے صحافیوں میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے ان دو بڑے واقعات کو اخبارات کی پیشانی پر لگایا۔ جب ان اقدامات کے بعد ڈاکٹر صاحب سے بات ہوئی کہ برادران نے بڑے جرات مندانہ اور شدید اقدامات کیئے ہیں تو آپ نے دو ٹوک الفاظ میں فرمایا "شہید قائد کا خون ہماری گردنوں پر قرض ہے یہ ہماری ملی عزت اور غیرت کا مسئلہ ہے اور عزت کے مسئلہ پر کبھی مصلحت نہیں ہوسکتی"

۱۹۹۰ء میں راولپنڈی کے رضویہ ہال میں شہید حسینی سیمینار منعقد ہوا جہاں ڈاکٹر صاحب کے خطاب سے قبل مجھے دعوت خطاب دی گئی۔ میں نے حالات کے پیش نظر

کچھ باتوں اور حقائق کو مفصل بیان نہ کیا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں حقائق بیان کرنے سے یہ بات ڈاکٹر صاحب کو ناگوار نہ گزرے کہ عوامی اجتماع میں اس قسم کے اظہار کا فائدہ نہیں تھا۔ مگر جونہی ڈاکٹر صاحب سٹیج پر تشریف لائے انہوں نے میری بات کا حوالہ دے کر ماجد گیلانی اور ملکی حکمرانوں کی نقاب کشائی کی اور تمام حقائق کی کڑیاں ملا کر سابق حکمرانوں کے کردار کو عریاں کیا۔ سیمینار کے اختتام پر ہماری ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے "ان حقائق سے بر ملا پردہ اٹھایا کریں اور قاتلوں کی رسوائی کیلئے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا کریں"

یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قائد شہید کے قاتلوں کی گرفتاری کیلئے چلائی جانے والی تحریک کے پیچھے ڈاکٹر صاحب کی حکمت عملی کار فرما تھی جسے قائد کے روحانی فرزندان نے عروج تک پہنچایا اور حکمرانوں کے ہاتھوں میں زنجیریں ڈلوائیں۔

۱۹۹۰ء میں تحریک جعفریہ کے سیاسی سفر میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب ٦ اگست کو صدر غلام اسحاق خان نے آئین کی آٹھویں ترمیم کے تحت بے نظیر بھٹو کی حکومت کو بدعنوانی کے الزام میں تحلیل کیا اور تین ماہ کے اندر عام انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ حالات کے پیش نظر اور ضرورتوں کے تحت پیپلز پارٹی کو تحریک جعفریہ کا سہارا لینا پڑا سیاسی اتحاد کیلئے ہونے والے مذاکرات کے روز اول سے پیپلز ڈیمو کریٹک الائنس (پی۔ ڈی۔ اے) کے قیام تک ڈاکٹر صاحب پیش پیش رہے۔ مذاکرات میں شامل احباب کا کہنا ہے کہ بے نظیر بھٹو سے ہونے والے مذاکرات کے دوران، ڈاکٹر صاحب کے دلائل اس قدر وزنی اور گفتگو اس قدر جامع ہوتی تھی کہ پی۔ پی۔ پی کی سربراہ کو کئی بار اعتراف کرنا پڑا اور اسے یہ کہنے کی نوبت آئی کہ ڈاکٹر صاحب آپ ہمارے ساتھ کام کرلیں"

جب تحریک جعفریہ، پیپلز پارٹی، تحریک استقلال اور مسلم لیگ (قاسم گروپ) کے اتحاد سے پی۔ ڈی۔ اے کا وجود عمل میں آیا اور انتخابات کیلئے یہ بڑا اتحاد اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلہ میں میدان میں اترا تو عوامی اور سیاسی حلقوں کا موضوع بن گیا۔

ایک سفر کے دوران میری ڈاکٹر صاحب سے گفتگو یوں شروع ہوئی۔

☆ ڈاکٹر صاحب یہ اتحاد کن بنیادوں پر ہوا ہے ....؟

○ ضرورت کی بنیادوں پر۔

☆ کس کی ضرورت زیادہ تھی؟

○ پی پی اس بار مخالف الائنس کے مقابلہ میں الائنس کے پلیٹ فارم پر انتخاب لڑنے کی خواہاں ہے جبکہ ہم بھی کسی الائنس کے بغیر سیاست نہیں کر سکتے تھے۔

☆ ہماری روحانی قیادت نے عورت کے ساتھ اتحاد کیسے کر لیا ہے کیا یہ عورت کی حکمرانی کو تسلیم کرنے والی بات نہیں ہے؟

○ یہاں سیاست اسلام کے تحت نہیں۔ آئین کے تحت ہوتی ہے۔ یہاں کوئی دینی جماعت اسلام کے مطابق سیاست نہیں کر سکی ...... ہماری قیادت نے عورت کو اپنا سربراہ تسلیم نہیں کیا ملک کا آئین عورت کو حکمران بننے کی اجازت دیتا ہے ہم اگر سیاست میں ہوں گے تو پھر رجعت پسندی ترک کرنا ہوگی۔

☆ کیا یہ اتحاد دیر تک قائم رہے گا؟

○ مشکل ہے۔

☆ اس کی کیا وجوہات ہیں؟

○ ہمارے لیئے بینظیر کے ساتھ اور اس کا ہمارے ساتھ چلنا مشکل ہے۔ ہم امریکہ کے کٹر دشمن ہیں جبکہ وہ امریکہ کی مخالفت مول نہیں لے سکتی ..... وہ آزاد خیال جماعت ہے جبکہ ہم اسلامی تقاضوں کے پابند ہیں۔ ہماری مذہبی مخالف جماعتیں دوسرے اتحاد میں ہیں۔ پی - پی کبھی نہیں چاہے گی کہ ہماری حمایت میں مولویوں کی مخالفت مول لے .... پی۔ پی کی قیادت تحریک کو مضبوط ہوتا برداشت نہیں کرے گی کیونکہ ہماری مضبوطی ووٹ کے حوالے سے اس کی کمزوری ہوگی۔

☆ پھر ہمیں اس اتحاد میں کیا فائدہ ہے؟

○ ہم فرقہ کی سطح سے اٹھ کر سیاست کی وسیع سطح پر پہنچے ہیں اور ملک کے بڑے سیاسی اتحاد میں اپنا تشخص بطور سیاسی جماعت پیش کیا ہے۔

☆ تحریک کا سیاسی مستقبل کیا ہے؟

○ دوسری مذہبی جماعتوں کی طرح سیاست میں "ان" (IN) رہیگی۔

☆ تحریک ملکی سیاست پر کیا اثرات مرتب کر سکتی ہے؟

○ اگر قدآور سیاسی شخصیات اس کے پلیٹ فارم پر آجائیں تو گہرے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں وگرنہ ووٹ بنک کے حوالہ سے اس کی اہمیت قائم رہیگی۔

☆ کس قسم کی سیاست تحریک کے حق میں رہیگی؟

○ تحریک کو فرقہ یا ہنگامی بنیادوں کی سیاست چھوڑنا ہوگی ایک طویل منصوبہ بندی کے تحت منزل تک پہنچنا ہوگا۔ عوامی حلقوں میں رفاعی کام کرنے ہوں گے جماعت اسلامی کی طرح اپنی سطح پر نظریاتی شخصیات تیار کرنا ہوں گی۔ حلقوں کی منصوبہ بندی کرنا ہوگی وغیرہ وغیرہ "Umberalla Organization" بننا ہوگا۔

اس معرکہ میں پی۔ ڈی۔ اے کے پلیٹ فارم پر ڈاکٹر صاحب نے گراں قدر خدمات سر انجام دیں انہوں نے تحریک استقلال کے سربراہ اصغر خان کے انتخابی حلقہ ۹۹ لاہور میں بھرپور ساتھ دیا انہیں کارکن مہیا کیئے ان کی کنویسنگ نہایت منظم انداز میں کی۔ آپ کے تنظیمی انداز، تحرک اور صلاحیتوں کو دیکھ کر اصغر خان کو آپ کی شخصیت کا معترف ہونا پڑا۔ انہوں نے سرگودھا کے ایک جلسہ میں کہا کہ "میں نے اپنی زندگی میں ڈاکٹر محمد علی نقوی جیسے باصلاحیت افراد بہت کم دیکھے ہیں" انہوں نے لاہور میں کہا کہ اگر میری جماعت کے پاس ڈاکٹر صاحب جیسے دو چار افراد ہوتے تو میں ملکی سیاست پر گہرے نقوش مرتب کرتا۔

پی۔ ڈی۔ اے کا سفر شروع ہوا۔ انتخابات ہوئے مخالف اتحاد نے کامیابی حاصل کی ..... یہاں تک کہ ۱۹۹۲ء میں نواز شریف کی حکومت معزول ہوئی ...... نگران حکومت قائم ہوئی تو تحریک جعفریہ کو اقتدار میں حصہ ملا ..... جب ۱۹۹۲ء کے انتخابات ہوئے تو گرین سگنل ملنے پر پی۔ پی۔ پی نے پی۔ ڈی۔ اے کو خدا حافظ کہا اور یوں تحریک کا سیاسی سفر ایک بار پھر جمود کا شکار ہوگیا۔

۱۹۹۲ء ایک ایسا سال تھا جس میں ڈاکٹر صاحب جیسے انتھک اور وقف انسان نے اپنی زندگی کو نئے ڈگر پر ڈالا۔ تقریبا" چھ سال بعد آپ نے پیشہ وارانہ ملازمت کرنے

کی ٹھانی اور ملک کے معروف اسپتال "شیخ زاید اسپتال اینڈ فیڈرل پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ لاہور" میں رجسٹرار کے عہدہ پر فائز ہوگئے۔

چونکہ یہ عرصہ ڈاکٹر صاحب کی خاموشی اور تنہائی کا زمانہ کہلاتا ہے اسلیئے اسے بیان نہ کیئے بغیر گزر جانا تاریخ سے بدیانتی اور حقائق سے چشم پوشی ہوگی۔

تاحال یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ سفیر انقلاب جیسا متحرک فعال اور تنظیمی کارکردگیوں کا محور شخص تحریک جعفریہ کے پلیٹ فارم سے دور کیوں ہوا ...... اس کی برق رفتاری میں یخ بستگی کیسے آئی ...... اس نے خود کو تحریک کی ذمہ داریوں سے لا تعلق کیوں گردانا ...... اور انہوں نے اپنی ذات کو اسپتال کی نوکری اور اپنے کلینک تک محدود کرنے کی کوشش کیوں کی؟

بعض احباب کا خیال ہے ڈاکٹر صاحب جیسے دیندار انسان کو تحریک جعفریہ کے پلیٹ فارم پر قومی مفادات سے زیادہ ذاتی مفادات کو مقدم جاننے والے چند افراد سے اختلاف تھا۔ بعض کی رائے ہے کہ تحریک کے بعض لوگ انکی شخصیت سے حسد کرتے اور انہیں مخصوص مفادات کی راہ میں پتھر سمجھتے تھے لہٰذا ان کی گروپ بندی نے ڈاکٹر صاحب کو دل برداشتہ کیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ وہ تحریک کے موجودہ "سیٹ اپ" (Set up) سے مطمئن نہ تھے۔ بعض سلجھے ہوئے افراد کا خیال ہے کہ وہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر "تحریک جعفریہ" کی محدودیت اور فرقہ کی بنیادوں پر سیاست کرنے کے حق میں نہ تھے اور بعض لوگوں کا گمان ہے کہ ان کو تحریک کی قیادت سے بعض معاملات پر اختلاف تھا۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب سمندر مزاج انسان تھے ان کی گہرائی تک پہنچنا بے حد مشکل ہوتا تھا۔ وہ رازوں کو اپنے سینے میں امانت کے طور پر رکھتے' زیادہ سوچتے اور کم بولتے تھے' وہ ہر بات کو زبان تک نہ لاتے' انہیں ہمیشہ ذات سے قوم زیادہ عزیز رہی ...... انہوں نے اپنی خاموشی کی وجہ نہ بتائی تو خیبر سے کراچی تک سوالات' اور شبہات ابھرے ہر شخص نے اپنی سوچ اور استطاعت کے مطابق سوچا مگر کسی کی سوچ کو مستند نہ سمجھا گیا۔

مجھ جیسے عقیدت رکھنے والے بے تکلف احباب نے آپ سے کبھی اس موضوع

پر بات کرنا بھی چاہی تو آپ نے عموماً" بات کا پہلو بدلا یا کبھی کسی شخصیت کا نام لیکر اختلاف کا جائزہ لینا چاہا تو انہوں نے سختی سے ڈانٹا۔ میں نے ان کی صحبت میں چھ سال گزارے میں یہ بات حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کی زبان سے کسی کی ذات کے بارے میں منفی جملہ تک نہیں سنا۔ نہ انہوں نے کسی کی غیبت کی اور نہ کسی سے حسد کی راہ اپنائی ....

ایک مرتبہ ہم دو چار احباب آپ کے کلینک پر بیٹھے تھے کہ آپ کے نہایت معتمد ساتھی نے ایک شخص کا نام لیکر کہا کہ وہ آپ کے بارے میں یوں کہہ رہا تھا۔ میں ذاتی طور پر اس بات کا گواہ تھا مگر آپ نے فرمایا "عزیز دوست آپ پر بھی مجھے جھوٹ بولنے کا گمان نہیں ہے مگر ان احباب سے بھی یہ توقع نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارا بلڈ گروپ (Blood Group) ایک ہے"

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ تحریک میں ایک گروہ نے آپ کی مخالفت کی اور تحریک ' آئی۔ ایس۔ او اور پاسبان اسلام جیسی تنظیموں میں آپ کا اثر زائل کرنے کی ہر ممکنہ سازشیں کیں۔

یہ اختلاف کن بنیادوں پر تھا اس کا جواب دو چار جملوں میں دینا شاید مشکل ہے البتہ طرفین کے کردار اور خدمات کا نقشہ سامنے رکھ کر جواب آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب بعض افراد کے کردار سے بے حد رنجیدہ تھے آپ نہ صرف تحریک کے گلستان کے نگہبان تھے بلکہ آپ نے اس چمن کی آبیاری کر کے اسے پروان چڑھایا تھا لہٰذا باغبان کی حیثیت سے اس کا تقدس مجروح ہوتا برداشت نہیں کرتے تھے۔ آپ کو بعض روحانی حضرات کے عدم خلوص کا شکوہ تھا مگر آپ نے کسی محفل میں برملا تنقید نہ کی البتہ ایک مرتبہ دوران سفر اس قسم کے کسی موضوع پر گفتگو ہوئی تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے چند احباب مایوس کن باتیں کرنے لگے جبکہ ڈاکٹر صاحب بڑی خاموشی اور سکون سے ڈرائیونگ میں مصروف رہے۔ باتوں باتوں میں موقع کی مناسبت سے کسی دوست نے شعر پڑھا کہ

دیار مصر میں دیکھا ہے ہم نے دولت کو
ستم ظریف پیغمبر خرید لیتی ہے

یہ شعر سن کر ڈاکٹر صاحب ایسے تڑپے جیسے ان کی تمام داستان بیان کر دی گئی ہو۔ آپ کی اس درد بھری تڑپ سے یہ تاثر ملا کہ آپ پیغمبرؑ کے چند پیغام بر حضرات کے بارے میں خاصے ملول تھے۔

آپ نے زندگی کے آخری لمحات تک قائد ملت جعفریہ علامہ سید ساجد علی نقوی کی بھرپور مشاورت کی اور کٹھن سے کٹھن حالات میں ان کے شانہ بشانہ رہے۔ آپ قائد کے خاص رفیق اور معتمد ساتھی سمجھے جاتے تھے۔ جس کا اظہار آپ کے جنازہ پر خطاب کرتے ہوئے قائد ملت جعفریہ نے فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب میرے بااعتماد رفیق تھے"

جس قدر آپ کو قائد سے عقیدت تھی اس طرح قائد بھی آپ سے محبت کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب تحریک کے مرکزی جنرل سیکرٹری کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو قائد صاحب نے اپنے احباب سے مشورہ کیا۔ جب بعض احباب نے ڈاکٹر صاحب کا نام تجویز کیا تو آپ نے فرمایا "انہیں دشمن کی نظروں سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے"

سفیر انقلاب نے جہاں تحریک جعفریہ کو مستحکم کرنے میں قیادت کے ہاتھ بٹائے وہاں ملت جعفریہ کی خدمات میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عزاداری سید الشہداء کے دفاع، ملت کی بقاء اور فلاح کیلئے شب و روز کام کیا۔ بڑے بڑے سانحات میں سینہ سپر ہوکر حوادث کا مقابلہ کیا فرقہ واریت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دشمن کے عزائم کو خاک میں ملایا۔ آپ کی حکمت عملی نے دشمن کے مذموم ارادوں کے رخ موڑے۔ ملک اور اسلام دشمن قوتوں نے اسلامیان پاکستان کو غیر ملکی امداد کے سہارے کچلنا چاہا تو آپ ان کے آگے چٹان بن گئے۔ اور مذہبی دہشت گردوں نے ملک کا استحکام تباہ کرنے کی کوشش کی تو آپ سوہنی دھرتی پاکستان کے محافظ ٹھہرے۔

آپ کی قومی خدمات کو قرطاس کے دامن میں سمیٹ لینا ناممکن ہے آپ نے

جب سے شعور سنبھالا آپ کا ہر قدم محمدؐ و علیؑ کی راہ میں اٹھا' آپ کے ہاتھ خدا کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھے' آپ بولے تو قوم کے حقوق کیلئے بولے آپ نے سوچا تو قوم کی فلاح کیلئے سوچا' آپ چلے تو قومی امور کی تکمیل کیلئے چلے' آپ بیٹھے تو قوم کی ترقی کا نقشہ بنایا۔ گویا آپ کی زندگی کا لمحہ لمحہ قوم کی خدمت میں گزرا۔

آپ نے طویل تنظیمی سفر کیا ...... پر کٹھن راستوں اور خاروں سے اٹی ہوئی راہوں سے گزرے ...... کئی بار موت کی وادیوں میں قدم رکھا ...... شکست و ریخت کے کئی مراحل سے گزرے ...... نہ کہیں ٹوٹے نہ کہیں بکھرے ...... نہ کہیں متزلزل ہوئے اور نہ نفس کو مصلحتوں کا شکار ہونے دیا ...... قدم قدم پر قربانیاں دیں جینا اور مرنا قوم کی خاطر کر دیا۔ جب تک زندہ رہے کربلا کے زخمی مسافر کی طرح بے قرار رہے اور کہتے رہے ۔

ظالموں کے ظلم کا کچھ سامنا کرنا تو ہے
زندگی پیاری سہی لیکن ہمیں مرنا تو ہے

☆☆☆☆☆

فلاحی امور اور سفیر انقلاب

ایک ایسا شخص جس کی تمام شعوری زندگی ملت کی فلاح کیلئے صرف ہوئی ہو اس کے چند فلاحی امور کا تذکرہ کرکے اگرچہ اسکی ذات کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکتا تاہم اس کی نظریاتی فوج کے سپاہیوں کیلئے نقوش کھینچے جاسکتے ہیں تاکہ وہ نقش پاء کی سمت سے اپنی منزل کا تعین کر سکیں۔

یہ بات دعویٰ سے کہی جاسکتی ہے کہ سفیر انقلاب نے شعور کی دہلیز پر قدم رکھنے سے لیکر شہادت کے معراج تک اپنی زندگی کا ہر لحہ فلاح کرنے' اور فلاح پانے والوں میں گزارا۔

ملت جعفریہ پاکستان کی قابل فخر طلباء تنظیم "امامیہ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پاکستان" کا قیام اور اس کا استحکام آپ کا پہلا فلاحی قدم تھا جس کے وجود سے نہ صرف ملت کے نوجوانوں نے فلاح پائی بلکہ انہوں نے معاشرہ کے اندر فلاحی پیغام عام کرکے ہزاروں افراد کو فلاح کے راستہ پر گامزن کیا۔

جب آپ طالب علمی کے دائروں سے باہر آئے اور قومی پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو آپ نے قوم کی بہبود کیلئے سوچنا شروع کیا۔ آپ کی اس سوچ کو پہلی سمت' لندن میں ملی جب آپ علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم کے ہمراہ "ورلڈ اہلبیتؑ لیگ لندن" کے اہم اجلاس میں شریک ہوئے۔ یہاں آپ کی ملاقات دنیا کے معروف سرمایہ دار جناب مصطفیٰ گوکل کراچی سے ہوئی۔ انہوں نے پاکستان کی تشیع اور اس کی صورتحال کے بارے میں آپ سے سوالات کئے۔ آپ نے قومی صورتحال واضح کرنے کے ساتھ ساتھ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے قیام اور اغراض و مقاصد کے بارے میں بھی انہیں آگاہ فرمایا۔ انہوں نے آپ کی اس تنظیم کے قیام کو بے حد سراہا اور استفسار کیا کہ

"What plan you have got for The educational development for the "Shia youth" in Pakistan"?

چونکہ ڈاکٹر صاحب اسی قسم کا کوئی پلان مرتب نہیں کر چکے تھے لہٰذا انہیں لگی

لپٹی کے بغیر بتایا کہ تاحال اس سطح پر کوئی کام شروع نہیں ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ ”آپ کی تنظیم پڑھے لکھے افراد پر مشتمل ہے لہٰذا آپ کو چاہئے کہ قوم کو دین کی طرف راغب کرنے کیلئے انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں تاکہ وہ آپ کے پیغام کو آسانی سے درک کر سکیں اور ملک میں ایک تعلیم یافتہ قوم کے حوالہ سے ان کی پہچان ہو“

جناب گوکل صاحب نے آپ کو سمت دینے کے ساتھ ساتھ اپنے تعاون کا مکمل یقین دلایا۔ انہوں نے علامہ سید صفدر حسین نجفی سے بھی اس بارے میں بات کی تو علامہ صاحب نے فرمایا کہ ”میں قوم کو دینی علم دینے کیلئے مدارس کے قیام کا آغاز کر چکا ہوں لہٰذا دنیاوی علم سے قوم کو بہرہ مند کرنے کیلئے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ موزوں نوجوان اور کوئی نہیں ہو سکتا“۔

آپ وطن لوٹے تو آپ نے علامہ سید صفدر حسین نجفی کے تعاون سے ملت جعفریہ پاکستان کے مکمل کوائف (Bio data) حاصل کرنے اور پھر اس کی سطح پر کام کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ۱۹۸۳ء میں ”شیعہ قوم کی ترقی“ کیلئے فلاحی منصوبہ پر کام کا آغاز ہوا۔

طے پایا کہ پاکستان کے چاروں صوبوں اور شمالی علاقہ جات سمیت قوم کی آبادی کا تناسب، ان کی اقتصادی، تعلیمی، سیاسی اور نظریاتی صورتحال کا جائزہ لیا جائے گا اور پھر ہر علاقہ میں وہاں کے تقاضوں اور ضروریات کے پیش نظر منصوبہ بندی کی جائے گی۔

اس جامع پلان کو ترتیب دینے اور اس کا واضح ڈھانچہ تیار کرنے میں برادر سید امجد علی کاظمی، برادر سید ثاقب نقوی، برادر احمد رضا خان اور سفیر انقلاب نے گراں قدر خدمات سر انجام دیں۔ جب ان نوجوان مفکرین نے اپنا یہ کام (File Work) علامہ صاحب کو دکھایا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو کراچی بھیجا جہاں آپ نے جناب مصطفیٰ گوکل سمیت بڑے بڑے شیعہ تاجروں اور سرمایہ داروں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنا منصوبہ پیش کیا۔

ان حضرات نے قومی فلاح کا یہ منصوبہ دیکھ کر نوجوانوں کی فکر اور محنت کو خراج تحسین پیش کیا اور ایک بار پھر اپنے تعاون کا اعادہ فرمایا۔

منصوبہ کی منظوری کے بعد پنجاب سے اس کام کا آغاز ہوا صوبہ بھر سے ڈاکٹر صاحب نے معتمد اور پر خلوص افراد کا انتخاب کیا اور انہیں ان سے متعلقہ علاقہ جات تفویض کیئے۔ ابتدائی سالوں میں اس پر حوصلہ افزا کام ہوا مگر ۱۹۸۴ء میں علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت کے بعد ملی امور اور ملکی صورت حال نے پہلو بدلا تو ترجیحات بھی بدل گئیں۔ اگرچہ اس پلان کی تکمیل نہ ہوسکی تاہم ملک کی شیعہ آبادی کے جمع شدہ گوشواروں سے قیادت نے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہیں قومی آبادی اور انکی صورتحال کا اندازہ لگانے میں دقت پیش نہ آئی اور اسی طرح علامہ سید صفدر حسین نجفی کو بھی دینی مدارس کے قیام میں خاصی مدد ملی۔

شیعہ قوم کی فلاح کا یہ منصوبہ اسماعیلی فرقہ کے پیشوا "پرنس آغا خان" کے فلاحی منصوبوں کی طرز کا تھا اور شیعہ عمائدین اپنی ملت کیلئے اسکولز، اسپتالز، فنی ادارے اور دینی مدارس قائم کرنا چاہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو عمر بھر اس بڑے منصوبہ کی عدم تکمیل کا ارمان رہا ایک مرتبہ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آخر اتنا خوبصورت منصوبہ کیوں تشنہ رہ گیا تو آپ نے فرمایا "ضیاء الحق کی حکومت، امریکہ کی ملک میں مداخلت اور قومی ذمہ داریوں نے ہمارا رخ موڑ دیا تھا اگر حالات پرسکون رہتے تو ہم اطمینان سے اس پلان کو منزل تک پہنچاتے۔ مزید فرمایا کہ ہمارے پاس وہ منصوبہ اور ڈھانچہ اب بھی موجود ہے انشاء اللہ ہم مناسب حالات میں اس پر کام کریں گے"

ان ایام میں علامہ سید صفدر حسین نجفی ملک بھر میں دینی مدارس کا جال بچھانے کیلئے عازم سفر ہوئے تو ڈاکٹر صاحب انکے ھمسفر رہے۔ شاید ہی ملک کا کوئی دینی مدرسہ ایسا ہو جو علامہ سید صفدر حسین نجفی کی محنتوں سے وجود میں آیا ہو اور سفیر انقلاب کا اسکی بنیادوں میں حصہ شامل نہ ہو۔ قومی آبادی کے تناسب اور وہاں کی صورتحال کا نقشہ سامنے رکھ کر علامہ صاحب علاقہ تجویز فرماتے اور ڈاکٹر صاحب وہاں کے مخیر حضرات سے رابطہ کرکے اس کیلئے فنڈز اکٹھے کرتے اور وہاں اپنے نظریاتی احباب کی ٹیمیں بنا کر علاقہ میں مدرسہ کی اہمیت کا احساس اجاگر کرتے۔

۸۸-۱۹۸۷ء میں جب تحریک جعفریہ کا شباب تھا ڈاکٹر صاحب نے محسوس کیا کہ

قومی مشکلات میں اضافہ کا باعث ملک کی "بیورو کریسی" ہے۔ ایک گاؤں کے مقدمات سے لیکر ملکی معاملات تک بیورو کریٹس کی گرفت مضبوط ہے۔ چنانچہ آپ کا یہ احساس ضرورت بن کر تڑپا کہ اس ملک میں انتظامی حوالہ سے مضبوط ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اپنے باصلاحیت اور لائق نوجوانوں کو اس طرف راغب کیا جائے۔ تاکہ تحصیل، ضلع، ڈویژن، صوبہ اور مرکز تک کے انتظامی اور عدالتی معاملات احسن طریقے سے حل ہو سکیں۔

اس فکر کو عملی جامہ پہنانے کیلئے آپ نے ملک بھر کے متعلقہ سرکاری اعلیٰ افسران سے روابط بڑھائے اور ان سے گزارش کی وہ اس معاملہ میں آپ کا ساتھ دیں۔ آپ کے احساس اور تڑپ کو دیکھ کر جب ماہرین نے حامی بھری تو آپ نے ملتان روڈ لاہور پر واقع ایک بڑی عمارت کرایہ پر لی اور ملک بھر میں اپنی تنظیموں کے ذریعہ اعلان کروایا کہ وہ طلباء جو مقابلے کے امتحانات کے خواہشمند ہیں آپ سے رابطہ کریں۔ انہیں امتحانات کی مکمل تیاری اور طعام و قیام کی تمام تر سہولیات مہیا کی جائیں گی۔ اس عمارت میں آپ نے طلباء کو ہر سہولت فراہم کی اور کئی طلباء آپ کے اس پروجیکٹ سے مستفید ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی آپ نے بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے حصول کے خواہشمند طلباء کے لیئے وظائف مقرر فرمائے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی ہر ممکنہ مدد کی۔ اس پروجیکٹ کے تحت آپ نے بیسیوں طلباء غیر ممالک بھجوائے جو آج بھی زیر تعلیم ہیں اور کچھ ملک میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ایک مرحلہ پر آپ نے محسوس کیا کہ قوم کا تعلیمی معیار حوصلہ افزاء نہیں ہے کیونکہ مقابلے کے امتحانات اور غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کے امیدوار بہت کم منظر عام پر آئے تھے۔ آپ اس نتیجہ پر پہنچے کہ قوم کے بچوں کی بنیادی تعلیمی سطح کمزور ہے۔ چنانچہ آپ نے اساس مستحکم کرنے کیلئے "اسلامک ایجوکیشن کونسل" کا قیام عمل میں لایا اور اس کے تحت "**المصطفیٰ ماڈل اسکولز**" کا اجراء فرمایا۔

اسکولز کے قیام کے وقت آپ کا بنیادی نظریہ تھا کہ اپنا پیغام پہنچانے کیلئے ضروری ہے کہ قوم تعلیم یافتہ ہو تاکہ وہ عہد حاضر کے تقاضوں کا صحیح ادراک کر سکے۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اپنی ملت کی فلاح کیلئے ''آغا خان یا مرزائی'' جو کام کر رہے ہیں ہم ان کا عشر عشیر بھی نہیں کر پائے۔ آج آغا خان کی قوم شمالی علاقہ جات میں خوشحال ہے کراچی میں ان کا بین الاقوامی معیار کا اسپتال اور میڈیکل کالج ہے اسی طرح جہاں جہاں انکی آبادی ہے وہاں تجارتی مراکز قائم ہیں۔ مرزائیوں کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنی قوم کی تعلیم کیلئے اپنا بجٹ تیار کرتے ہیں جس کے استعمال کے بعد وہ خاطر خواہ نتائج حاصل کرتے ہیں جبکہ آج تک ہماری قوم کا رخ اس جانب کوئی نہیں موڑ سکا۔

محرم ۱۹۹۰ء میں راقم نے ''ماہنامہ العارف'' میں گستاخ صفحہ کے عنوان سے ایک کالم لکھا جس میں قوم کے اذہان پر دستک دی کہ ''وہ عزاداری سید الشہداء پر جس قدر سالانہ بھاری بھر کم سرمایہ خرچ کرتے ہیں اور پیشہ ور ذاکرین جس بے دردی سے قومی سرمایہ لوٹتے ہیں اگر ملت جعفریہ کے یہ دونوں گروہ (بانیان و ذاکرین) یہ سوچ لیں کہ قیام پاکستان کے بعد سے تاحال ان کے پاس نہ کوئی اسپتال ہے نہ کالج و یونیورسٹی .... نہ کوئی فنی ادارہ ہے اور نہ کوئی فلاحی ٹرسٹ ..... وہ عزاداری کو جاری رکھیں اس لیئے کہ اس میں ہماری بقاء ہے مگر وہ نمود و نمائش کیلئے نہیں بلکہ ثواب کیلئے مجالس منعقد کرائیں

دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اگر صرف پانچ سال کیلئے قوم کے بانیان مجالس لاکھوں کی بجائے ہزاروں خرچ کریں اور ذاکرین عظام ہزاروں کی بجائے چند سینکڑوں پر گزارا کر لیں تو ملت جعفریہ پاکستان کے پاس ملک میں وہ سب کچھ ہوگا جو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے پاس ہوتا ہے۔ ''جب قومیں مضبوط ہو جاتی ہیں تو پھر ملک کی حکومتیں ان کی محتاج رہتی ہیں''

ڈاکٹر صاحب نے جب یہ صفحہ پڑھا تو ایک ملاقات کے دوران میں داد دی اور فرمایا ''عزیز دوست یہ وہ فکر ہے جس کیلئے ہمارا دل خون رو رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عزاداری کا سلسلہ اس سے بھی زیادہ مستحکم ہو مگر انداز میں تبدیلی ہونی چاہیئے۔ کہنے لگے کہ آج کل معروف ذاکرین اور روایتی علامہ حضرات کے نرخ مقرر ہیں دس سے پندرہ ہزار تک مومنین ایک مجلس کا انہیں معاوضہ دیتے ہیں اور پھر تشہیر کیلئے اتنا ہی

اشتہارات و اخبارات میں خرچ کرتے ہیں۔ گویا ایک بڑے خطیب پر تقریباً" چالیس پچاس ہزار روپیہ خرچ ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارا عزادار بھائی ثواب حاصل کرنے کی نیت سے مجلس منعقد کرائے اور اپنے علاقہ کے اہل علم' صاحب تقویٰ عالم دین کو مدعو کرے تو شرکاء کو بھی بہت کچھ حاصل ہو جائیگا اور ہزار دو ہزار میں مجلس کے انتظامات بھی مکمل ہو جائیں۔

اسی طرح اگر ہماری قوم کی فکر بیدار ہو جائے تو ہم تعلیمی اداروں اور اسپتالوں کا جال بچھا دیں گے۔ جہاں سے قوم کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ملک کے اہم عہدوں پر فائز ہوں گے اور صحت کے حوالے سے بھی قوم امراض سے محفوظ رہیگی۔"

یکم جنوری ۱۹۹۳ء کی شب ڈاکٹر صاحب نے ایک محفل میں فرمایا کہ ہماری قوم کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ ملک میں ان کی آبادی کا تناسب کیا ہے اور پھر ہر سال ہماری قوم کے کتنے بچے' جوان' بوڑھے' امراض کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ میرے پاس شمالی علاقہ جات کی شیعہ آبادی کا نقشہ موجود ہے۔ میں نے وہاں یہ اخذ کیا ہے کہ ہر سال سینکڑوں افراد لقمہ اجل بن جاتے ہیں' کچھ معذور اور اپاہج ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم لوگ اپنی قوم کے بچوں کیلئے حفاظتی ٹیکوں کا اہتمام کریں' اپنی آبادیوں میں فری اسپتالوں کا آغاز کریں تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ ہم اپنی آبادی میں اضافہ کا باعث نہ بن سکیں اور ملک میں اکثریتی آبادی کے ہم پلہ نہ ہوں"

آپ جس گہرائی سے قوم کے بارے میں سوچتے تھے وہاں تک سوچنا بھی ہمارے حدوں سے باہر ہے۔ آپ نے فرمایا میں جہاں تک کر سکتا ہوں اور جہاں تک میرے وسائل اور میرے مربین میرا ساتھ دیتے ہیں میں کرتا ہوں۔ اور جب تک زندگی نے وفا کی آخری سانس تک قوم کی خدمت کرتا رہوں گا۔

آپ نے قوم کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کیلئے لاہور' ملتان' بھوانہ جھنگ' اٹک' ماڑی انڈس میانوالی اور شمالی علاقہ جات میں اسکولز کھولے جو اس وقت تمام مسلمانوں بچوں بالخصوص ملت جعفریہ کے نونہالوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت فراہم کر رہے

ہیں۔ آپ نے بتایا کہ شمالی علاقہ جات میں ہمارے ایک اسکول کا "آسٹریلیا" کے سیاحوں نے دورہ کیا تو وہ پاکستان کے ایک گاؤں میں اتنا معیاری اسکول دیکھ کر حیران رہ گئے اور انہوں نے اپنے ملک کی ایک "فلاحی آرگنائزیشن" کے ذریعہ اس سکول کو پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔

شمالی علاقہ جات میں جہاں خواتین کی فلاح کیلئے حکومت کی جانب سے بھی اقدامات صفر ہیں وہاں ڈاکٹر صاحب نے لڑکیوں کیلئے اسکولز کھولے اور دستکاری سنٹر قائم کیئے۔ آپ نے وہاں کے عوام کیلئے ایک ٹیکنیکل کالج کے قیام کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیئے وسائل بھی اکٹھے کر لیئے تھے مگر افسوس کہ آپ کی زندگی نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور یہ منصوبہ تشنہ رہ گیا۔

زندگی کے آخری سال میں آپ نے شمالی علاقہ جات کی تعلیم و ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ایک روز میں آپ کو شیخ زاید اسپتال ملنے گیا تو آپ اس وقت کوئی منصوبہ سوچ رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں پنسل اور میز پر سفید کاغذ پڑا ہوا تھا جس پر آپ لکیریں کھینچ رہے تھے۔ میرے استفسار پر آپ نے پر مسرت چہرے سے فرمایا کہ "آج بہت اچھا منصوبہ ذہن میں آیا ہے" وہ بلتستان کی تعلیمی صورتحال کو بہتر بنانے کیلئے ہے۔ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ

"Baltistan Educational Support Trust" کا منصوبہ ذہن کے کینوس پر ابھرا ہے جسے ہم (BEST) کا نام دے سکتے ہیں۔

۱۹۹۴ میں تحریک جعفریہ نے شمالی علاقہ جات میں حکمران جماعت کو جس انداز میں شکست دی اور وہاں کی بڑی جماعت کے حوالے سے تاریخی کامیابی کے پرچم گاڑے اس میں بلاشبہ وہاں کے علماء اور قیادت سے عقیدت کا تعلق ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہاں ڈاکٹر صاحب جیسے محسن ملت شخص نے گذشتہ پانچ سات سالوں سے فلاحی کام کیئے ہوئے تھے جنہوں نے وہاں کے عوام کے دل جیتے اور یہ کامیابی آپ کی محنت کا ثمر ٹھہری۔

شمالی علاقہ جات میں ڈاکٹر صاحب نے درجنوں فلاحی پروجیکٹ شروع کیئے جسکی چنداں وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ وہاں نوے فیصد آبادی اہل تشیع ہے۔ دوم وہاں

ضیاء الحق نے اپنے دور حکومت میں تعصب کی بنا پر اس کثیر آبادی کو نظرانداز کیا جبکہ اس کے برعکس وہاں کی دوسری آبادیوں کو سہولیات دیکر انہیں انتظامی امور تھمانے کی کوشش کی۔ ضیا دور میں یہاں تک بھی ہوا کہ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں شمالی علاقہ جات کے طلباء کیلیئے مخصوص نشستوں پر غیراہل تشیع کو کھپانے کی سازشیں کی گئیں اور ملازمت میں بھی انہیں ترجیح دینے پر اکتفا کیا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی قیادت اور دیگر صاحب ثروت قومی افراد کے تعاون سے وہاں پر حکومت کے ہم پلہ کام کرنے کی کوشش کی۔ برادر وجاہت حسین جعفری جو ان کاموں میں آپ کے ہمرکاب رہے نے بہت پیارا جملہ کہا کہ "وہ کام جو کسی ملک کی حکومت کرتی ہے ڈاکٹر صاحب جیسے ایک شخص نے سرانجام دیے"۔

۱۵ مارچ کو آپ نے لاہور کے دل میں ہائی اسکول کا افتتاح کرنا تھا مگرے مارچ کو آپ شہید کر دیئے اور یوں تعلیم کا یہ معیاری منصوبہ بھی تشنہ رہ گیا۔

قوم کے بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں' وہ ملک کے کلیدی عہدوں پر متمکن ہوں' ان کے ہاتھ میں ملک کے انتظامی امور کی ڈور ہو' وہ ملک کی ترقی اور اس کی سرحدوں کے مخلص محافظ ہوں اور ان پر قوم و ملک نازاں ہو یہ آپ کی سوچ کا عکس ہے جس کیلیئے آپ مسلسل متحرک رہے۔

آپ کا نظریہ تھا کہ قوم کے وہ بچے جو دیہاتوں سے تعلق رکھتے ہیں وہ تعلیمی سمت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ وہ اپنا ہدف مقرر کیئے بغیر' یا اپنی منزل کا تعین کیئے بغیر محنت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ بے سمت ہونے کے سبب اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس حقیقت کو عملی جامہ پہنانے کیلیئے آپ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے سالانہ کنونشن کے موقع پر ملک بھر سے آئے ہوئے طلباء کو "مستقبل کی راہیں" (FUTURE PLANNING) کے عنوان سے نہایت پرمغز اور معلوماتی لیکچر دیا کرتے تھے۔

اس لیکچر میں آپ کے سامنے ایک نقشہ ہوتا تھا اور آپ اس نقشہ کی مدد سے طلباء پر واضح کرتے کہ پاکستان کا تعلیمی ڈھانچہ کیا ہے .....؟ یہاں مروجہ نظام تعلیم کیا ہے .....؟ یہاں کونسی تعلیم دی جاتی ہے ....؟ میٹرک کرنے کے بعد تعلیم کی کتنی راہیں نکلتی ہیں اور اسی طرح ایف۔ اے' ایف۔ ایس۔ سی' بی۔ اے' بی۔ ایس۔

سی، ایم۔اے، ایم۔ ایس۔ سی یا کوئی ٹیکنیکل یا پروفیشنل تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک طالب علم کو کیا کرنا چاہیئے؟۔

آپ نے اپنی اس عظیم ذمہ داری کو صرف ایک سالانہ (لیکچر) تک محدود نہ رکھا بلکہ قوم کے بچوں کی رہنمائی کیلیئے "امامیہ گائیڈنس بیورو" (Imamia Guidance Bureau) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو ملک بھر کے قومی بچوں کیلیئے ان کی تعلیمی راہیں مشخص کرنے میں مصروف عمل ہے۔

سفیر انقلاب نے ملت کے مستحق مگر لائق طلباء کیلیئے وظائف کا سلسلہ شروع کیا جس کے تحت قوم کے ہزاروں بچے اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوئے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے، اگر وظائف کا ریکارڈ دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ملت کے وہ بچے جن کا خدا کی ذات کے علاوہ کوئی سہارا نہ تھا اور وہ مالی زبوں حالی کے باعث ایک قدم آگے بڑھنے کی استطاعت بھی نہ رکھتے تھے ڈاکٹر صاحب کے تعاون سے انہوں نے ملک کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور خوشحال خاندانوں میں شامل ہوئے۔

ایک مرتبہ ایک مفلوک الحال خاندان کا بچہ ایف۔ ایس۔ سی میں اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوا اور وہ میڈیکل کالج کے داخلہ کے معیار پر پورا اترا مگر اس کے والدین مجبور تھے کہ اسے جلدی اسکول ٹیچر بنائیں تاکہ گھر کی ہنڈیا چڑھتی رہے اور دیا بھی جلتا رہے، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس بچے کے والدین سے نہ صرف بچے کے اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ فرمایا بلکہ بچے کی تعلیم مکمل ہونے تک انہیں بھی مالی تعاون کا یقین دلایا۔

یہ بات وثوق سے کی جاسکتی ہے کہ اس وقت بھی ملت کے بیسیوں بچے ایسے ہیں جنہیں آج تک معلوم نہیں ہوسکا کہ ان کی امداد کے پیچھے کس "خضر" کا ہاتھ تھا۔

۱۹۸۹ کی بات ہے کہ سید اعجاز علی شاہ جو اس وقت "جعفریہ ویلفیئر فنڈ" کے مرکزی مسئول ہیں سے میری ملاقات ہوئی۔ اسی وقت سید صاحب جعفریہ ویلفیئر فنڈ کا نظریہ لیئے عوام کو قائل کر رہے تھے۔ تحریک کے دفتر میں ہونے والی اس ملاقات کے دوران میں نے ان سے سوالات کیئے۔ ایک مرحلہ پر میں نے ان سے پوچھا کہ شاہ صاحب کیا یہ ممکن ہے کہ قوم کے خمس کی رقم سے آپ سارے منصوبے چلالیں گے،

میرا یہ سوال سن کر شاہ صاحب نے میز پر اپنی ہتھیلی ماری اور دعویٰ کرتے ہوئے کہا "اگر ڈاکٹر محمد علی نقوی میرا ساتھ دے دیں تو میں اگلے پانچ سالوں میں قائد ملت جعفریہ کو اتنا فنڈ مہیا کروں گا کہ نہ کوئی مومن بھوکا سوئے گا اور نہ کسی مومن کی بچی ہاتھ پیلے کرنے کیلئے پیسوں کی محتاج رہیگی"

آخر وہی ہوا کہ جب ڈاکٹر صاحب نے ساتھ دینے کی حامی بھری تو قیادت نے ادارہ قائم کرنے کی اجازت دے دی اور آج "جعفریہ ویلفیئر فنڈ" قومی خدمت کا بے مثالی ادارہ بن چکا ہے۔ جس کی حالیہ رپورٹ کے مطابق اس ادارہ نے گذشتہ تین ماہ اپریل، مئی جون ۹۵ کے عرصہ میں خطیر رقم قومی فلاح پر خرچ کی ہے۔

سید اعجاز علی شاہ صاحب کی خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب ان کے ہمراہ ملک گیر دورہ کریں اور قوم کو خمس کی ادائیگی کیلئے مائل کریں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی بے پناہ مصروفیت کے باعث شاہ صاحب کی خواہش کے احترام سے قاصر رہے تاہم انہوں نے مارچ کے اواخر میں دورہ جات کی حامی بھرلی تھی۔

۲۴ فروری ۱۹۹۵ جمعتہ الوداع کے روز یوم القدس کے جلوس اور جلسہ میں مال روڈ لاہور پر میری سید اعجاز علی شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے سڑک کے دوسرے پار کھڑے، ڈاکٹر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مخصوص انداز میں فرمایا "بچیا! ڈاکٹر صاحب نے دورے کرنے کا وعدہ فرمایا ہے انشاء اللہ تم اگلے سال "جعفریہ ویلفیئر فنڈ" کی ترقی دیکھنا۔" اس موقع پر شاہ صاحب نے عادتاً" مخصوص شعر بھی پڑھا۔

تجسیم رسالت میں بس دو ہی تو چیزیں ہیں
سرمایہ خدیجہؑ کا اور خون ابو طالبؑ

ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں لاہور کے ایک صاحب ثروت مومن سے ملاقات کی اور انہیں "جعفریہ ویلفیئر فنڈ" کی افادیت اور اہمیت سے آگاہ کیا۔ جب انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے منصوبہ سے آگاہی حاصل کی تو انہوں نے فرمایا "چونکہ

میں نے اپنی دو صاحبزادیوں کی شادی پر چھیالیس لاکھ روپے خرچ کیئے ہیں لہٰذا میں قوم کی بیٹیوں کی شادی کیلئے اتنی ہی رقم پیش کروں گا"

اس عظیم شخصیت کو ڈاکٹر صاحب کی ذات پر اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی امور تک آپ کے حوالے کر دیئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب قوم کی فلاح کیلئے جو منصوبہ بھی تیار کرتے وہ شخصیت مالی حوالے سے آپ کا بھرپور تعاون کرتی یہاں تک کہ انہوں نے قومی فلاح کیلئے ڈاکٹر صاحب کو چار لاکھ روپے ماہانہ دینے کا سلسلہ شروع کیا جس کے سہارے سفیر انقلاب نے قومی فلاح میں انقلاب برپا کر دیا۔

غیر ملک میں مقیم لاہور کی ایک اہم شخصیت نے آپ کو ایک کروڑ روپے سالانہ دینے کا وعدہ کیا اور انہوں نے یہ شرط عائد کی کہ آپ اپنی ملازمت ترک کر کے بقیہ تمام عمر قوم کے فلاحی امور میں صرف کریں۔ آپ نے ان سے آخری میٹنگ میں طے کیا کہ آپ اسپتال کی نوکری سے استعفا دے دیں گے۔ آپ نے اپنا استعفا پیش کیا تو اسپتال کے چیئرمین نے منظور نہ کیا۔ تاہم آپ نے اپنے معتمد احباب کے تعاون سے درج ذیل چار اہم امور کا آغاز کیا۔

۱۔ تعلیم ۲۔ صحت ۳۔ روابط ۴۔ سماجی خدمت

تعلیم کے بارے میں آپ کا نظریہ تھا کہ تعلیم سب کیلئے ہو اسے بہتر مگر بامقصد ہونا چاہیئے۔ اسلیئے آپ کے قائم کردہ تمام اسکولوں میں نصاب کے علاوہ قرآن مجید اور دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بچہ میٹرک کا امتحان دے کر معاشرے میں آتا ہے تو وہ شرعی مسائل سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔

صحت کے بارے میں آپ کی رائے تھی کہ علاج سے زیادہ حفظ ماتقدم کو بہتر بنایا جائے تاکہ انسان کو بیماری بستر تک ہی نہ لائے۔ نہ اسکا پیسہ خرچ ہو اور نہ وقت ...... اس سلسلہ میں آپ دیہاتوں میں طبی سنٹرز کے قیام کے خواہاں تھے۔

روابط کے شعبہ کے ذریعہ آپ ملک بھر کی شیعہ اعلیٰ شخصیات جو ملک کے انتظامی، عدالتی، تعلیمی، دفاعی اور سیاسی شعبوں سے منسلک تھیں سے مستحکم روابط کے خواہاں تھے۔ آپ کی خواہش تھی کہ ملکی نظام پر کسی نہ کسی طور گرفت رکھنے والے حضرات سے تعلقات کی زنجیریں مضبوط ہوں تاکہ وطن عزیز میں ہونے والے حالات

سے مکمل آگاہی رہے اور اس کی بابت میں اپنا لائحہ عمل ترتیب دیا جاسکے۔

سماجی امور کے شعبہ کے ذمہ آپ نے یہ ذمہ داری تفویض کی کہ وہ ملک بھر میں سماجی امور پر کام کرنے والے بڑے بڑے اداروں کا دورہ کریں ان کے طریقہ کار کو سمجھیں ہر شعبہ کی اچھی اچھی کارکردگیوں کو مجتمع کریں اور ان کی روشنی میں بھرپور طریقے سے قومی و سماجی امور کو انجام دیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے اس شعبہ کے مسئولین کو تاکید فرمائی کہ وہ نئے اداروں کے قیام سے قبل قوم کے ان اداروں کو تقویت پہنچائیں جو پہلے سے اس شعبہ میں مصروف کار ہیں۔ چنانچہ آپ نے ملک کے کئی ایک قومی اداروں کو لاکھوں روپے دیئے اور ان شعبوں کو فعال بنایا۔

آپ نے اسی شعبہ کے تحت "امداد فاؤنڈیشن" کا قیام عمل میں لایا جو تاحال طلباء کو وظائف، بیوگان، مستحقین کی مدد اور یتیم و نادار لڑکیوں کی شادی بیاہ کے اخراجات میں تعاون کر رہا ہے۔

تمام فلاحی منصوبوں میں سفیر انقلاب کا ترجیحی منصوبہ تعلیم تھا اور اس کی مسئولیت بھی آپ کے ذمہ تھی۔ ایک روز آپ نے فرمایا کہ میری دلی خواہش ہے کہ ہماری مجالس میں جب کوئی خطیب منبر پر آئے تو وہ اپنے خطبہ کے بعد یہ کہے کہ "مومنو ! تعلیم بہت ضروری ہے" آپ کا نظریہ تھا کہ تعلیم دینی ہو یا دنیاوی ہر حال میں ملت جعفریہ ایک باعلم قوم ہو۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "باب العلم کے ماننے والوں کا تشخص بھی علم ہونا چاہیئے۔" یہی وجہ تھی کہ آپ نے دنیاوی تعلیم کیلئے اسکولز، اکیڈمیاں اور انسٹی ٹیوٹ کھولے جبکہ دینی تعلیم کیلئے علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم کا بھرپور ساتھ دیا اور ان کی رحلت کے بعد ان کے قائم کردہ کئی ایک دینی مدارس کی ممکنہ حد تک مدد کرتے رہے مگر کبھی اپنا نام استعمال نہ کیا بلکہ خطوط یا امدادی چیک پر "امداد فاؤنڈیشن" کے ایک ملازم کا نام لکھا کرتے تھے۔

ایک دفعہ آپ احباب کے ساتھ کراچی جا رہے تھے روہڑی اسٹیشن پر پہنچے تو خیال آیا کہ مولانا صفدر حسین صاحب نے یہاں دینی مدرسہ کا افتتاح کیا تھا چنانچہ آپ روہڑی اسٹیشن پر اترے اور مدرسہ دیکھنے چلے گئے۔ آپ نے مدرسہ کا جائزہ لیا اور پھر دوسری ٹرین کے ذریعہ کراچی پہنچے۔ کراچی کے اجلاس سے فارغ ہوئے تو بلوچستان کے

کسی بیابان علاقہ میں قائم ہونے والے مدرسہ کی رپورٹ لینے چلے گئے۔

آپ واپس لوٹے تو فرمایا کہ اگر وہاں مدرسہ قائم ہوگیا تو دس سے بیس طلباء داخل ہونگے۔ آپ کی یہ بات سن کر کسی دوست نے کہا دس بیس طلباء کے علاقہ میں لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے جواباً کہا۔

"عزیز دوست ! اندھیرے میں جگنو کی روشنی کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ ایسا علاقہ جہاں لوگ اپنے شرعی مسائل سے بھی نابلد ہیں وہاں مدرسہ کا قیام ایک الٰہی شمع کے مترادف ہے"۔

ایک مرتبہ علامہ سید صفدر حسین نجفی مرحوم صوبہ سرحد کے کسی دور دراز علاقہ میں شیعہ آبادیوں اور وہاں پر دینی مدارس کے قیام کی ضرورت و اہمیت کا جائزہ لینے گئے تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا ہمسفر منتخب کیا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت ڈاکٹر صاحب نے ایک تنظیمی ساتھی کو شریک سفر کر لیا۔ جب یہ درد کا مختصر قافلہ پہاڑوں کے درمیان پہنچا تو علامہ صاحب کو وضو کیلئے پانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب قریب قریب پانی میسر آنے کی کوئی صورت نہ نکلی تو علامہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لوٹا تھمایا کہ "جاؤ جہاں سے ملے پانی لے آؤ" ڈاکٹر صاحب دوڑتے گئے اور کہیں دور سے پانی لے آئے۔ جب علامہ صاحب کی خدمت میں آپ نے پانی پیش کیا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز شفقت میں فرمایا "لولے ہا ! میں نے تمہارا نام محمد علی اسلیئے رکھا تھا کہ "مجھے یقین تھا کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علیؑ کے مشن کی تکمیل کیلئے پہاڑوں کو سر کرو گے"

آپ کی دلی خواہش تھی کہ ملت جعفریہ کی ایک ایسی یونیورسٹی ہونی چاہئے جس میں بچوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم میسر ہو۔ اس سلسلہ میں جب آپ نے پروفیسر طاہر القادری کے ادارہ "منہاج القرآن" لاہور کا دورہ کیا تو آپ نے اس پروجیکٹ کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے علمائے کرام کو بھی اس قسم کے اداروں کا اجراء کرنا چاہئے تاکہ کالجز' یونیورسٹیز اور دینی مدارس کے طلباء کے درمیان آج تک جو فاصلے قائم ہیں وہ دور ہوں۔

فلاحی اداروں کا قیام اور ان کا استحکام آپ کی دلی خواہش تھا اس سلسلہ میں آپ

نے نہ صرف ادارے تشکیل دیے بلکہ کئی ایک کمزور اداروں کو مستحکم کیا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو یا تو خود کام کرنا چاہیئے یا کام کرنے والوں کا ہمکار ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ فلاحی کام کرنے والے حضرات کی بے حد حوصلہ افزائی فرماتے۔

آپ کی عادت تھی کہ جو بڑا کام کرنے لگتے اس کے آغاز سے قبل گردوپیش، ماضی و حال پر خوب غور کرتے۔ آپ نے فلاحی میدان میں قدم رکھا تو اندرون اور بیرون ملک تمام فلاحی اداروں سے روابط استوار کیئے۔ آپ نے بیت المال پنجاب اور اسلام آباد میں سے این۔ جی۔ اوز (Non Government Organi Zations) کے پتہ جات لیئے اور دنیا بھر میں ان سے رابطہ کرکے ان پر واضح کیا کہ "امداد فاؤنڈیشن" پاکستان کا ایک فلاحی ادارہ ہے جو دیگر فلاحی اداروں کا تعاون کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ آپ کے خط کے جواب میں بیسیوں این۔ جی۔ اوز نے آپ کے جذبات کو سراہا اور آپ سے مربوط رہے۔

سفیر انقلاب اسماعیلی فرقہ کے پیشوا آغا خان کے فلاحی پروگرام "آغا خان رورل سپورٹ پروگرام" (Agha Khan Rural Support Program) سے بے حد متاثر تھے۔ آپ نے اس پروگرام پر مرتب ایک وڈیو فلم "First Harvest" دیکھی تو بے ساختہ تڑپ اٹھے اور کئی مقامات پر اس کا تذکرہ کیا کہ ایک چھوٹا سا فرقہ کس قدر تیزی سے اپنے افراد کی فلاح کیلیئے کوشاں ہے۔

اس فلاحی پروگرام کے طریقہ کار کو جانچنے کیلیئے آپ نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے فارغ التحصیل ایک نوجوان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ آغا خان کے پروجیکٹ میں رضاکارانہ کام کرکے اس کا انداز (Way of work) اور ان کے روابط کا جائزہ لے، اس طرح کئی ایک ایسے فلاحی ادارے تھے جن میں نوجوان رضاکارانہ طور پر کام کرکے ان کی گہرائی کا جائزہ لیتے اور ان کی خصوصیات اور کامیابی کے رازوں کو ڈاکٹر صاحب تک پہنچاتے جن کی روشنی میں آپ اپنی قوم کی فلاح کیلیئے منصوبہ سازی کرتے۔

شمالی علاقہ جات میں جہاں شیعہ آبادی زیادہ ہے وہاں پر غربت بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ آپ جہاں ان کی فلاح کیلیئے اقدامات کر رہے تھے وہاں اس بات پر بھی گہری نظر

رکھے ہوئے تھے کہ کوئی ملکی یا غیر ملکی ادارہ یہاں فلاح کے بہانے مذموم مقاصد میں کامیاب نہ ہونے پائے۔

آپ نہ صرف اندرون ملک قومی خدمات کرنے والوں کا مالی اور فکری تعاون فرماتے بلکہ بیرون ملک بھی چند ایک حضرات کو سپورٹ کرتے۔

ایک مرتبہ برادر سجاد حسین میکن زیارات کیلئے عراق جانے لگے تو آپ نے انہیں ایک خط اور رقم کا لفافہ تھمایا اور کہنے لگے کہ نماز عصر کے وقت حرم حضرت علی علیہ السلام پر فلاں خدوخال کا ایک نوجوان عالم دین نماز پڑھانے آئے گا اسے یہ خط اور لفافہ دے دینا۔ جب برادر موصوف نجف پہنچے تو خدوخال کے تعارف پر اس شخصیت تک جا پہنچے۔ برادر نے عراقی نسل کے اس نوجوان کو جب خط دیا تو وہ بے حد خوش ہوئے ڈاکٹر صاحب اور علامہ سید عارف حسین الحسینی کی خیریت دریافت کی اور کہنے لگے کہ میں کل سے ان شخصیات کو یاد کر رہا ہوں مجھے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ جب برادر موصوف نے واپسی پر ڈاکٹر صاحب سے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا کہ "وہ عبد خدا قوم کیلئے ایک بہت بڑا فلاحی کام کر رہا ہے" (غالباً" وہ تحریری سطح پر قوم کی خدمت میں مصروف تھے)۔

۱۹۸۵ میں آئی۔ ایس۔ او پاکستان کا سالانہ پروگرام ترتیب دیا جانے لگا تو آپ نے احباب سے فرمایا کہ یوں تو آپ کے تمام کام قوم کی فلاح کیلئے ہیں مگر آپ کو بالخصوص ان دیہاتوں میں عوامی خدمت کرنی چاہیئے جہاں لوگ صحت کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ اس سلسلہ میں آئی۔ ایس۔ او کے مختلف ڈویژن میں طبی کیمپ منعقد ہوئے جن کی آپ نے ڈاکٹروں اور دوائیوں کے ذریعہ بھرپور مدد کی آپ خود بھی ان کیمپوں میں تشریف لے گئے۔ حسب استطاعت خدمت کی اور برادران کی بے حد حوصلہ افزائی فرمائی۔

عاشور کے روز امام عالی مقام کے سجدہ آخر کو خراج عقیدت پیش کرنے اور جلوس عزاداری میں نماز باجماعت ادا کرنے کا عظیم کارنامہ سفیر انقلاب کی روحانی اور نظریاتی فکر کا رہین احسان ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ ہم امامؑ کے جس سجدہ کو یاد کرکے نوحہ و ماتم کرتے ہیں وہ ہم سے قضا نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے آئی۔ ایس۔ او

پاکستان کے کارکنان کے ذریعہ ملک بھر کے جلوسہائے عزاداری کے دوران میں نماز باجماعت ادا کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ جہاں ملک بھر میں آپ کے فیصلہ کو عملی جامہ پہنایا گیا وہاں آپ نے ۹ محرم الحرام کو لاہور کے مرکزی جلوس میں نماز کی ادائیگی کو آخری شکل دی۔ آپ کا یہ پروگرام انتظامیہ کو ناگوار گزرا اور اسلام پورہ لاہور میں آپ کے ساتھیوں پر لاٹھی چارج کیا گیا۔

انتظامیہ کے تشدد کے باوجود آپ نے میدان نہ چھوڑا بلکہ وہاں پر موجود کمشنر لاہور عمر آفریدی کو للکارتے ہوئے کہا "تم نے نمازیوں پر لاٹھی چارج کروا کر اسلام دشمنوں کی یاد تازہ کی"

آپ کی جرات اور آپ کے نوجوان ساتھیوں کے جذبات دیکھ کر دوسرے روز کمشنر نے آپ کو اپنے دفتر بلایا اور عاشور کے جلوس میں نماز نہ پڑھنے کی اپیل کی مگر آپ نے اس کی اس تجویز کو نہ صرف مسترد کیا بلکہ فرمایا "مجھے یہ سن کر دلی دکھ ہو رہا ہے کہ ایک مسلمان افسر اسلامی ملک میں نماز کا اہتمام کرنے کی بجائے رکاوٹ ڈال رہا ہے۔ ہم اسلام کے معاملات میں مصلحت کو اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔"

۱۹۹۰ میں محرم الحرام کی مجلس سننے آپ لٹن روڈ لاہور گئے جہاں امام بارگاہ کے گیٹ کے سامنے "حسین بلڈ ڈونرز" "Hussain Blood Doners" کے زیر اہتمام خون اکٹھا کرنے کا کیمپ لگایا گیا تھا۔ آپ کافی دیر تک ان کے ساتھ کھڑے مختلف فلاحی کاموں پر گفتگو کرتے رہے۔ مجلس کے اختتام پر آپ ایک "بک سٹال کے قریب کھڑے ہوئے تو بہت سے نوجوان آپ کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ آپ نے باری باری تمام برادران سے خیریت دریافت کی اور فرمانے لگے کہ جن برادران نے یوم عاشور زنجیر زنی نہیں کرنی انہیں چاہیئے کہ وہ امام حسین علیہ السلام کی راہ میں خون کا نذرانہ ضرور دیں۔ آپ نے تاکید فرمائی کہ نیکی میں پہل کرنے کیلئے آپ احباب "بلڈ کیمپ" میں جائیں اور انہیں خون دیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا خون کسی انسان کی زندگی کو بچانے کا سبب بنے گا اور خداوند کریم بصدقہ حسین علیہ السلام آپ کو اجر عطا فرمائے گا"

یہاں ایک دوست نے آپ سے دریافت کیا کہ "کیا حسین بلڈ ڈونرز" والے

خون کے عطیات صرف شیعوں کو دیتے ہیں .....؟ تو آپ نے فرمایا "انسانیت کی بات کریں خود کو شیعت کے دائرے میں محدود نہ کریں۔ ہمارے امام عالی مقامؑ شہید انسانیت ہیں شہید شیعیت نہیں"

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اپنی قوم سے محبت اور ان کی خدمت کا جذبہ ایک فطری عمل ہے اور فطرت سے انکار کرنا جھوٹ ہوتا ہے مگر ہم کسی فرقہ سے نفرت نہیں کرتے ہمیں صرف مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہونے تک بھی محدود نہیں رہنا چاہئے بلکہ ہمیں تو اس غیر مسلم انسان کی بھی خدمت کرنی چاہئے جو بے یار و مددگار غم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو۔ ہمیں انسانیت کے لئے کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے"

اگرچہ آپ ملت جعفریہ کے ایک عظیم فرزند ہونے کے ناطے اپنی ملت کی خدمت میں مصروف عمل رہے تاہم زندگی بھر آپ نے کسی دوسرے مسلمان سے تعصب نہ کیا۔ آپ کی زیر نگرانی چلنے والے اسکولز میں بیسیوں بچے اہل سنت ہیں۔ میں نے بذات خود چار ماہ تک آپ کے ایک اسکول میں بچوں کو تعلیم دی ہے۔ آپ جب بھی اسکول آتے تمام اساتذہ کو تاکید کرتے کہ آپ اسکول میں خود کو استاد کی حیثیت سے متعارف کرائیں' آپ کی ذمہ داریاں ایک عظیم معلم کی ہونی چاہئیں۔ آپ کے کسی قول یا فعل سے تفرقہ کی بو تک نہیں آنی چاہئے۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کے کسی جملے سے دیگر مسلمان بچوں کے شفاف ذہنوں پر کوئی خراش تک آئے

آپ کے اسکولز میں شیعہ سنی ٹیچرز موجود ہیں ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں ایک نوجوان آیا اور اس نے مدرس کے لئے آپ کو درخواست دی اور ساتھ اظہار کیا کہ وہ شیعہ ہے۔ آپؒ نے جواباً فرمایا "میرے عزیز! میں اسکولز کی تعلیم میں شیعہ سنی کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے زیر تعلیم سینکڑوں بچوں کا مفاد عزیز ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں ماہر مدرس کی ضرورت ہے۔ بے شک اس کا تعلق کسی فرقہ سے ہی کیوں نہ ہو۔ تعلیم کسی فرقہ کی محتاج نہیں بلکہ ہمارے امام اولؑ کا فرمان ہے کہ "علم مومن کی گم گشتہ میراث ہے جہاں ملے اسے حاصل کرو"

آپؒ کے کلینک پر دو ملازمین اہلسنّت تھے اور آپ ان کا دیگر نوجوانوں سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ آپؒ نے ملک کے معروف اسپتال میں ایک بے روزگار ڈسپنسر کو خط دے کر بھیجا اور وہاں پر تعینات شیعہ افسر سے اس کی ملازمت کی سفارش کی اور تاکید کی کہ یہ اہل سنت بھائی ہے اس کا کام ضرور کر دیں۔

اپنے ہم مسلک ایک سابق وزیر سے ایک سنی نوجوان کی ملازمت کی سفارش کی تو اس نے حیرانی سے اپنے دوسرے دوست سے کہا کہ "میں یہ سوچتا بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر نقوی اپنے دیگر مسلمان بھائیوں پر بھی اس قدر مہربان ہے۔ اسی طرح آپ نے بیسوں اہل سنت نوجوانوں کے روزگار میں معاونت کی۔ آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ "یہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں ان کا بے روزگا رہنا معاشرے کے لئے بہتر نہیں ہے۔ معاشرہ میں جتنی بیماریاں پیدا ہوئی ہیں ان میں بے روزگاری سرفہرست ہے۔ للہذا ضروری ہے کہ معاشرہ میں امن کے قیام کے لئے بلا تفریق مذہب و مسلک خدمات سرانجام دینی چاہئیں"

ایک مرتبہ لاہور میں آپؒ کی زیر نگرانی چلنے والے اسکول میں ایک عیسائی طالب علم نے داخلہ لیا جس پر بعض اساتذہ کو اعتراض تھا مگر آپؒ نے فرمایا "وہ پاکستان کا شہری ہے اور رب کریم کا خلق شدہ انسان ہے۔ للہذا تعلیم حاصل کرنا اس کا حق ہے اور اس سے یہ حق چھیننا ظلم ہے" آپ نے تاکید فرمائی کہ اس سے دیگر بچوں کی طرح سلوک کیا جائے اور کسی مقام پر انسانیت کی تذلیل نہ ہونے پائے"۔

آپؒ کی شہادت کے دوسرے روز ہنجروال لاہور جہاں آپ کا ذاتی اسپتال ہے کے معززین آپؒ کی تعزیت کرنے کے لئے آئے تو کہنے لگے کہ ہمیں کل پتہ چلا ہے کہ ڈاکٹر صاحب شیعہ رہنما تھے۔ وہ تو خدا ترس انسان تھے' ہماری آبادی کے غریب لوگوں سے فیس تک نہ لیتے بلکہ مدد بھی فرماتے تھے۔ وہاں آپ نے اہل سنت کے بیسیوں بچوں کے وظائف جاری کئے اور کئی یتیم بچیوں کے لئے جہیز تک کی مدد کی۔

آپؒ کے پڑوسی اہلسنّت گھرانوں نے اس بات کی تصدیق کہ کہ ڈاکٹر صاحب ان کے بچوں کو ماہانہ پانچ صد روپے تک وظیفہ دیتے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی امداد کی وجہ سے ان کے بچے اچھے اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں۔

برملا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ سفیر انقلاب کو خلوص اور قومی درد نے آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ انہوں نے تمام عمر انتہائی سادہ لباس پہنا' بہت کم کھایا' اور بہت کم سوئے۔ چشم بینا رکھنے والے افراد آج بھی شاہد ہیں کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو دوسروں کے جسم ڈھانپنے' دوسروں کے پیٹ بھرنے اور دوسروں کو آرام بخشنے کی کوشش میں مصروف پایا۔ یہ ان کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ صاحب ثروت لوگ ان کی ہتھیلی پر کروڑ روپے رکھتے' ان کے نام کو اعتماد کی علامت سمجھتے اور خدا کی ایک عظیم نعمت سمجھ کر ان کا احترام کرتے۔

آپؒ کی شہادت کے چند روز بعد قوم کی فلاحی کمیٹی کے لئے کروڑوں روپے دینے والے محسن ملت جب عرب امارات سے لاہور تعزیت کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ "میری نظر میں اس وقت ملک بھر میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جسے میں ڈاکٹر محمد علی نقوی شہیدؒ کے خلوص' قومی درد' تقویٰ اور خدا پرستی کا نعم البدل قرار دوں"

اس موقع پر ایک سینئر تنظیمی ساتھی نے واقعہ سنایا کہ ڈاکٹر صاحب نے انہیں قومی سروے کرنے کے لئے لاہور اسٹیشن سے روانہ کیا تو خدا حافظ کہتے وقت فرمایا "عزیز دوست یہ رقم جو آپ کی اخراجات کے لئے دی گئی ہے میری ذاتی نہیں یہ مال امامؑ اور ایک محسن ملت کا ایثار ہے۔ دوران سفر میں کھانا ایسا نہ کھانا جو معمول سے ہٹ کر ہو' ہوٹلوں کے قیام سے حتی المقدر گریز کرنا' وقت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے اس کے استعمال کے ساتھ انصاف کرنا' مقاصد کے حصول کے لئے رقم کے خرچ میں کنجوسی نہ کرنا ...... مگر اے دوست میری عزت کا خیال رکھنا"

سفیر انقلاب چونکہ گوشت پوست کے انسان تھے اور زمانہ میں رہتے تھے اس لئے زمانے والوں نے ان پر الزامات لگائے۔ پیغمبروں کے کردار پر اٹھنے والی انگلیاں ان پر بھی اٹھیں ...... بہتانوں کے سنگ ان کے سر پر بھی پھینکے گئے مگر وہ ان قباحتوں سے بے نیاز اپنے سفر میں مصروف رہے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ (TRUTH NEEDS NO PROOF) "سچائی کو ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی"

ہزار تہمتیں دنیا نے بخش دیں اس کو
وہ آدمی تھا مگر چپ رہا خدا کی طرح

☆☆☆☆☆

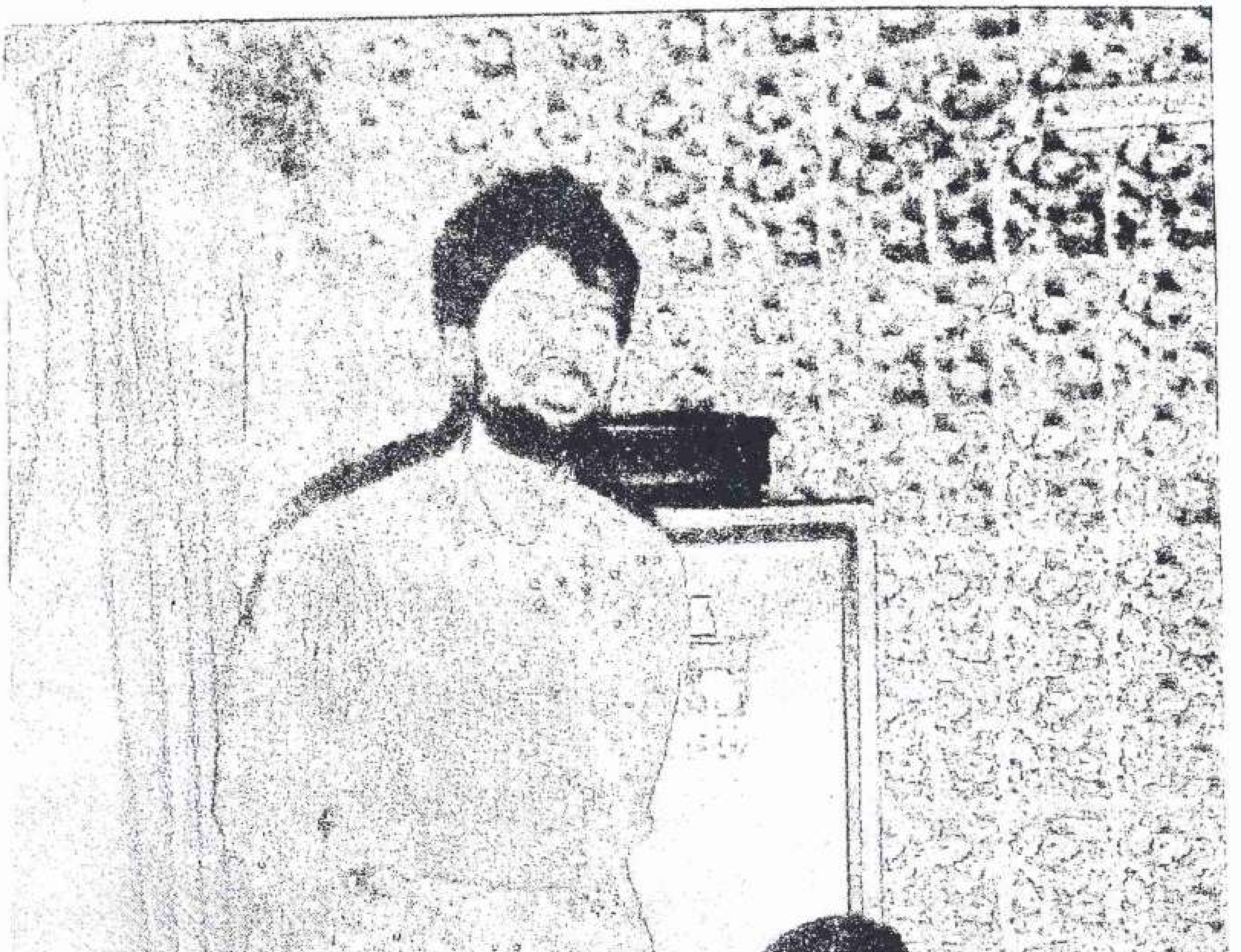

اپنے پیارے بیٹے دانش کے ہمراہ مستقبل کی سوچوں میں گم

سفیر انقلاب اور افراد سازی

یہ بات دعویٰ سے کی جا سکتی ہے کہ اگر وطن عزیز پاکستان کے کونہ کونہ میں ملت جعفریہ سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت اور باکردار نوجوانوں کا رشتہ تلاش کیا جائے تو بالواسطہ یا بلا واسطہ ان کے معمار ڈاکٹر محمد علی نقویؒ ہی نظر آتے ہیں۔ آئی۔ ایس۔ او کا بنیادی رکن ہو یا کوئی مرکزی رہنما .... گمنام ہو یا نامور شخصیت، ہر ایک سے سفیر انقلاب کی شخصیت کا اثر جھلکتا ہے۔ ۲۳ سالہ اس تنظیم کے جتنے اہم رہنما تحریک جعفریہ کے ماتھے کا جھومر ہیں یا ملت کی آبادی میں بہت بلند نظر آتے ہیں وہ تمام کے تمام سفیر انقلاب کے زخمی ہاتھوں کے تعمیر کردہ ہیں۔

یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ کوئی انسان اپنے جیسے انسان پر مثبت اثرات اس وقت مرتب کرتا ہے جب اس کے افعال اس کے اقوال کی تفسیر بنتے ہیں۔ دلوں پر حکمرانی اس وقت قائم ہوتی ہے جب کوئی انسان خود کو پیغمبروں اور آئمہ اطہارؑ کی سیرت کے قالب میں ڈھالتا ہے اور افراد سازی کا شرف بھی اسے حاصل ہوتا ہے جو خود سازی کی منزلیں طے کرتا ہے۔

اگر کسی اہل فکر و نظر کے ذہن میں یہ سوال انگڑائی لے کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید بظاہر ایک عام انسان تھے۔ وہ فقیہ تھے نہ مجتہد .... وہ روحانی پیر تھے نہ حکمران .... مگر آپ کی شخصیت کا طلسم باشعور نوجوانوں پر بھلا کیسے طاری ہے ......؟ تو اس کا جواب بڑا سادہ ہے کہ سفیر انقلاب نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے سے شہادت کی معراج تک خود کو سیرت معصومین علیہ السلام کے سانچے میں ڈھالا، اسلام آپ کا اوڑھنا بچھونا ٹھہرا، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آل محمدؑ کا دین آپ کے خون کے ایک ایک ذرہ میں اس قدر شامل ہوا کہ آپ کے جسم کے ہر مسام سے خلوص اور دینداری کی خوشبو محسوس ہوئی۔ خدا کا دین آپ کا آئین اور محمدؐ و آل محمدؑ کی شریعت آپ کا دستور سمجھی جاتی تھی۔

اگرچہ آپ عالم دین نہ تھے مگر کئی علما کرام آپ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے .... آپ مقلد تھے مگر مجتہد آپؒ کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تھے ....

آپؒ پیروکار تھے مگر بڑے بڑے پیر آپ ؒ کی پیشانی چومتے تھے .... آپ ؒ عوام سے تھے مگر ملک کے حکمران آپ ؒ سے مذاکرات کے دوران انگلیاں منہ میں دبائے آپ ؒ کی ذہانت پر متحیر رہتے تھے۔

سفیر انقلاب جس غیر معمولی مقام پر پہنچ کر اپنوں کے لئے قابل تقلید اور دشمنوں کی آنکھوں کا کانٹا بنے وہ مقام انہوں نے طویل ریاضت کے بعد حاصل کیا۔ انہوں نے ۲۳ سالہ تنظیمی مسافت میں پیٹ پر پتھر باندھ کر اپنا سفر جاری رکھا ان کے جسم پر ملبوس تھکن ان کے سفر میں حائل ہوئی نہ آبلہ پائی نے ان کی رفتار کو متاثر کیا۔ انہوں نے سفر کے آغاز میں جس جنبش سے پہلا قدم بڑھایا زندگی کے اختتام تک اس میں شدت پیدا کی۔ آپ ؒ جس عزم سے عازم سفر ہوئے اسے پختگی کے ساتھ انجام تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی آپ ؒ کے قدموں کے نشان سلامت ہیں اور آپ کی انتھک جدوجہد زندہ جاوید بن چکی ہے۔

ماضی کی تاریخ کی روگردانی کی جائے یا بزرگوں سے عظیم لوگوں کے حالات سنے جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں عظیم لوگ موجود رہے ہیں۔ جن کا تقویٰ اور جدوجہد زماں و مکاں کے حوالے سے مثالی تھا۔ یہاں تک کہ بعض روحانی شخصیات نے اس قدر تقویٰ اپنایا کہ وہ ”متقی“ معروف ہو گئے۔ مجھے یہ بات لکھنے میں قطعاً کوئی عار نہیں کہ میں نے جہاں تک سنا' تاریخ سے حاصل کیا یا اپنی آنکھوں سے دیکھا' مجھے پاکستان کی تاریخ میں ملت جعفریہ کا کوئی غیر عالم شخص ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید ؒ کے پایہ کا نظر نہیں آیا۔ کسی غیر عالم کیلئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا ہے کہ آپ کی مجلس ترحیم سے خطاب کرتے ہوئے چند علماء نے برملا کہا کہ ”ڈاکٹر نقوی کئی علماء سے بہتر تھے۔“

اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے خود سازی کے تمام مراحل طے کئے ہوں گے مگر خود سازی کے ساتھ ساتھ افراد سازی کا شرف اگر کسی مجاہد کو حاصل ہے تو وہ سفیر انقلاب کی ذات ہے۔

یہ بات بڑی واضح ہے کہ آپ نے تنظیم کے دائرے میں عام نوجوانوں کی طرح جذباتی قدم نہیں رکھا بلکہ آپ روز اول سے اپنے نظریہ میں واضح (CLEAR) تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آپؒ کو تنظیم میں شمولیت کی دعوت نہیں دی گئی بلکہ آپؒ دعوت دینے والوں سے ملتے ہی اسی گروہ میں شامل ہوگئے۔

ابتدائی ایام میں آئی۔ ایس۔ او کے بانیان صرف امامیہ طلباء کو اپنے پلیٹ فارم پر اکھٹا کرنے میں مصروف عمل تھے اس وقت ڈاکٹر محمد علی نقویؒ واحد نوجوان تھے جو اپنے مکتب تک محدود نہ تھے بلکہ اسلام اور اس کے تقاضوں پر سیر حاصل بحث کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب درسگاہوں میں سوشلزم کا خاصا چرچا تھا اور طلباء اسلام سے بیزار دکھائی دیتے تھے۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب اپنے امامیہ طلباء کو بالخصوص اسلام کے آفاقی نظریہ سے آگاہ فرماتے تھے اور اسلام اور سوشلزم کے بنیادی اختلافات پر دلائل سے گفتگو کرتے تھے۔

یہ شرف بھی سفیر انقلاب کی ذات کو حاصل تھا کہ آپؒ آئی۔ ایس۔ او کے پہلے نوجوان تھے جو باریش اور عالم زادے تھے۔ آپؒ کا گھرانہ کٹر مذہبی تھا۔ آپ کی گھریلو تربیت میں والدین کے علاوہ آپؒ کی پھوپھیوں کا گہرا عمل دخل تھا۔ آپؒ کی پھوپھیاں گھر میں دیگر تمام افراد سے زیادہ متقی اور پرہیزگار تھیں۔ چنانچہ آپ ایک ایسے ماحول کے پروردہ تھے جو اسلام سے شعوری وابستگی رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ اپنے نظریہ' ہدف' یا مقصد پر زندگی کے آخری لمحہ تک قائم رہے۔

چونکہ آپ کا تعلق ایک عالم گھرانے سے تھا اس لئے آپؒ نے آئی۔ ایس۔ او کو نہ صرف علماء کے قریب لایا بلکہ اسے علماء کی سرپرستی میں چلایا۔ آپ کا نظریہ تھا کہ جس طرح اسپتال کے لئے ڈاکٹرز کا ہونا ضروری ہے اسی طرح اسلامی تنظیم یا تحریک کے لئے علماء کا میرکارواں ہونا ضروری ہے۔ آپؒ اپنی اس فطری سوچ و فکر کے پیش نظر تنظیم کے ہر پروگرام میں علماء کو موٹر سائیکل پر لے آتے اور طلباء کی کردار سازی کرتے۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اساس جس قدر مستحکم ہوگی عمارت اس قدر دیرپا ہوگی' جسم ایک عمارت کی مانند ہے اور اس کی اساس سوچ ہے۔ جو طالب علم بنیادی طور پر اپنے اہداف میں واضح اور زندگی کی حقیقت سے آشنا ہوگا وہ زیادہ دیر تک تنظیم سے مربوط اور ملک و ملت کیلئے سود مند ثابت ہوگا"

آپؒ اپنے احباب کو ہمیشہ تاکید کرتے تھے کہ وہ نئے طلباء کو تنظیم میں دعوت

دیتے وقت جذباتی گفتگو یا جذباتی تاریخی واقعات کا سہارا نہ لیں بلکہ قرآن مجید یا فرمودات آئمہؑ کی روشنی میں ان پر اپنے اغراض و مقاصد واضح کریں۔ جب آپ سے سوال کیا جاتا تھا کہ آخر وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر آئی۔ ایس۔ او کے بانی یا سینئر برادران تنظیم سے مربوط نہیں ہیں تو آپ مختصر جواب دیتے کہ "نظریہ کی عدم پختگی اور روابط کا عدم تسلسل اس کی بنیادی وجوہات ہیں"۔

ایک محفل سے خطاب کرتے ہوئے آپؒ نے فرمایا کہ جذباتی طور پر تنظیم میں شامل ہونے والے احباب کی مثال طوفان کی طرح ہے جیسے وہ زور دار انداز میں اٹھتا ہے اور حالات کو زیر و زبر کرنے کے فوراً بعد ختم ہوجاتا ہے۔ اس طرح تنظیمی احباب کربلا، عزاداری یا دیگر چند زاویوں سے متاثر ہو کر تنظیم میں وارد ہوتے ہیں۔ بے پناہ خدمات سرانجام دینے کے بعد یوں بچھڑتے ہیں کہ ان کے سابقہ تعلق کا گمان تک نہیں ہوتا۔ جب کہ اس کے برعکس چند ساتھی نہایت دھیرے انداز میں تنظیم میں آتے ہیں اور وہ اس کے بنیادی مقاصد اور تقاضوں سے واقفیت کے بعد اس بادل کی طرح چھا جاتے ہیں جو کئی روز تک مسلسل برستا رہتا ہے۔ لہٰذا تنظیم کو طوفانوں کے بجائے چھاجانے والے بادلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

ایک مرتبہ آئی۔ ایس۔ او کی مجلس عاملہ کے پروگرام "مرکزی صدور طلبا کے حضور" میں آپ نے احباب پر واضح کیا کہ آج آپ کے سامنے آدھے سے زائد سابق صدور غیر حاضر ہیں جس کا مجھے افسوس ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ کم از کم سال میں ایک مرتبہ تو یہ برادران اکٹھے مل بیٹھتے۔ یہاں آپؒ نے حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "بعض برادران اپنے عہدہ کا حلف لیتے وقت اس بات پر قطعاً غور نہیں کرتے کہ وہ کن کن ہستیوں کو حاضر و ناظر جان کر اقرار کر رہے ہیں۔ جب ایک سال گزر جاتا ہے تو یہ برادران اپنے اقرار سے روگردانی شروع کر دیتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہوتا ہے کہ خدا و معصومینؑ کے روبرو اٹھایا جانے والا حلف، عہدہ تک ہی قائم رہتا ہے۔ جب کہ ان کی یہ سوچ غلط ہے، حلف کا تعلق زندگی سے ہوتا ہے عہدہ کی مدت سے نہیں۔ پس وہ برادران جو شعوری طور پر حلف اٹھاتے ہیں وہ آخری دم تک اس پر قائم رہنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ کسی ساتھی کو

عہدیدار بنانے سے قبل اس کا شعور بیدار کیا جائے تاکہ وہ زندگی کو عمل کی لطافتیں بخش سکے اور وہ تنظیم کے نصب العین کے مطابق مومن بن کر عہد حاضر کی تاریکیوں، فتنہ پردازیوں اور چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو"۔

افراد سازی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "تنظیم دائمی ہے جب کہ اس کے ارکان عارضی ہیں لہٰذا اس کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہر ساتھی جب ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ تک پہنچے تو وہ پہلے مرحلہ پر اپنا نعم البدل ضرور چھوڑے۔ یہ نہ ہونے پائے کہ ایک ساتھی خود تو یونٹ سے مرکز تک پہنچ جائے جب کہ تنظیمی سفر میں اس کا خلا باقی رہے۔ مجلس عاملہ میں ڈویژنز کی کارکردگی رپورٹس سننے کے بعد آپ نے واضح کیا کہ ایک ڈویژن میں کام نوے فیصد ہوتا ہے جب کہ ایک سال بعد نئے ساتھیوں کی تنظیمی تربیت یا افراد سازی تیس فیصد ہے۔ تو اس ڈویژن سے وہ ڈویژن زیادہ مؤثر اور فعال ہے جس میں کام ستر فیصد ہوتا ہے جبکہ وہاں ایک سال کے بعد افراد سازی پچاس فیصد ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۹۱ میں جب میں نے "ماہنامہ العارف" کی ایڈیٹر شپ سے استعفا دیا تو اس مسئلہ پر ڈاکٹر صاحب نے پہلی بار مجھ سے آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے نشتر میڈیکل کالج ملتان میں ہونے والے مرکزی کنونشن کے موقع پر یوں گفتگو کی۔

☆ حضرتِ تسلیم (آپ کا مخصوص انداز تھا حضرت یا میاں کہتے) .... العارف کے بارے میں کیا سوچا ہے؟

○ ڈاکٹر صاحب! وہی جو کیا ہے۔

☆ جو کچھ تم نے کیا ہے تمہاری دینداری کے مطابق درست ہے؟

○ دینداری کے مطابق تو درست نہیں۔

☆ اس کا مطلب ہوا کہ پھر تمہاری ذات کے مطابق درست ہے؟

○ تقریباً" ایسا ہی ہے۔

☆ دس سال تنظیم میں کام کرنے اور کئی بار خدا اور امام زمانہؑ کے روبرو حلف اٹھانے کے بعد ابھی تک تم یہ طے نہیں پا سکے کہ تمہارے اقدامات دین کے لئے ہونے چاہئیں یا ذات کے لئے ....؟

○ ڈاکٹر صاحب عزت نفس بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے

☆ تمہیں عزت نفس زیادہ عزیز ہے یا عزت تنظیم ......؟

○ عزت تنظیم

☆ کہہ کچھ اور رہے ہو اور کر کچھ اور ....؟

○ ڈاکٹر صاحب آپ کا فرمان بجا مگر مجھے ایک آدھ بزرگوں کے رویہ سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔

☆ بندۂ خدا......! کسی بزرگ کے لئے کام کر رہے ہو یا خدا کی رضا کے لئے ....؟

○ ڈاکٹر صاحب کے دل سے نکلنے والے جملے سن کر میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میرا ضمیر مجھے جھنجوڑ رہا تھا کہ تم نفس پرستی کی دلدل میں اترتے جارہے ہو اور ساتھ ہی میرا خیال بار بار مجھے دعوت دے رہا تھا کہ دیکھو ڈاکٹر صاحب تنظیم کے ایک مجلّہ کے لئے کس قدر فکر مند اور پر درد ہیں۔

جب میں آپؒ کے سامنے ندامت سے سر جھکائے خاموش ہوا تو سفیر انقلاب نے یہاں ایک ایسا درد بھرا جملہ کہا (جسے میں یہاں لکھنے سے قاصر ہوں) آپ کی اپنی آواز بھی بھر آئی اور میں بھی ضبط نہ کر سکا۔ ہم کالج کے گیٹ سے ہاسٹل غالباً ''رازی ہال'' کی طرف بڑھے ڈاکٹر صاحب چند احباب کے ساتھ دو چار قدم آگے تھے جب کہ میں آپ کا بریف کیس اٹھائے اپنے ضبط پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ حالت کچھ یوں تھی

آنکھوں کی خامشی میں سمندر کا شور تھا
لکنت سی پڑ گئی تھی ہماری زبان میں

جب ہم ہاسٹل پہنچے تو وضو کرنے کے دوران آپؒ نے مجھے تاکید فرمائی کہ ''عزیز دوست الٰہی تنظیم کی جس ذمہ داری پر بھی کام کرو خدا کی ذات کے لئے کرو اس

وقت تک اس ذمہ داری سے انحراف نہ کرو جب تک تمہارا کوئی نعم البدل میسر نہ ہو۔ افراد پیدا کرنے کی کوشش کرو' خود آگے بڑھو مگر زنجیر کی طرح .... تنظیم کے امور میں سلسلہ قائم رکھو اگر کہیں بھی یہ سلسلہ منقطع ہوا تو آپ دوستوں کو روز محشر حساب دینا ہوگا"

مجھے آپ کی قربت حاصل کئے کم عرصہ گزرا تھا اور یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا جب میں نے محسوس کیا کہ یہ عظیم انسان نہ صرف مذہب و ملت کے لئے وقف ہے بلکہ قوم کے لئے بھی دل میں درد کے سمندر رکھتا ہے۔ اپنے ہر فعل کو تنظیم کے حلف سے مربوط رکھتا ہے۔ اس کی نظر آج بھی اپنے ماضی کے اقرار اور مستقبل کے لاریب انجام پر مرکوز ہے۔

ایک مرتبہ چند احباب نے آپ کے سامنے تجویز پیش کی کہ پندرہ روزہ یا ماہانہ اجلاس میں ساتھیوں کا احتساب ہونا چاہئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں .... آپؒ نے فرمایا "انسان کو اپنا احتساب پندرہ روز یا مہینہ بعد نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے اپنا احتساب ہر قدم پر کرنا چاہئے یا کم از کم رات کو سونے سے قبل اسے دن بھر کے امور کا احتساب کر لینا چاہئے۔ کہ اس نے کیا کھویا کیا پایا ہے؟ مولا علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جس کا آج اس کے کل سے بہتر ہے وہ کامیاب ہے۔ اس موقع پر آپؒ نے وضاحت کی کہ ہر تنظیمی دوست پر لازم ہے کہ وہ اس بات پر فکر کرے کہ وہ خود کتنا آگے بڑھ رہا ہے اور پیچھے کیا چھوڑ رہا ہے۔ خود کیا حاصل کر رہا ہے اور تنظیم کو کیا دے رہا ہے...... ؟"

۱۹۸۵ء میں ملتان کی مجلس عمومی کے موقع پر کچھ برادران نے نئے ڈویژنل صدر کے چناؤ اور چند دوسرے امور پر ہنگامہ برپا کر دیا۔ آپؒ نے انتہائی صبر و تحمل سے معاملات کو سلجھایا اور غیر متوقع حالات کو معمول پر لا کر صورتحال کا نقشہ بدل دیا۔ جب آپ سے چند دیگر ڈویژنل صدور کی بات ہوئی تو آپؒ نے فرمایا کہ "اختلافات تنظیموں کا حسن ہوتے ہیں اختلافات وہاں جنم لیتے ہیں جہاں کام ہو رہا ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ افراد شریک کار ہوتے ہیں۔ تنظیم کے اختلافات تعمیر کی طرف رہنمائی کرتے ہیں البتہ بعض مقامات پر چند افراد کے رویہ کو دیکھ کر خاصا دکھ

ہوتا ہے کہ وہ تنظیم میں رہنے کے باوجود بھی اپنے دائروں میں محدود ہوتے ہیں۔ ان کے اقدامات ذاتیات کی نشاندہی کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں خود سازی کا فقدان ہے وہاں کے سینئر برادران افراد سازی نہیں کر سکے"۔

آپؒ نے مزید فرمایا کہ افراد سازی صرف تنظیم کی ضرورت ہی نہیں بلکہ اسلامی معاشرہ کے قیام کا تقاضا بھی ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج ڈاکٹر محمد علی نقوی شہیدؒ ہزاروں نوجوانوں کے آئیڈیل (IDEAL) ہیں اور ان کی ذات کو ملت جعفریہ میں افراد ساز کارخانہ کی حیثیت حاصل ہے۔ آخر انہوں نے ملت پر اتنا بڑا احسان کس انداز میں کیا اور کن کن مراحل سے گزرے ....؟

اس کا جواب اگرچہ خاصا طولانی ہے تاہم مختصر انداز مین اتنا کہا جا سکتا ہے کہ افراد سازی کے لئے انہوں نے بیش بہا پروگرام ترتیب دیئے۔ بڑے بڑے تربیتی کیمپس منعقد کرائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نوجوان تربیتی پروگراموں سے متاثر ہوئے لیکن آپ کی ذات ہمیشہ تربیت کا محور رہی۔ جس شخص نے بھی آپ کی قربت میں چند لمحے گزارے اس نے آپؒ کے ساتھ برسوں صرف کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یہاں تک کہ بعض احباب کی خواہش رہی کہ خدا انہیں شہادت بھی ڈاکٹر نقویؒ کے ساتھ عطا فرمائے۔

اگرچہ میں بذات خود آپ کی ذات سے خاصا متعارف تھا مگر حقیقی معنوں میں آپ کا عرفان اپنے محبوب بھائی سید راشد عباس نقوی کے ذریعہ ہوا۔ برادر راشد نقوی کی بات کسی اور کے لئے ہو نہ ہو میرے لئے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک شب انہوں نے سفیر انقلاب کے بارے میں مجھے بتایا کہ "یہ ایک ایسا انسان ہے جس کی قربت میں جتنا جائیں اتنی ہی لذت نصیب ہوتی ہے" انہوں نے وضاحت کی کہ انسانی فطرت میں ہے کہ انسان جب کسی دوسرے انسان کے قریب جاتا ہے یا اس کی گہرائی کا اندازہ لگاتا ہے تو اس پر کئی راز کھلتے ہیں جو عام طور پر اس کے ظاہر سے متصادم یا مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب ایک ایسی شخصیت ہیں جن کا ظاہر باطن سے بال برابر مختلف نہیں اور آپؒ کی ذات حضرت علی علیہ السلام کی مومن کے لئے

بتائی گئی تمام نشانیوں پر کما حقہ پوری اترتی ہے" رفتہ رفتہ مجھے جب آپ کی قربت نصیب ہوئی تو بے ساختہ ماننا پڑا کہ آپؒ واقعاً" کامل انسان ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں کسی نوجوان کی تربیت کرانے کے کئی مراحل ہوتے تھے۔ پہلا مرحلہ آپ سے ملاقات اور گفتگو کا ہوتا تھا۔ جو نوجوان بھی آپ سے ملتا آپ کا ہوجاتا تھا۔ جو بھی آپ کی گفتگو سنتا آپ کا عقیدتمند بن جاتا تھا۔ خدا نے آپ کی شخصیت میں اتنی جاذبیت رکھی تھی کہ نوجوان آپ سے بچھڑنا نہیں چاہتے تھے بقول؎

وہ خوش کلام تھا اتنا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا تھا مختصر رہنا

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں تربیت کا دوسرا مرحلہ آپ کے ساتھ چند روز گزارنے کا ہوتا تھا۔ جو نوجوان سفر و حضر میں، آپ کی صحبت میں چند ایام گزار لیتا تھا وہ آپ سے جدائی کا تصور بھی نہ کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض احباب کے والدین نے ڈاکٹر صاحب سے پیار بھرے انداز میں شکوہ بھی کیا کہ ان کے بچے جب بھی گھر آتے ہیں وہ سارا سارا دن آپ کے تذکرے کرتے ہیں اور والدین کے ساتھ زیادہ رہنے کی بجائے آپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس بات کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے خود زندگی کی آخری عید کے دن اس وقت کیا جب آپؒ احباب سے ان کے گھر عید ملنے گئے تو وہ عید کے روز آپ کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے احباب کے والدین کو ان کے شکوہ کا جواب دیا کہ میں آج ان کو لینے نہیں آیا یہ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں بلکہ آپ نے خوشاب اور سرگودھا کے چند احباب کو سختی سے کہا کہ وہ اپنے گھروں میں والدین کے پاس رہیں۔

زندگی کے آخری ایام میں آپ نے اپنے ساتھ رہنے والے ایک نوجوان کے والدین کے بارے میں سنا کہ وہ بیمار ہیں، آپؒ نے اپنے رفیق سے کہا کہ وہ گھر جائیں

اور والدین کی خدمت کریں۔ جب نوجوان نے یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ ان کے والدین بیمار نہیں ہیں تو آپ اس کے گھر گئے اس کے والد صاحب کی عیادت کی ان سے ملے اور نوجوان کو گھر چھوڑ آئے۔ واپسی پر آپ نے اس ساتھی سے چابیاں وغیرہ لیں اور اسے سختی سے کہا کہ وہ والدین کو ایسی حالت میں چھوڑ کر لاہور قطعاً" نہ آئے۔

وہ دوست آج بتاتے ہیں کہ جب ڈاکٹر صاحب نے ان سے مکان کی چابیاں لیں اور والدین کے علاج کے لئے رقم دی تو انہیں ایسے لگا جیسے وہ آج سے انہیں خود سے جدا کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے جانثار کو چھوڑ کر روانہ ہوئے تو اس باوفا ساتھی کی آنکھیں چھلک پڑیں اور انہوں نے آپؒ سے بھیگی آنکھوں کے ساتھ عرض کی۔

تیرے بنا ہے کڑی دھوپ کا سفر درپیش
تو اپنی چھاؤں میں پل بھر مجھے ٹھہرنے دے

جہاں تک ہم نے محسوس کیا ہے کہ سفیر انقلاب کی رفاقتوں کے کئی حلقے تھے۔ آپؒ اپنے چاہنے والے نوجوانوں کو ان کے مزاج اور صلاحیت کے مطابق مخصوص حلقے میں رکھتے تھے۔ جس طرح اسکول میں جماعتیں ہوتی ہیں اور طالب علم مرحلہ وار ترقی کرتا ہے۔ بالکل ایسے ہی سفیر انقلاب ایک اسکول کی مانند تھے ان کی اپنی جماعتیں تھیں جن کا دائرہ نرسری سے پوسٹ گریجوایٹ تک تھا۔ البتہ فرق اتنا تھا کہ اس ادارہ کی نرسری گریجوایٹ طلباء سے شروع ہوتی تھی۔

آپ مومن تھے اور حدیث نبوی ﷺ کے مطابق خدا کے نور سے دیکھتے تھے۔ آپؒ کے دل کی حکمت جب لبوں پر آتی تھی تو سننے والوں کے دل میں اتر جاتی تھی جبکہ آپ کی آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کی لمس ملنے والوں پر جادو کا اثر رکھتی تھی۔

ایک مرتبہ آپ کے کلینک پر ایرانی طالب علم آیا۔ علاج و مشورہ کے بعد وہ

واپس جانے لگا تو اس نے باہر بیٹھے ہوئے آپ کے رفقاء سے کہا کہ آپ کا رفیق ڈاکٹر جلد شہید ہو جائے گا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو اس نے بتایا کہ وہ ایران عراق جنگ کے دوران میں کئی ماہ تک محاذ پر رہا اور اس کے سامنے جتنے مجاہد شہید ہوئے ان کی آنکھوں کی چمک اور ہاتھوں کا لمس بالکل اس ڈاکٹر جیسا تھا۔

آپؒ نوجوانوں کی تربیت کسی خشک زاہد یا ناصح کی طرح نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے عمل سے تبلیغ کر کے دیکھنے والوں کو گرویدہ کر لیتے تھے۔ آپ کی تربیت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کی زیر تربیت پروان چڑھنے والے آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے تمام مرکزی صدور تاحال تنظیم سے نہ صرف مربوط ہیں بلکہ تقریباً وقف ہیں۔ جبکہ آپ سے پہلے کے مرکزی صدور کا تنظیم سے رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

آپؒ کے تربیت یافتہ نوجوان عالم بھی ہیں اور مجاہد بھی .... مقرر بھی ہیں اور لکھاری بھی .... متقی بھی ہیں اور پاکباز بھی .... اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز بھی .... مومن بھی ہیں اور ہمدرد بھی .... محرک بھی اور پاسبان بھی .... تحریک جعفریہ اور آئی۔ ایس۔ او کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہیں اور ملت جعفریہ کا مضبوط سہارا بھی .... اسلام کے داعی بھی ہیں اور ملک کے بے لوث محافظ بھی .....۔

آپ نے آغاز میں نوجوانوں کے درمیان تقویٰ کو متعارف کرایا اور نماز شب کی ترغیب دی۔ آپ باقاعدگی سے نماز پڑھتے تھے۔ آپ کی عبادت کا منظر دیکھنے والے گواہی دیتے ہیں کہ آپ مصلح عبادت پر آتے تو آپ کی آنکھیں ساون کے بادل کی طرح برستیں، جسم موم اور بدن میں کپکپی طاری ہوجاتی تھی۔

آپ انفرادی عبادت سے آگے بڑھے تو اجتماعی عبادات کے فروغ کی ٹھانی۔ عزاداری کی محافل کے اہتمام تک محدود طلباء کو الٰہی دائرے میں لانے کی کوشش کی۔ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں خدا کا بندہ بننا چاہیے۔ آپؒ قرآن مجید کے پارہ ۲ سورہ آل عمران کی اس آیت کی تفسیر تھے جس میں ارشاد خداوندی ہے کہ "اے رسول ...... میرے بندے تو وہ ہیں جو صبر کرتے ہیں، سچے ہیں، قناعت پسند ہیں،

میری راہ میں خرچ کرتے ہیں اور رات کے پچھلے پہر استغفار کرتے ہیں"

چونکہ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کے بنیادی دروس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں اس لئے میں ان سے کوئی چیز منسوب کرنا نہیں چاہتا البتہ آپ کے احباب کہتے ہیں کہ سفیر انقلاب واحد نوجوان تھے جو ضمیروں کو جھنجوڑنے والی باتیں کرتے تھے۔ وہ دور جب ہماری ملت میں عبادت صرف علماء تک محدود تھی۔ آپ نوجوانوں کو قلبی درد سے ایسے پر درد دروس دیتے تھے کہ طلباء خدا کی طرف راغب ہوجاتے تھے۔

آپؒ نوجوانوں کو تقوٰی کی طرف مائل کر ہی رہے تھے کہ ایران میں اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہوگیا۔ اس کی کرنیں جب پاکستان پہنچیں تو ڈاکٹر صاحب نے شاہ ایران کی تاریکیوں کے بعد امام خمینی کے منور ایران کو دیکھنے کا ارادہ فرمایا۔ جب آپ نے ایران کا نقشہ، مزاج اور ماحول بدلا دیکھا تو آپ نے آئی۔ ایس۔ او پاکستان کا قافلہ تشکیل دیا اور انہیں روحانی ماحول میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے طے شدہ پروگرام کے مطابق نوجوانوں کو وہاں کی علمی شخصیات، فقیہان، مجاہدین اور شہداء کے ورثاء سے ملوایا گیا۔ امام زمانہ علیہ السلام کے ملک میں امامؑ کے فرزند کی اسلامی حکومت امام رضا علیہ السلام اور معصومہ قم کے مزارات کی زیارت، فقیہان کے دروس، مجاہدین کے جذبے اور شہداء کے ورثاء کے تاثرات نے پاکستانی طلباء کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ جب پہلا قافلہ واپس لوٹا تو ان کے اندر پیدا شدہ نمایاں تبدیلی نے ڈاکٹر صاحب کو دلی مسرت بخشی۔ جس کے بعد آپ نے نوجوانوں کے بیسیوں قافلے بھیجے اور پاکستان کے امامیہ طلباء کی روحانی طاقت میں اضافہ فرمایا۔

نوجوانوں پر انقلاب کے اثرات کا جائزہ لے کر آپ نے اپنے چند احباب کو اکھٹا کیا اور فرمایا کہ "اسلامی انقلاب ایران نے دنیا بھر میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص جو اثرات مرتب کئے ہیں اور ہمارے تنظیمی برادران میں جو روحانی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں یہ اس بات کی متقاضی ہیں کہ ہم بھی وہاں جیسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ علمائے کرام سے استفادہ کریں اور پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے تیاری شروع کر دیں"

جب احباب نے آپ کی تائید کی تو آپ نے کربلا گامے شاہ لاہور میں "دعائے

کمیل" کا آغاز کر دیا۔ چونکہ یہاں کے لوگ دعائے کمیل کی اہمیت اور حقیقت سے تقریباً" نا آشنا تھے۔ اس لئے آغاز میں صرف تنظیمی برادران نے شرکت کی اور ڈاکٹر صاحب نے دعائے کمیل پڑھانا شروع کر دی۔ سفیر انقلاب نے دعائے کمیل کو اتنے پر درد انداز میں پیش کیا کہ نوجوان خوف خدا میں دھاڑیں مار کر روئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ روحانی محفل اس قدر جاذب ہوگئی کہ ہر شبِ جمعہ، خوف خدا میں گریہ کرنے والوں کے اجتماع میں اضافہ ہوتا گیا۔ چند ماہ بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ لاہور شہر کے سینکڑوں بندگان خدا کے علاوہ مضافات کے لوگ بسوں اور ویگنوں کے ذریعہ قافلہ در قافلہ اس روح پرور اجتماع میں شرکت کرنے لگے۔

ایک روز سفیر انقلاب نے یہاں امام خمینی اور ایران کے روحانی ماحول کا تعارف کراتے ہوئے اس اجتماع کو امام خمینی کا خطاب سنایا تو یاد خدا سے مسرور لوگوں کے دلوں میں جذبہ شہادت نے انگڑائی لی۔ جب سفیر انقلاب نے دعا کے دوران میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے رب سے شہادت کی دعا طلب کی تو ماحول کی کیفیت بدل گئی اور رقت انگیز ماحول میں نوجوان تڑپ تڑپ کر امام زمانہؑ کے ظہور اور اپنی شہادت کی دعا مانگنے لگے۔

قائد ملت اسلامیہ شہید مظلوم حضرت علامہ عارف حسین الحسینی رضوان اللہ علیہ' جب قیادت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد پہلی بار لاہور تشریف لائے تو شبِ جمعہ کو انہوں نے کربلا گامے شاہ میں سفیر انقلاب کی خواہش پر دعائے کمیل پڑھائی۔ اس شام ہجوم اس قدر زیادہ تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اس ہجوم میں دعائے کمیل کے مستقل قاری بھی تھے' قائد کے عقیدتمند بھی اور وہ لوگ بھی شامل تھے جو دو قیادتوں کے درمیان تذبذب کا شکار تھے۔ برادر سید مشتاق کاظمی چنیوٹ کے بقول کہ وہ ان لوگوں کے قریب کھڑے تھے جنہوں نے علامہ عارف حسین الحسینیؒ کی قیادت کو تاحال تسلیم نہیں کیا تھا۔ جب قائد محبوب نے دعائے کمیل پڑھائی اور خدا سے مناجات کے دوران پنجتن پاکؑ کو وسیلہ بناتے ہوئے یا زہراؑ یا زہراؑ کی صدا بلند کی تو ماحول میں کہرام برپا ہو گیا۔ آپؒ کی درد بھری آواز سن کر لوگوں نے بے اختیار کہا کہ سید نے آج کربلا کے استغاثہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ کاظمی صاحب نے کہا کہ یہ

منظر دیکھ کر قیادت کو تسلیم نہ کرنے والے لوگوں نے پنجابی زبان میں بے ساختہ کہا "سید اسی تینوں من گئے آں کہ توں ہی بتولؑ دا پتر ایں" (سید ہم تمہیں مان گئے ہیں کہ آپ ہی بتول سلام اللہ علیہا کے فرزند ہیں)

جب لاہور میں دعائے کمیل کے ماحول نے انقلاب پیدا کیا تو سفیر انقلاب نے آئی۔ ایس۔ او کے نوجوانوں کے ذریعہ ہر ڈویژن میں ایسے ہی روحانی پروگرام منعقد کرنے کی تجویز پیش کی۔ بعض ڈویژنز میں خود جا کر دعائے کمیل کے اجتماع کا آغاز کرایا اور ان روح پرور اجتماعات سے نوجوانوں کی کردار سازی میں تیزی پیدا کی۔

نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی خود سازی نے جب تنظیم کو استحکام بخشا تو ڈاکٹر صاحب بے حد خوش ہوئے اور فرمایا کہ "اب ہم ان مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو رہے ہیں جو تنظیم کی اساس تھے اور جن کا ہمارا نصب العین متقاضی تھا"

افراد سازی کے دوسرے مرحلہ میں آپ نے ہفتہ وار دروس کا سلسلہ شروع کیا اور لاہور کی سطح پر اپنے ہفتہ کے تمام ایام کو دروس اور پروگرام کے لئے وقف کر دیا۔ ہفتہ وار دروس میں آپ نے تجویز فرمایا کہ آئی۔ ایس۔ او یا تحریک جعفریہ سے مربوط نوجوانوں کو جہاں علماء کرام کی قربت کا شرف حاصل ہے وہ ان سے مستفید ہوں۔ جہاں سینئر تنظیمی ساتھی موجود ہوں وہ اپنے حلقہ میں نئے طلباء کی کردار سازی کریں اور جہاں یہ دونوں صورتیں میسر نہیں ہیں وہاں ڈویژنل عہدیدار دروس کو جاری رکھیں۔

میں گذشتہ چند سالوں سے خود بھی ایسے پروگراموں سے خاصا مستفید ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ آپ تمام برادران کو اگلی نشست کے لئے عنوان دیا کرتے تھے جس کے لئے ہفتہ بھر ہم تیاری کرتے اور بعد میں اس پر مفصل بحث ہوتی تھی۔ آپؒ کی جانب سے دیئے گئے عنوانات میں عقائد، فلسفہ، نظریہ ملکی و بین الاقوامی حالات شامل ہوتے تھے۔ ان محافل میں بعض اوقات بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر صاحب کوئی عنوان یا منصوبہ چھیڑ دیتے تھے اور کم وقت میں زیادہ آرا لینے کے ساتھ ساتھ برادران کی ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے تھے۔

یہ پروگرا ان سینئر برادران پر مشتمل تھا جو تنظیم کا بنیادی سفر کامیابی سے طے

کر چکے تھے اور ڈاکٹر صاحب کی ان افراد سے امیدیں وابستہ تھیں۔ آپؒ کی خواہش تھی کہ ہر ڈویژن میں ایسے چند افراد کو تیار کر کے آئی۔ ایس۔ او کے برادران کی تربیت اور تحریک جعفریہ کو مضبوط شخصیات فراہم کی جا سکیں۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تذکرہ ہو چکا ہے کہ سفیر انقلاب کی تربیت کے کئی مدارج تھے اور وہ مرحلہ وار افراد کو آگے لاتے تھے۔ کتاب بینی اور مباحثے کی محفل سے آگے ایک اور حلقہ تھا جہاں ملت کے مسائل، تنظیمی مشکلات اور تنظیمی سفر کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ اس محفل میں "تحریک جعفریہ نے کیا کھویا کیا پایا......؟" زیر بحث تھا۔ تحریک کو جماعت اسلامی کے تقابل میں دیکھا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی جمعیت علماء اسلام کا سیاسی سفر بھی زیر غور تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب نے ہماری طرف دیکھا اور جماعت اسلامی کے تنظیمی ڈھانچہ کے بارے میں سوالات کئے تو ہم آپ کو مطمئن نہ کر سکے۔ آپ نے تعجب سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے ابھی تک ملک کی اسلامی جماعتوں کے دستور یا منشور نہیں پڑھے ..... پھر خود چند اہم نکات پر گفتگو کرنے کے بعد تاکید فرمائی کہ آپ لوگ پہلی فرصت میں ملک کی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے دستور کا مطالعہ کریں۔ اس محفل میں آپ نے ایم۔ کیو۔ ایم کی افرادی طاقت پر بھی بحث کی اور وہاں پر موجود افراد کو ان نکات پر بحث کرنے کی دعوت دی جن کی بنا پر مہاجر قوم ایک طاقت بن کر ملک کے نظام میں دخیل کار ہوئی ہے۔

یہاں آپ نے ملک کے تمام ادروں کی اہمیت اور افادیت پر بھی غور کیا اور پھر اس موضوع پر جامع بحث ہوئی کہ کون کون سا ادارہ ملک کے نظام پر زیادہ اثرانداز ہے اور اس ادارے میں ہماری نمائندگی کیا ہے ....؟ ہمارے ساتھ یہ آپ کی زندگی کی آخری نشست تھی اس کے بعد عید کی چھٹیوں میں سلسلہ تعطل کا شکار ہوا اور پھر ہم نہ مل سکے۔ یہ احساس تمام عمر زندہ رہے گا کہ ڈاکٹر صاحب جس معیار پر سوچتے تھے اور ان کی دور اندیش نگاہیں جہاں مرکوز تھیں وہاں تک ان کی قوت بازو یا قوت بینائی بننا دقت طلب تھا۔ آپ لمحوں میں برسوں کی اور برسوں میں صدیوں کی سوچا کرتے تھے۔

آپ نے نوجوانوں کی تربیت کے لئے مرکزی سطح پر تربیتی ورکشاپس کا سلسلہ

شروع کیا۔ اگرچہ یہ ورکشاپس آئی۔ ایس۔ او کے زیر اہتمام ہوتی تھیں مگر در حقیقت ان کے روح رواں سفیر انقلاب ہی تھے۔ پاکستان بھر کے سینکڑوں طلباء کو ایک مقام پر اکھٹا کر کے ان کی اخلاقی، تعلیمی، اور روحانی تربیت کرنا آپ کے اولین مقاصد میں شامل تھا۔ ایسی ورکشاپس میں آپ کئی کئی روز نوجوانوں کے درمیان رہتے اور ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے ساتھ ان کے حوصلوں کو توانا بناتے۔

ایسے پروگراموں میں آپ علماء کرام اور ماہرین تعلیم سے خود رابطے کرتے ان سے شرکت کی اپیل کر کے شرکت کو یقینی بناتے۔ بہتر کارکردگی کے حامل طلباء کی انعامات سے حوصلہ افزائی فرماتے۔

ایک تربیتی نشست میں آپ نے فرمایا کہ "اگر یہاں ایک سو افراد جمع ہیں اور وہ کسی عالم دین، ماہر تعلیم یا سینئر ساتھی سے ایک گھنٹہ کا درس لیتے ہیں تو انہیں یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ان کا ایک گھنٹہ صرف نہیں ہوا بلکہ ایک سو ایک گھنٹہ صرف ہوا ہے۔ یعنی ایک گھنٹہ درس دینے والے کا اور سو گھنٹے درس سننے والوں کے ...... لہٰذا آپ برادران پر لازم ہے کہ آپ ایک سو گھنٹہ کا نتیجہ بھی وقت کے مطابق دیں ...... کوشش فرمائیں کہ آپ کا ہر قدم خدا کی رضا کے لئے اٹھے اور آپ کی ہر سوچ ملک و ملت کے لئے ہو"

آئی۔ ایس۔ او کے طلباء کے علاوہ آپ نے تحریک جعفریہ اور پاسبان اسلام کے نوجوانوں کی بھی روحانی تربیت کی اور انہیں نظریاتی سطح پر پختگی بخشی۔

افراد سازی میں آپ اس قدر مخلص تھے کہ تمام ذاتی مصروفیات ترک کر کے پروگرام میں ضرور پہنچتے۔ جعفریہ کالونی لاہور میں ہفتہ وار درس ہوتا تھا جہاں آپ وہاں کے سینئر تنظیمی برادران کو اہم موضوعات پر درس دیتے تھے۔ ایک روز جس شام آپ کا پروگرام تھا اسی روز آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا۔ آپ دن بھر تجہیز و تکفین میں مصروف رہے۔ شام ہوئی تو آپ پروگرام کے مطابق مقام مقررہ پر پہنچ گئے

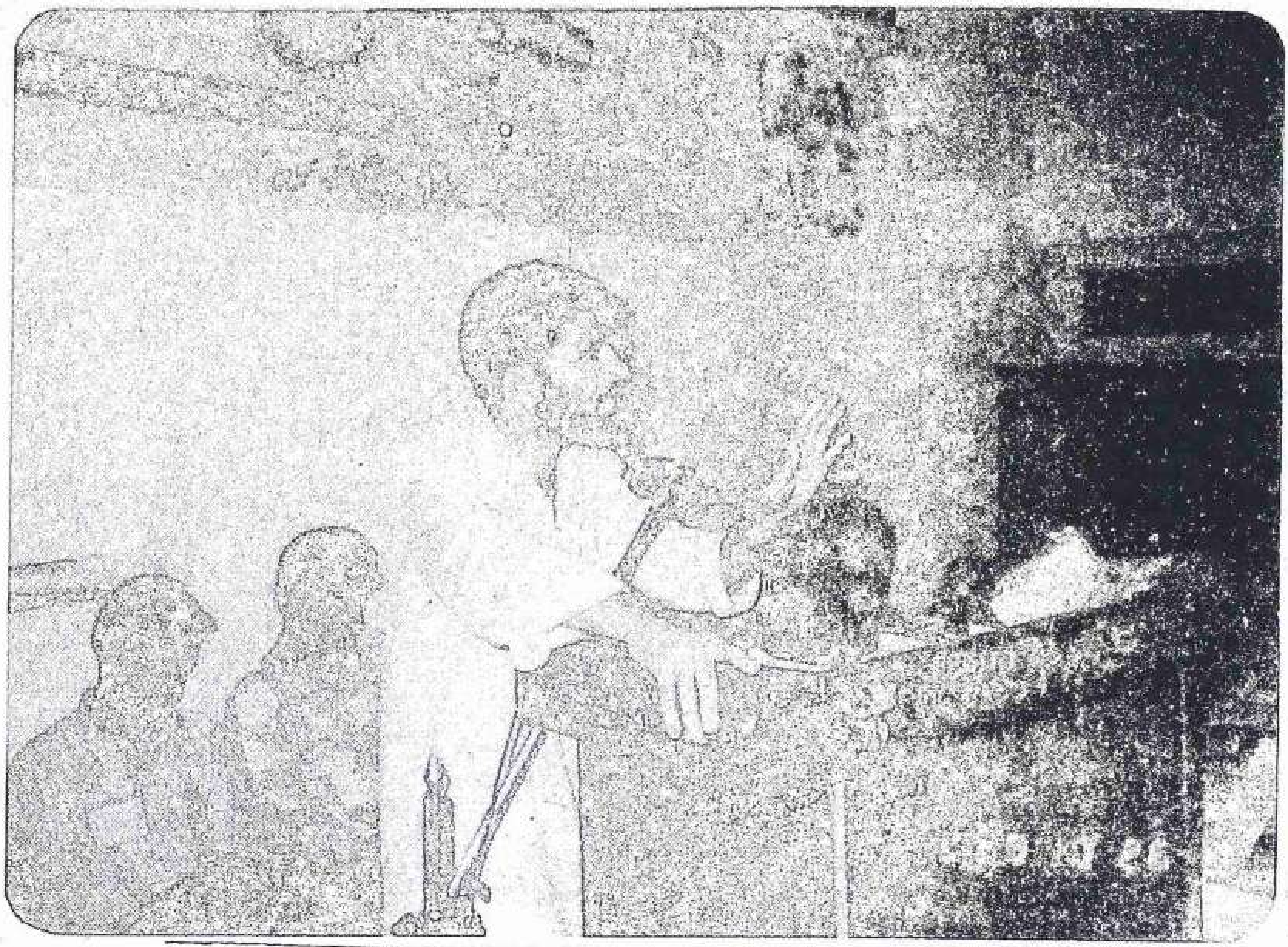

آئی۔ایس۔او کے محبین میں لہجے کی مٹھاس گھولتے ہوئے

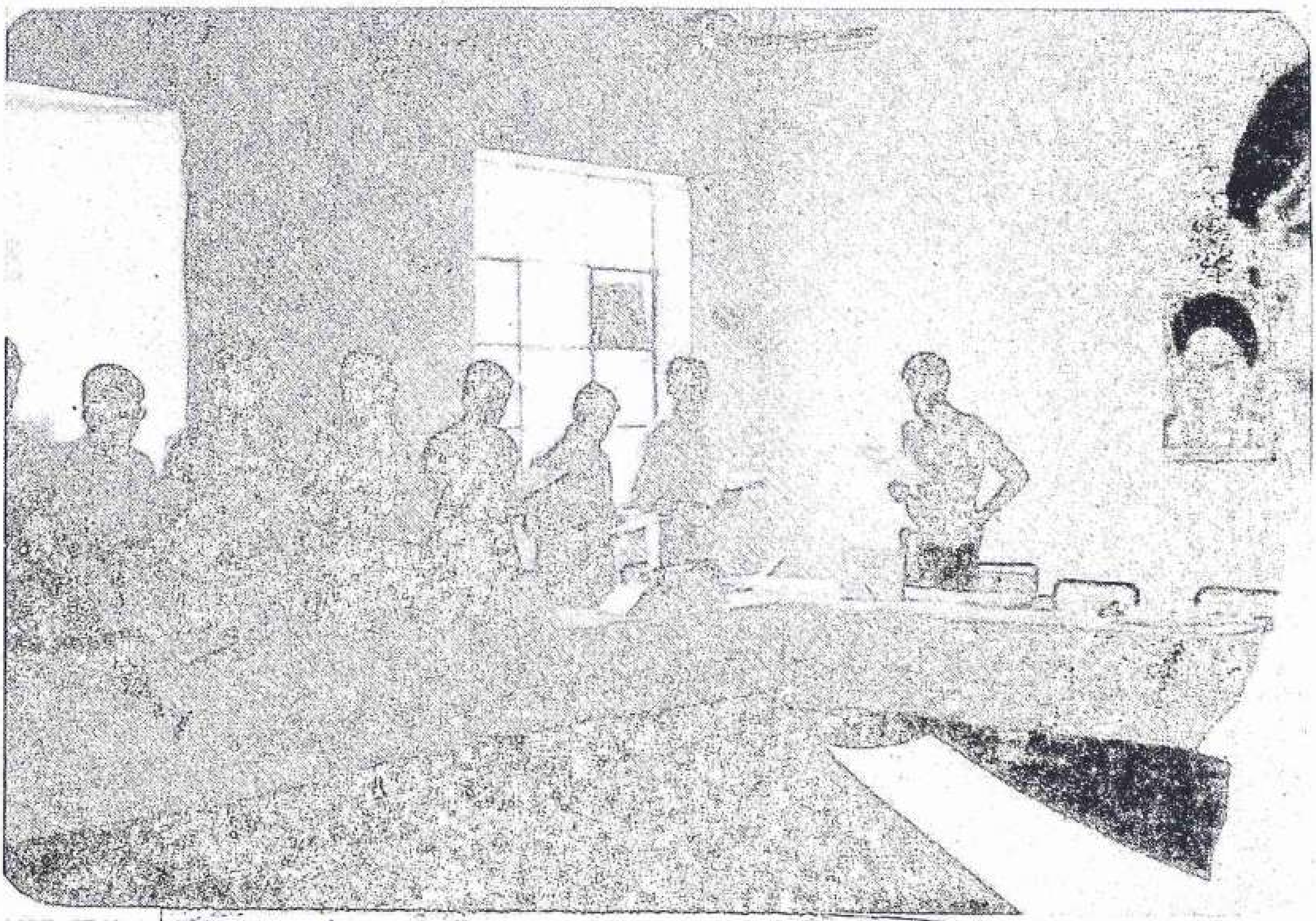

آئی۔ایس۔او کی مجلس عاملہ کے ارکان سے حلف لیتے ہوئے۔

اور ساتھیوں کو حیران کر دیا۔ آپ کی اس شرکت کا اتنا اثر ہوا کہ پھر برادران نے درس میں کبھی ناغہ نہ کیا۔

دروس اور ورکشاپس کے علاوہ آپؒ نے بہت سے نوجوانوں کی ذاتی سطح پر بھی تربیت کی اور یہ تربیت خالصتاً آپ کی صحبت اور قربت کے نتیجہ میں ہوئی۔ جو شخص آپ کی قربت میں جتنی دیر رہا وہ اس قدر باشعور ہوا کہ اس نے ملت کی بھرپور خدمت کی۔

آپ اپنے ساتھیوں کو وعظ و نصیحت کم کرتے تھے جب کہ آپ کا عمل ایک بہت بڑی تبلیغ ہوتا تھا۔ آپ اپنے احباب سے بے حد محبت اور ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی محبت اور خدمت کو دیکھ کر بعض اوقات احباب کی پلکیں بھیگ جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ آئی۔ ایس۔ او کے ایک رکن حادثہ میں شدید زخمی ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے علاج معالجہ کے علاوہ انہیں نہلانے، کپڑے پہنانے اور بیت الخلا میں لے جانے تک کی خدمت کی۔

ایک دفعہ آپ تربیتی ورکشاپ میں تشریف لے گئے۔ آپ رات کو کمرہ سے باہر نکلے تو آپ کی نظر کھانے کی استعمال شدہ پلیٹوں پر پڑی۔ آپ نے چپکے سے سو ڈیڑھ سو پلیٹیں اٹھائیں اور انہیں ٹھنڈے پانی سے دیر تک صاف کیا۔ جب صبح کسی دیکھنے والا کی زبانی آپ کی تکلیف کا علم ہوا تو کارکنان بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنا ہر کام خود کرنے کا عزم کیا۔

آپ اپنے بیٹوں سے زیادہ رفقاء سے محبت کرتے تھے۔ آج بھی آپ کے فرزند سلمان نقوی اور دانش نقوی بتاتے ہیں کہ "اگر بعض اوقات جب ابو ہماری بات نہ مانتے تھے تو ہم انکل اسحاق کے ذریعے اپنی بات منواتے" اسحاق بھائی ڈاکٹر صاحب کے باوفا ساتھیوں میں سے ہیں اور انہیں یہ اعزاز حاصل ہے کہ زندگی بھر ڈاکٹر صاحب نے ان کی کوئی بات رد نہیں کی۔

آپؒ اپنے رفقاء پر اس قدر شفیق تھے کہ ان کے تمام غم خود لینے اور اپنی تمام خوشیاں انہیں دینے کی کوشش میں رہتے تھے۔ آپ اس قدر احتیاط کرتے تھے کہ بعض اوقات احباب کے درمیان کھانے کی قلت کو محسوس کرتے ہوئے ہاتھ کھینچ لیتے

تھے تاکہ آپ کے ساتھی بھوکے نہ رہیں۔ آپ کے رفقاء کے گھروں میں کوئی پریشانی سر اٹھاتی یا مسائل جنم لیتے تو آپ ایک گھر کے سربراہ کی حیثیت سے تمام مشکلات کو حل کرتے۔ بعض اوقات اگر کوئی تنظیمی ساتھی علاقائی مشکلات کی بدولت آپ کے ہاں آتا تو آپؒ اس کے سر کا سایہ بن جاتے۔

آپؒ کا معمول تھا کہ قریبی رفقاء کو مسائل سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیتے رہتے۔ آپ کی زندگی بھر کوشش رہی کہ ہر مصیبت میں پہلے خود قدم رکھتے۔ روایتی رہنماؤں کی طرح عقید تمندوں یا ساتھیوں کو مصائب کی آگ میں نہ جھونکتے۔

ایک مرتبہ گورنر ہاؤس کے سامنے احتجاجی مظاہرہ ہوا جس میں آپ حسب روایات شریک تھے۔ جب مظاہرین گورنر ہاؤس کی جانب بڑھے تو پولیس اور انتظامیہ نے لائن لگا کر اعلان کیا کہ جو لائن کو عبور کرے گا وہ اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہوگا۔ طے شدہ حد کے قریب جب مظاہرین پہنچے تو موقع پر موجود مجسٹریٹ اور ایس پی پولیس نے زور دار آواز میں وارننگ دی۔ جونہی مظاہرین آگے بڑھے تو پولیس کی آنسو گیس کے گولے، بندوقیں اور انسانیت کش رائفلیں حرکت میں آئیں ۔ یہ منظر دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے تمام مظاہرین حد کے قریب رک گئے۔ سچ بات یہ ہے کہ ان لمحات میں کسی کا جگر اس کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔ نوجوان دم بخود تھے کہ ایسے میں ڈاکٹر صاحب اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرکے آگے بڑھے اور حدود عبور کرکے پولیس کے دائرے میں جا پہنچے۔

دوسری مرتبہ آپ نے اپنے ساتھیوں کو اس وقت حوصلہ بخشا جب حکومتی کمانڈوز نے برادر سید تصور حسین نقوی کو اغواء کیا جب ڈاکٹر صاحب کو اطلاع ملی کہ تصور نقوی سی۔ آئی۔ اے ہیڈ کوارٹر میں ہیں تو آپ سیدھا ایس۔ پی کے پاس گئے اور گرجدار انداز میں للکارتے ہوئے کہا "اگر قومی معاملات میں گرفتار کرنا ہے تو میں حاضر ہوں آپ ہمارے بچوں کو اغواء اور تشدد کا نشانہ نہ بنائیں۔" آپ کی للکار کا برا مناتے ہوئے۔ ایس۔ پی نے جواب دیا "جب آپ کو گرفتار کرنے کا وقت آئے گا گرفتار بھی کرلیں گے اور آپ سے تفتیش بھی کریں گے۔"

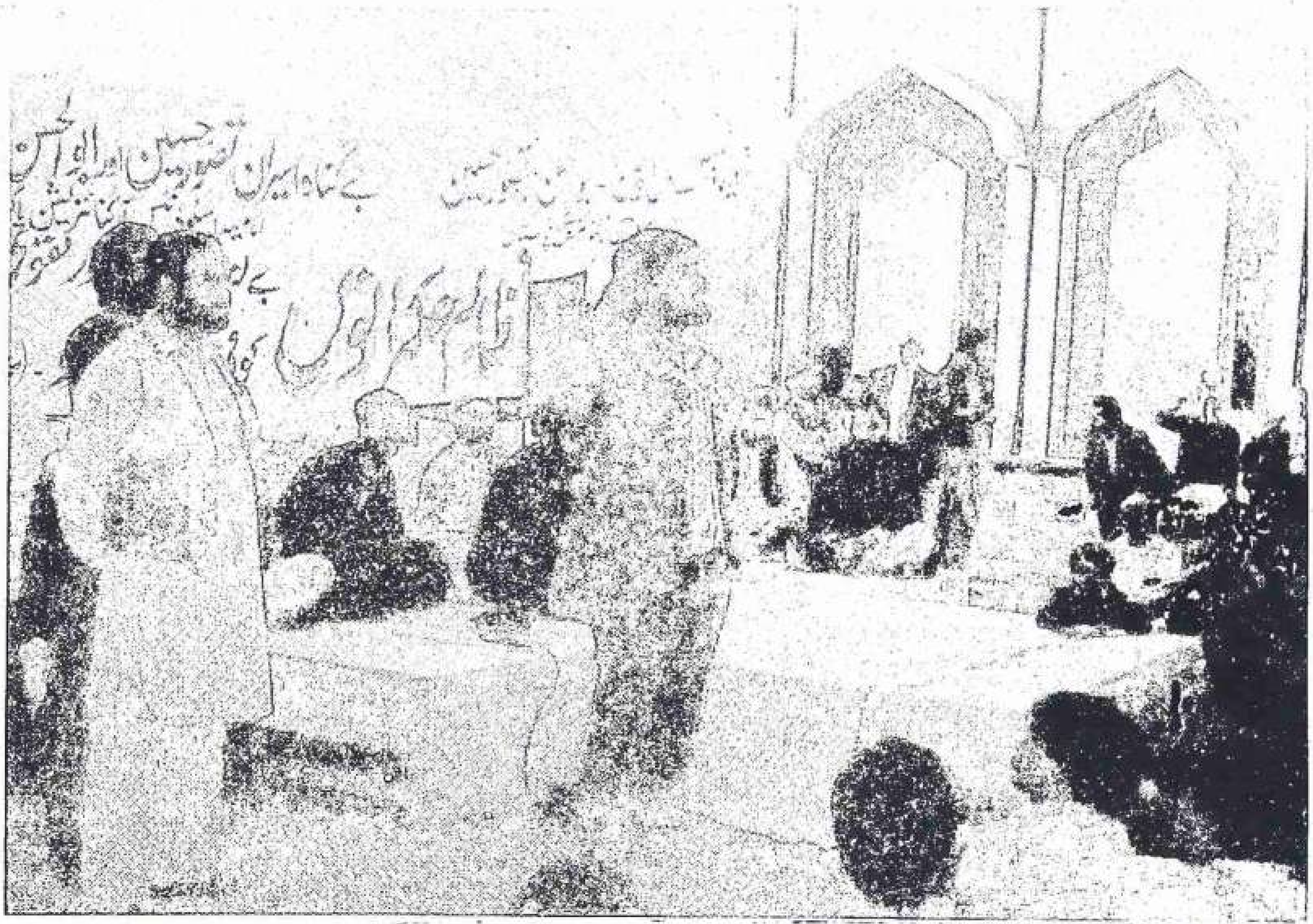

سید ابوالحسن نقوی اور سید تصور حسین نقوی کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے

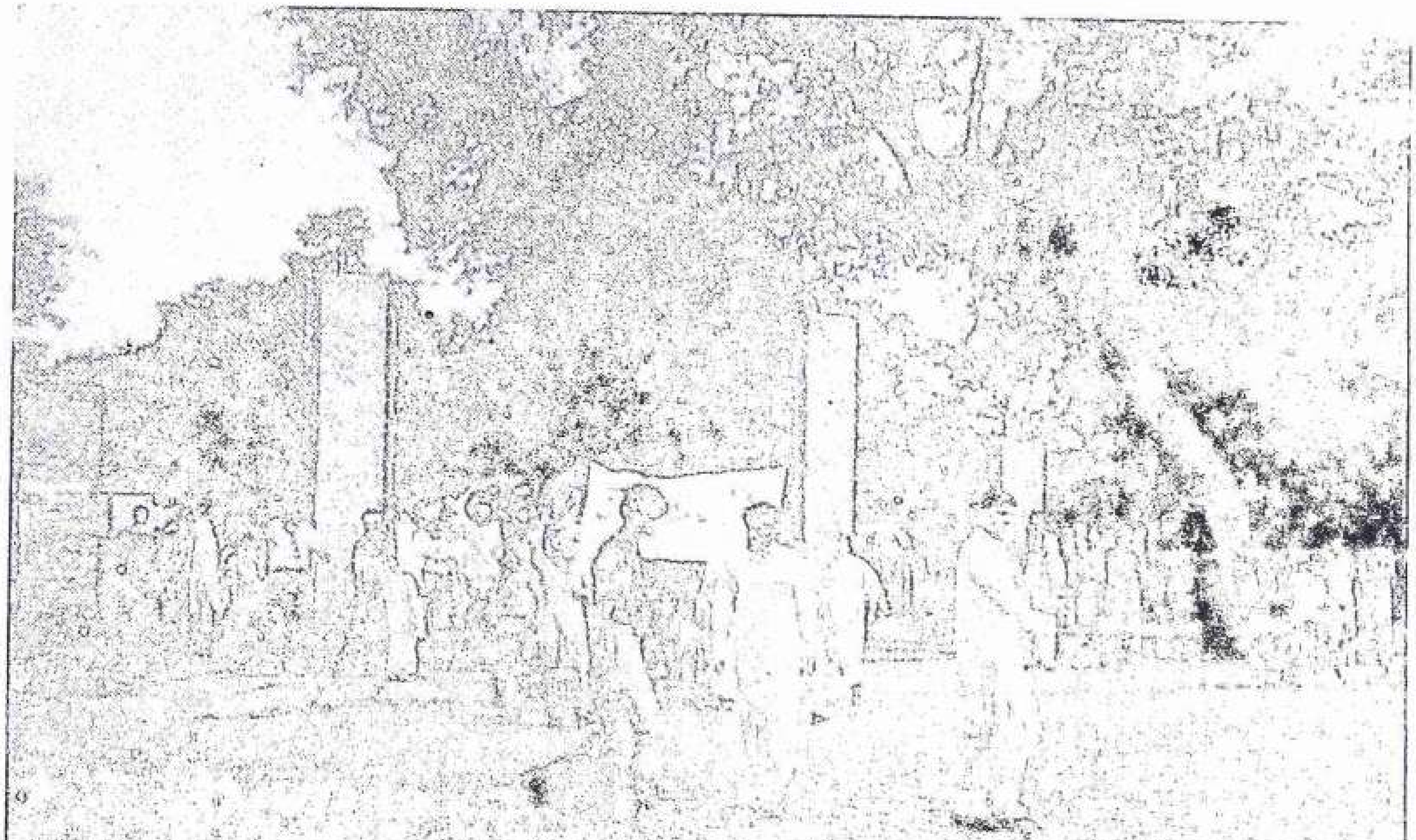

جلوس سے آگے پولیس اہلکار کو خبردار کرتے ہوئے

جب برادر تصور نقوی کو پولیس مزید ریمانڈ کیلئے عدالت میں لائی تو ڈاکٹر صاحب دوڑ کر اپنے ساتھی کے پاس گئے اور ان سے خیریت دریافت کی۔ جب تصور بھائی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب ان لوگوں نے مجھ پر بے پناہ تشدد کیا ہے تو آپ نے بے ساختہ کہا "ذہنی طور پر پھر تیار ہو جاؤ یہ اور بھی ماریں گے۔ یہ وقت حوصلے سنبھالنے کا ہے حوصلے ہارنے کا نہیں"

یاد رہے کہ برادر تصور نقوی ۲ مئی ۱۹۸۵ء کو انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے ہاسٹل میں ہونے والے بم دھماکہ میں شدید زخمی ہوئے تھے جبکہ دو امامیہ برادران سید تنصیر حیدر اور راجہ محمد اقبال نے جام شہادت نوش کیا تھا۔ یہ بم دھماکہ اس وقت ہوا تھا جب آئی۔ ایس۔ او کے برادران لٹن روڈ لاہور پر امام خمینی کے عرب نمائندہ سید مہدی الحکیم (جنہیں سوڈان ہوٹل میں شہید کر دیا گیا) کا خطاب سن کر اپنے کمروں میں واپس لوٹے تھے۔ امامیہ برادران نماز ادا کر رہے تھے کہ ایک نامعلوم شخص نے دروازہ کھول کر دستی بم پھینکا تھا۔

یہ بات ملک کے حساس اداروں کے ذہن میں ٹھونس دی گئی تھی کہ ملت جعفریہ کے نوجوانوں کی کردار سازی ڈاکٹر محمد علی نقوی کرتے ہیں اور وہ ایک ایسا ذہن ہے جو انقلاب کی راہیں تراشتا ہے۔ مارشل لاء دور یا اس کے بعد کے ظالمانہ دور میں جب بھی پولیس نے ملت جعفریہ کے نوجوانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا انہوں نے طلباء سے ڈاکٹر محمد علی نقوی کے بارے میں ضرور پوچھا۔

ایک مرتبہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طلبہ گرفتار ہوئے تو پولیس نے ان سے ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیوں کے بارے میں سوالات کیئے جب یہ نوجوان تحریک جعفریہ کے دفتر لوٹے تو ڈاکٹر صاحب بالائی منزل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے جب رہا شدہ برادران کی خیریت دریافت کی تو انہوں نے پورا ماجرا سنایا کہ پولیس آپ کے بارے میں تفتیش کرتی تھی" یہ سن کر ڈاکٹر صاحب قدرے طیش میں آئے اور فرمایا " بدبختوں کی حالت دیکھو میرے بارے میں اگر کچھ معلوم کرنا ہے تو مجھ سے کریں دوسروں سے معلوم کرنے سے انہیں کیا ملے گا۔ یہ لوگ جرأت سے خالی ہیں خواہ مخواہ ہمارے معصوم طلباء کو ہراساں کرتے ہیں"

آپ روایتی رہنماؤں کی طرح اپنے عقیدتمند نوجوانوں کو مصائب میں تنہا نہیں چھوڑتے تھے بلکہ ان کی ایک ایک پل کی خبر لیتے تھے۔ نوجوانوں کی تعلیم اور روزگار میں مثالی تعاون کرتے تھے۔ تعلیمی میدان میں کوئی مسئلہ سر اٹھاتا تو آپ اس کے حل تک چین سے نہ بیٹھتے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار کے مسائل آڑے آتے تو آپ حتیٰ المقدور اسکی ملازمت کا بندوبست کرتے۔ ایک عام ملازمت سے اعلیٰ ملازمت تک کے حصول کیلئے آپ نوجوانوں کی بھرپور مدد کرتے۔ آپ کے دفتر میں بے روزگار نوجوانوں کے کاغذات موجود رہتے تھے جہاں بھی آپ کا بس چلتا اور جہاں تک چلتا آپ سعی فرماتے۔ ایک مرتبہ آپ نے لاہور کے پرائیویٹ اداروں کے شیعہ اعلیٰ افسران کو مقامی ہوٹل میں دعوت دی۔ جس میں مختلف فیکٹریوں کے بارہ۱۲ منتظم اور سربراہ شامل ہوئے آپ نے انہیں اپنی قوم کی بے روزگاری سے آگاہ کیا۔ جس کے بعد ان افسران نے تقریباً" دو سو افراد کو روزگار فراہم کیا۔

مجھے یاد ہے کہ جب مجھے لاہور میں نوکری کے حصول کیلئے ایک فوجی افسر کی سفارش درکار ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے ایک صبح مجھے ملٹری اسپتال بھیجا جہاں مجھے ایک بریگیڈیئر سے ملنا تھا۔ جونہی میں نے ان کے آفس میں چٹ بھیجی تو انہوں نے مجھے اندر بلایا پر تپاک طریقہ سے ملے اور کہنے لگے کہ آپ نے تاخیر کی ہے میں ایک گھنٹہ سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ تم ایک ایسے شخص کے عزیز ہو جس کے کام میں سستی کرنا گناہ ہے"

میری ملازمت کا دوسرا دور شیخ زید اسپتال لاہور تھا جہاں مجھے ڈاکٹر صاحب انگلی پکڑ کر لے گئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے میرے کاغذات جمع کرائے اور میں ان کی عنایات کی بدولت دو سال تک یہاں کام کرتا رہا۔ یہاں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ کچھ عناصر ہمارے پیچھے پڑ گئے جب میں نے ڈاکٹر صاحب پر صورتحال واضح کی تو انہوں نے مجھے بتائے بغیر ان عناصر تک رسائی حاصل کی اور ان سے دبنگ طریقہ سے کہا کہ "وہ ہمارے بھائی کے خلاف اپنی سازشیں سمیٹ لیں"

آپ بے روزگار نوجوانوں کو دیکھ کر مغموم ہو جاتے اور اکثر فرماتے کہ "ان کا وقت ضائع ہو رہا ہے" ایک مرتبہ آئی۔ ایس۔ او کے مرکزی دفتر میں آئے تو آٹھ

دس نوجوان چادریں تانے سو رہے تھے۔ آپ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ انہیں جگا دیں۔ جب تمام برادران جاگ بیٹھے تو آپ نے مزاح کیا کہ "نکمّے سوئے ہوئے ہو اٹھو کام کرو۔" آپ نے ان نوجوانوں کی خیریت دریافت کی اور تعلیمی صورتحال کے بارے میں بھی استفسار کیا۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ تقریباً" تمام کے تمام بے روزگار ہیں تو آپ خاصے رنجیدہ ہوئے۔ کمرے سے باہر نکلے تو اپنے ساتھی سے کہا کہ ان تمام احباب کے کاغذات دفتر لے آئیں آپ نے اس مسئلہ کو نہایت سنجیدگی سے لیا اور ان برادران کو مختلف ملازمتوں میں کھپا دیا۔

بہت سے احباب ایسے بھی ہوتے تھے جو معمولی ملازمتوں کو اناء کا مسئلہ بنا لیتے تھے مگر آپ فرماتے "بہتر میں رہ کر بہترین کی کوشش کریں" بے روزگاری میں وقت ضائع ہوتا ہے جبکہ آپ کسی ادارہ میں رہ کر بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں ایک دوست بار بار آپ پر واضح کرتا تھا کہ اسکی ملازمت اسکے معیار اور تعلیم کے مطابق نہیں ہے جس سے اسکی عزت نفس مجروح ہوتی ہے' آپ نے فرمایا "عزیز دوست عزت اتنی سستی نہیں ہے جسے آپ ناک پر رکھ کر پھرتے رہیں۔ آپ کے بقول جو آج آپ کی اناء مجروح ہو رہی ہے یہ بھی زندگی کے تجربات کا حصہ ہے۔ اناء کو جتنا ختم کرو گے اتنا آگے بڑھو گے"

ایک مرتبہ جھنگ کا ایک نوجوان آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ "ڈاکٹر صاحب میرے حالات ناسازگار ہیں اگر آپ مجھے رہائش مفت دلوادیں تو میں مزدوری کرکے یہاں گزارہ کر لوں گا" آپ نے ایک دوست کا مکان اسے دلوایا اور ایک روز اسکی موجودگی میں چند احباب سے کہا کہ میرے زیر تعمیر کلینک کی دیواروں پر پانی ڈالنے اور دروازے وغیرہ رنگ کرنے کیلئے مزدور کی ضرورت ہے۔ آپ کی بات سن کر اس نوجوان نے حامی بھرلی جب آپ دوسری صبح کلینک پہنچے تو اس نوجوان کو کام میں مصروف پایا۔ آپ اسے دیکھ کر ایک لمحہ کیلئے حیران ہوئے اور تھوڑی دیر بعد اسے شاباش دی اور ساتھ ہی اپنے رفقاء کو بتایا کہ "یہ نوجوان ترقی کرے گا۔ یہ پڑھا لکھا ہے اور سادات گھرانے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس نے مزدوری کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا بلکہ اپنے جد کی سنت پر عمل کرکے ہمیں درس دیا ہے۔"

اس واقعہ کے بعد آپ خاصے متاثر ہوئے اور پھر ہر بے روزگار نوجوان کو یہ واقعہ سنا کر کام کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ دور دراز علاقوں سے لاہور آئے ہوئے نوجوانوں کو رہائش اور جیب خرچ تک دیتے مگر ان پر واضح کرتے کہ وہ یہاں ٹیوشن پڑھائیں یا ملازمت تلاش کریں البتہ گھروں کو واپس نہ لوٹ جائیں کیونکہ وہاں وہ ہر طرح سے ناکارہ ہو جائیں گے۔

آپ نے نوجوانوں کی ہر سطح پر مدد کی' اخلاقی اور مالی امداد کے علاوہ آپ نے شادیاں تک کرائیں۔ آج بیسوں افراد ایسے ہیں جو لاہور میں سفیر انقلاب کی شفقت کی بدولت بر سر روزگار اور صاحب خانہ ہیں۔

مردم شناسی کا فن بھی خدا نے آپ کو حیران کن حد تک بخشا تھا۔ آپ چہرے کے تیور پڑھ کر دلوں کے معاملات کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ آپ اپنے رفقاء کی صلاحیتوں' مزاج' فطرت اور توکل سے کما حقہ واقف تھے۔ آپ ہر شخص کو اس کی استطاعت اور فطری مزاج کے مطابق کام بتاتے البتہ افراد سازی میں آپ ہر نوجوان کو مرحلہ وار تیار کر کے کامیابیوں کے مدارج میں لاتے۔ آپ ایسے نوجوانوں کو بھی تنظیمی محفلوں میں لے آتے جو بالکل خاموش بیٹھے رہتے تھے مگر آپ ان کے بارے میں فرماتے اگر یہ نوجوان رہنمائی نہیں کر رہے تو کم از کم سن تو رہے ہیں کہ ترقی کے راستے کونسے ہیں۔ حیات کا مقصد کیا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا اور ہماری قومی ذمہ داریاں کیا ہیں ....؟

آپ کی خواہش تھی کہ آپ کے تنظیمی رفقاء ہر لحاظ سے جامع شخصیت ہوں۔ آپ نوجوانوں کی والدین سے کہیں زیادہ سرپرستی فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ گفتگو کے انداز تک کا جائزہ لیتے۔ ایک دفعہ لاہور میں ایک مرکزی رہنما نوجوان نے طلباء کو درس دیا جس میں ڈاکٹر صاحب بھی موجود تھے۔ درس کے اختتام پر آپ نے خطاب کرنے والے رفیق کی گفتگو پر علیحدگی میں عدم اطمینان کا اظہار فرمایا۔ رفیق سے کہنے لگے کہ "آپ گھنٹہ بھر کی گفتگو کا نتیجہ نہیں نکال سکے" آئندہ اپنی گفتگو کو نتیجہ خیز بنانے کی کوشش کریں"

آپ کے بتائے گئے چند اصولوں پر عمل کرتے ہوئے جب اس نوجوان نے کئی

ایک مقامات پر مؤثر گفتگو کی تو آپ نے نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ بعض محافل میں ان کے خطاب کو سراہا۔

ایک دفعہ خانہ فرہنگ ایران لاہور میں ایران کے وزیر تعلیم اور ان کے ساتھ اعلیٰ وفد پاکستان کے دورے پر آیا تو آپ نے ان سے ملاقات کا پروگرام ترتیب دیا۔ آپ اپنے ساتھ طلباء کا اہم وفد لیکر ان کے ہاں پہنچے۔ کئی گھنٹوں تک ان سے مختلف تعلیمی موضوعات اور نظام تعلیم پر گفتگو ہوئی۔ آئی۔ ایس۔ او کے سابق مرکزی صدر برادر ڈاکٹر عامر رضا دستی نے انگریزی میں بڑے اعتماد اور روانی سے گفتگو کی تو ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ واپسی پر راستہ میں ان کی بھرپور حوصلہ افزائی فرمائی اور ساتھ ہی ہمیں تاکید بھی کی کہ آئندہ سے آپ لوگ انگریزی اخبارات کا مطالعہ کریں۔

آپ کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ تنظیمی نوجوان اپنے سے بہتر افراد کے ساتھ زندگی گزاریں اور بہتر ماحول میں پروان چڑھیں۔ آپ کی "وصیت" میں بھی یہی تاثر آپ کے فکر کی عکاسی کرتا ہے آپ مسلسل اس جہد میں رہے کہ قوم کے سپوت خوش بخت بنیں اور وہ کردار اور معیار کے حوالہ سے دیگر نوجوانوں سے ممتاز ہوں۔

آپ کا معمول تھا کہ آپ تنظیم کے چند معتمد نوجوانوں کو بڑی بڑی شخصیات سے ملاقات کیلئے اپنے ساتھ لے جاتے۔ کئی بار ہمیں بھی آپ کے ساتھ ملکی و غیر ملکی انتہائی اعلیٰ شخصیات سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بعض دفعہ ہم گفتگو سے محظوظ بھی ہوئے اور بعض اوقات بوریت کا شکار بھی ...... مگر آہستہ آہستہ ہم پر یہ عقدہ کھلتا گیا کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے معیار کو بلند اور ہماری برین واشنگ (Brain Washing) کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ لاہور کے معروف معالج ڈاکٹر سہیل صاحب نے ماڈل ٹاؤن میں اپنی رہائش گاہ پر پولیس کے اعلیٰ حکام بھاری بھرکم سیاسی شخصیات اور صحافی حضرات کو عشائیہ دیا جس میں سفیر انقلاب کے ایک تربیت یافتہ نوجوان نے بھی اپنے ایک صحافی دوست کے ہمراہ شرکت کی۔ ان ایام میں "فرقہ واریت" پولیس اور حساس اداروں میں خاصی تشویشناک تھی اسلیئے وہاں بیٹھے بیٹھے یہ عنوان موضوع گفتگو بن گیا۔ ڈی۔ آئی۔

جی اسپیشل برانچ تنویز حمید مرحوم بڑے دلائل کے ساتھ تحریک جعفریہ اور مخالف تنظیم کی کارکردگیوں پر بات کر رہے تھے جبکہ کچھ لوگ لاعلمی اور بعض افراد خوشامدانہ لہجے میں "جناب بجا فرما رہے ہیں" کہہ رہے تھے ایک مرحلہ پر جب سفیر انقلاب کے رفیق کو بات کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے تحمل اور دلائل کیساتھ اس قدر وزنی گفتگو کی کہ وہاں پر موجود شخصیات نوجوان کا منہ تکنے لگیں۔ اس برادر نے اپنی گفتگو کے دوران کئی بار معترض افراد سے اپنے مؤقف کا اعتراف کرایا اور بے ساختہ داد حاصل کی۔ کھانے کے اختتام پر جب ڈی۔ آئی۔ جی نے نوجوان کا تعارف چاہا تو وہاں پر موجود تحریک جعفریہ کے مخالف، نام نہاد شیعہ مذہبی رہنما نے کہا یہ آئی۔ ایس۔ او کا چھوکرا اور ڈاکٹر نقوی کا چیلہ ہے" محفل برخاست ہونے لگی تو تنویر حمید نے نوجوان کی صلاحیتوں کو سراہتے ہوئے اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ جبکہ ڈاکٹر سہیل صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ میری زندگی کا یہ پہلا نوجوان تھا جو بھاری بھر کم شخصیات کے درمیان، انتہائی ادب، تحمل اور احتیاط کے ساتھ بولا۔ اس نے کم وقت میں نظریہ اور دہشت گردی .... حقائق اور سازشوں کا آئینہ دکھا کر ہمیں متحیر کر دیا ہے"

سفیر انقلاب کے نظریاتی برادران جہاں جہاں بھی موجود ہیں اپنے کردار، افعال اور ذہنی معیار کا ایک وزن رکھتے ہیں۔ بہت سے افراد اس بات سے آگاہ تھے اور ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک فوج تیار کی ہے جو اسلامی نظریات کی سلطنت کی محافظ ہے یہی وجہ ہے کہ آج کسی کو بھی اس سلطنت پر جارحیت کرنے کی جرآت نہیں ہے۔

ملک بھر میں پھیلے ہوئے باشعور اور حق پرست نوجوان کسی لمحہ کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان پر ڈاکٹر صاحب کے ماہ وسال صرف ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہر نوجوان کو کئی مراحل سے گزار کر نکھارا ہے۔ نوجوان خود اس بات کے شاہد ہیں کہ سفیر انقلاب نے انہیں حسبت یا پیتل سے سونا اور سونے کو کندن بنایا ہے۔

آپ کا معمول تھا کہ ہر نوجوان سے اس کے معیار کے مطابق گفتگو کرتے اور غیر محسوس انداز میں اسے تیار کرتے۔ آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ ملت کا ہر نوجوان زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے اور اپنے ذہنی معیار کو بلند کرے، ایک مرتبہ آپ

کے دفتر میں کام کرنے والے ایک ساتھی نے آپ کے ساتھ شہید قائد کی برسی پر "پیواڑ" پاڑا چنار جانے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے مشروط طور پر لے جانے کا وعدہ کیا۔ آپ نے شرط یہ عائد کی کہ وہ نوجوان وہاں پر موجود تمام تنظیمی برادران کو "کمپیوٹر" (Computer) کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرے گا۔

شرط پر رضا مندی کے بعد اس ساتھی نے دو تین روز میں کمپیوٹر کے متعلق خوب تیاری کی ان کا کہنا ہے کہ اس نے دو تین دنوں میں ایسی ایسی معلومات اکٹھی کیں جو ایم۔ ایس۔ سی تک اسے حاصل نہ تھیں۔ دورانِ سفر ڈاکٹر صاحب نے اس ساتھی سے گاڑی میں موجود احباب کو لیکچر دلوایا اور "پیواڑ" جاکر بھی اعادہ کرایا۔

آپ عموماً تنہا سفر کرنے سے گریز کرتے تھے آپ کی خواہش ہوتی تھی کہ کوئی نوجوان آپکا ھمسفر رہے۔ بعض اوقات سفر پر روانگی سے قبل آپ اپنے ساتھی پر واضح کرتے کہ وہ دورانِ سفر آپ کو "فلاں" عنوان پر لیکچر دے اس طرح آپ کا ھمسفر خود بھی مطالعہ کرتا اور آپ کی معلومات میں بھی اضافہ کا باعث بنتا۔

آپ کی گاڑی میں بھی ایک آدھ کتاب ضرور پڑی رہتی تھی آپ گاڑی چلاتے تو ساتھ والے دوست سے کتاب پڑھ کر سنانے کی خواہش کرتے۔ چونکہ آپ پیشہ وارانہ طور پر ماہر نفسیات بھی تھے اس لیئے آپ ایک پل کیلئے بھی ھمسفر کو اکتانے نہ دیتے۔ خوب مزاح کرتے، ہنستے اور ہنساتے مگر تہذیب کا دامن کبھی بھی آپ کے ہاتھوں سے نہ چھوٹ پاتا۔ آپ کی ہر ادا ایک پیغام اور ہر بات ایک درس ہوا کرتی تھی۔

آپ کا دستور تھا کہ آپ انگریزی اخبار یا کسی لٹریچر میں کوئی معلوماتی مضمون پڑھتے تو اسکی فوٹو کاپی یا کٹنگ لے لیتے اور اسے متعلقہ نوجوانوں تک پہنچاتے۔ آج بھی کئی نوجوانوں کے پاس آپ کے دیئے ہوئے تراشے موجود ہیں آپ حضرت علی علیہ السلام کے فرمان کو اکثر دہرایا کرتے تھے کہ "علم ہماری میراث ہے جہاں سے ملے حاصل کرو" ایک مرتبہ آپ نے مجھے انگریزی اخبارات ہفت روزہ تکبیر، ہفت روزہ زندگی پڑھنے کی تاکید فرمائی تو میں نے واضح کیا کہ "ڈاکٹر صاحب اتنا وقت اور پیسہ نہیں ہے"۔ آپ نے فرمایا "وقت آپ نکالیں لٹریچر کے اخراجات ہم برداشت کریں

گے" مگر اس شرط کے ساتھ کہ آپ نے Out Put دینا ہے۔ یہاں انہوں نے حوصلہ دیتے ہوئے فرمایا "یاد رکھو! کہ میدان صحافت کے نامور بزرگ صحافی جن کا آج ملک میں طوطی بولتا ہے تمہاری عمر میں اتنے اچھے لکھاری نہ تھے۔ انہوں نے محنت کی ہے۔ آپ لوگ محنت کریں ہمیں اپنی قوم میں مشاہد حسین، صلاح الدین، مجیب الرحمٰن شامی اور ارشاد حقانی وغیرہ چاہئیں"

ایک دفعہ میں آپ کے ساتھ راولپنڈی جا رہا تھا۔ دورانِ سفر آپ نے اپنے بریف کیس سے ہفت روزہ "زندگی" لاہور نکالا اور اس میں رؤف طاہر کی لکھی ہوئی ایک رپورٹ دکھائی جو سانحہ پنجاب یونیورسٹی (جو آئی۔ ایس۔ او اور اسلامی جمیعت طلبہ کے درمیان رونما) ہوا کے بارے میں تھی جس میں آئی۔ ایس۔ او پر خاصی تنقید کی گئی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اس صحافی نے نہایت احتیاط کیساتھ اپنا مؤقف بیان کیا ہے اور ہم پر جامع تنقید کی ہے۔ آپ اس کے انداز پر غور کریں اور اسی انداز میں اپنا مؤقف اپنے رسائل میں پیش کریں۔

بعض اوقات ملکی اخبارات میں کام کرنے والے چند احباب کے بارے میں آپ کا دل کڑھتا تھا آپ فرماتے تھے کہ یہ لوگ صرف اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ آج تک ادارتی صفحات، میگزین وغیرہ میں ان کے مضامین کبھی شائع نہیں ہوئے نہ انہوں نے اپنے قلم سے مسلمانوں تک اپنی فکر پہنچائی ہے۔

آپ نے کئی بار اس خواہش کا بھی اظہار فرمایا کہ "قائد ملت جعفریہ پاکستان" کے پاس ایک ایسے شخص کا ہونا اشد ضروری ہے جو انہیں دن بھر کے اخبارات، ملک بھر کے میگزین، ملکی و بین الاقوامی نشریات سے مکمل طور پر آگاہ رکھے۔ آپ فرماتے تھے کہ قیادت کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ صرف حالات حاضرہ کی خبریں اور واقعات پڑھتے رہیں۔ ان پر قومی اور ملکی امور کا بے پناہ بوجھ ہوتا ہے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم انہیں ہر خبر سے آگاہ رکھیں۔ آپ نے انکشاف کیا کہ آج ایجنسیوں اور سفارت خانوں میں تمام رہنماؤں کی سرگرمیاں، اخباری بیانات کمپیوٹرائزڈ ہیں وہ جس وقت جس مذہبی یا سیاسی رہنما کا بیان دیکھنا چاہیں بٹن دبا کر دیکھ لیتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو اس رہنما نے کیا کہا تھا........؟

اپنے بڑے فرزند سلمان نقوی کے ساتھ ....بازو پر مخصوص کوٹ اور ہاتھ میں اخبار لئے ہوئے۔

آپ بریفنگ دینے اور لینے کو خاصی اہمیت دیتے تھے۔ آپ کہتے تھے کہ علم تقسیم (Knowledge Share) کرنے سے انسان ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ آپ فطرتاً "Maximum Gain And Minimum loss" (زیادہ سے زیادہ حصول اور تھوڑے سے تھوڑا ضیاع) کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ آپ اپنے ذہن میں جتنا بڑا منصوبہ تیار کرکے بیٹھے ہوتے تھے پھر بھی معتمد رفقاء سے مشورہ ضرور کرتے۔ آپ حضرت امام حسن علیہ السلام کے فرمان "بے صبری سے زیادہ نقصان دہ اور مشاورت سے زیادہ فائدہ مند کوئی چیز نہیں ہوتی" کی اطاعت کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا سینہ معلومات کا خزینہ تھا۔ آپ پیشہ وارانہ طور پر ڈاکٹر تھے مگر زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں آپ کو خاصی معلومات حاصل تھیں۔

آپ کی خواہش تھی کہ تحریک جعفریہ پاکستان اپنا ایک سیکریٹریٹ بنائے جس میں تمام شعبہ ہائے زندگی کے ماہرین موجود ہوں اور ان سے استفادہ کیا جائے۔

آپ کو یہ شکوہ بھی رہا کہ تحریک جعفریہ افراد پیدا نہیں کر رہی آپ کہا کرتے تھے کہ آئی۔ ایس۔ او نے ہزاروں نوجوان تیار کیئے ہیں مگر شومئی قسمت کہ وہ تحفظ کی چھتری نہ ملنے کے باعث معاشرہ میں تقریباً بے سمت زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس جماعت اسلامی نے اسلامی جمعیت طلبہ کے تربیت یافتہ نوجوان جذب کیئے ہیں۔ جو اس وقت جماعت کے روح رواں ہیں۔ آپ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ "ہم باب العلم" کے پیروکار ہیں ہمارا ذہنی معیار دیگر تمام مکاتب فکر سے بلند ہے مگر ہمارے نوجوان تنظیمی "Set up" نہ ہونے کیوجہ سے آج دو دو تین تین ہزار کیلئے اپنی صلاحیتیں زنگ آلود کر رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان کے ذہن سے معاشرے کا عام تاجر تو فائدہ حاصل کر رہا ہے مگر ہماری قوم محروم ہے۔

جنوری ۱۹۹۴ میں سفیر انقلاب نے معتمد نوجوانوں کے ایک گروہ کو اکٹھا کیا اور ان سے اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ "وہ قومی فلاح بالخصوص تعلیم کے میدان میں کام کریں، اسکول اور ادارے سنبھالیں، کم از کم ہر تحصیل میں اسکول قائم کریں اور سرکاری ملازمتوں کا خیال ترک کر دیں۔ "اسلامک ایجوکیشن کونسل" انہیں سرکاری اداروں سے زیادہ مراعات دینے کو تیار ہے" گفتگو کے دوران میں ایک دوست نے

سرکاری ملازمت کی پنشن کا ذکر کیا تو آپ نے جواباً" کہا کہ "اسلامک ایجوکیشن کونسل نہ صرف آپ کو پنشن دے گی بلکہ آپ کی بیمہ پالیسی کا اجراء بھی کرے گی تاکہ کسی بھی حادثاتی موڑ پر آپ کے پسماندگان کو معقول رقم مل سکے"

آپ کے قومی درد اور خلوص کی بنا پر تمام احباب قومی فلاح کیلئے کام کرنے پر آمادہ تھے مگر ہر شخص شاید یہ سمجھتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب پانی کے سینے پر تیرتا ہوا ایک بلبلہ ہیں جن کے بعد انہیں سہارا دینے والا کوئی نہ ہوگا۔

آج بھی تحریک جعفریہ اور امداد فاؤنڈیشن کے مرکزی دفاتر میں آپ کے ہاتھوں سے بنے ہوئے قومی اداروں کے نقشے، فلاحی شعبے، انتظامی ڈھانچے اور ملازمین کے تنخواہ اسکیل وغیرہ موجود ہیں جو اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ ایک شخص اپنی قوم کیلئے دل میں درد کا طوفان رکھتا تھا، وہ تنہا حکومتوں جتنے کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں کائنات تھا اس کا نظریہ تھا۔

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اتر جائیگا

یوں تو آپ اپنی قوم کے ہر نوجوان سے محبت کرتے تھے مگر متقی اور ذہین نوجوانوں سے آپ کو عشق تھا۔ جب بھی تنظیمی عہدہ کیلئے کسی متقی نوجوان کا انتخاب ہوتا تو آپ بے حد خوش ہوتے اور فرماتے الٰہی تنظیم کیلئے خدا سے محبت کرنے والے افراد کا چناؤ خوش آئند ہے۔ فطرت کے میلان کے باعث آپ کو آئی۔ ایس۔ او کے سابق مرکزی عہدیداران جو دین کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ایران میں زیر تعلیم ہیں سے بے حد محبت تھی یہاں تک کہ یہ برادران جب بھی کسی محفل میں آتے تو ڈاکٹر صاحب ان کا اٹھ کر استقبال کرتے۔ ان برادران کے ایران سے جب ڈاکٹر صاحب کو خطوط آتے تو آپ یہاں دروس کی محفلوں میں وہ خط پڑھ کر سناتے اور نہایت پرمسرت انداز میں برادران کی تعریف کرتے۔

ایک مرتبہ ایران سے برادران کا ایک خط آیا جس میں چند برادران کے درس

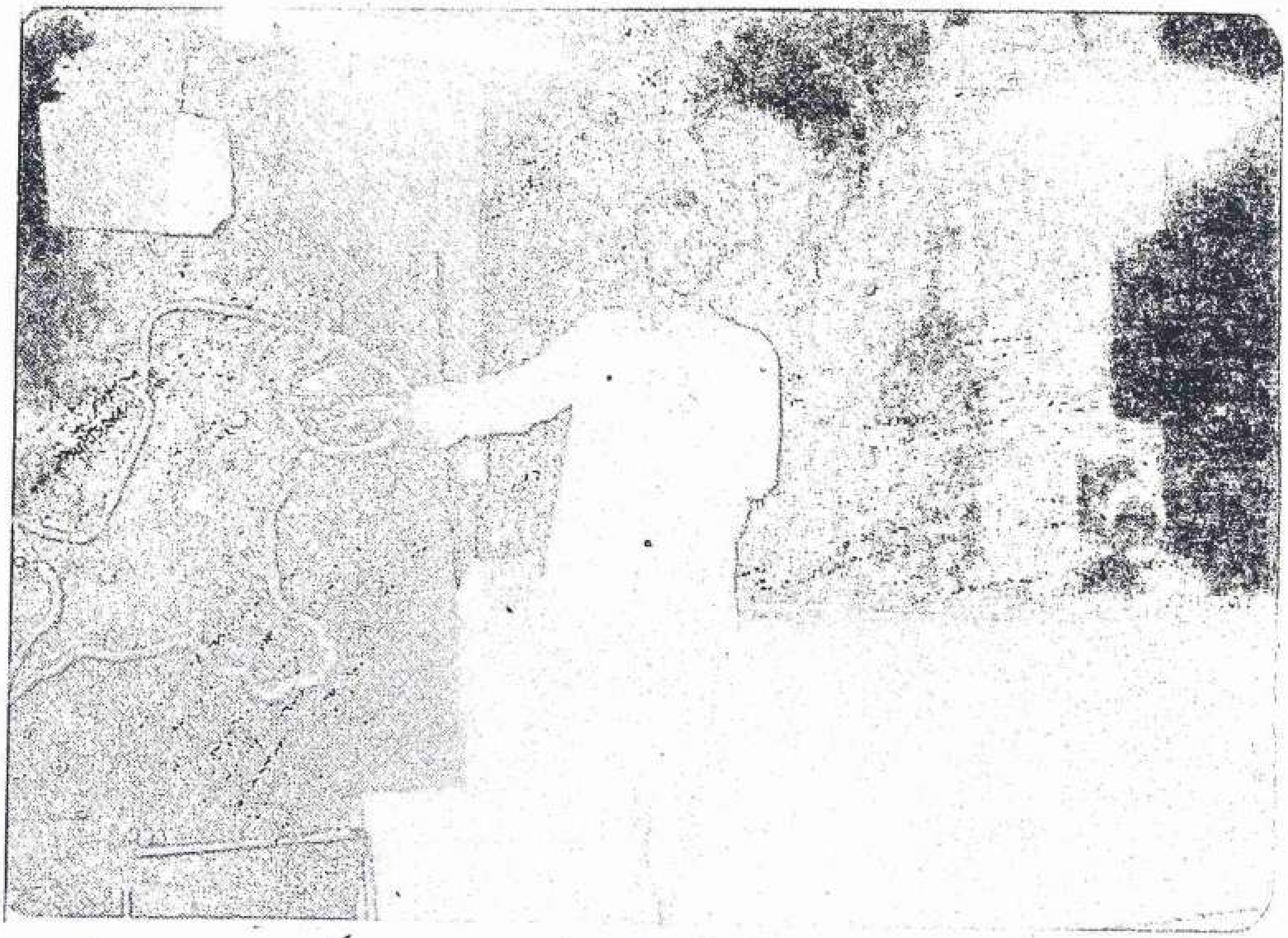

آئی۔ایس۔او کے نوجوانوں کو ملکی نقشہ کے مطابق اہم لیکچر دیتے ہوئے۔

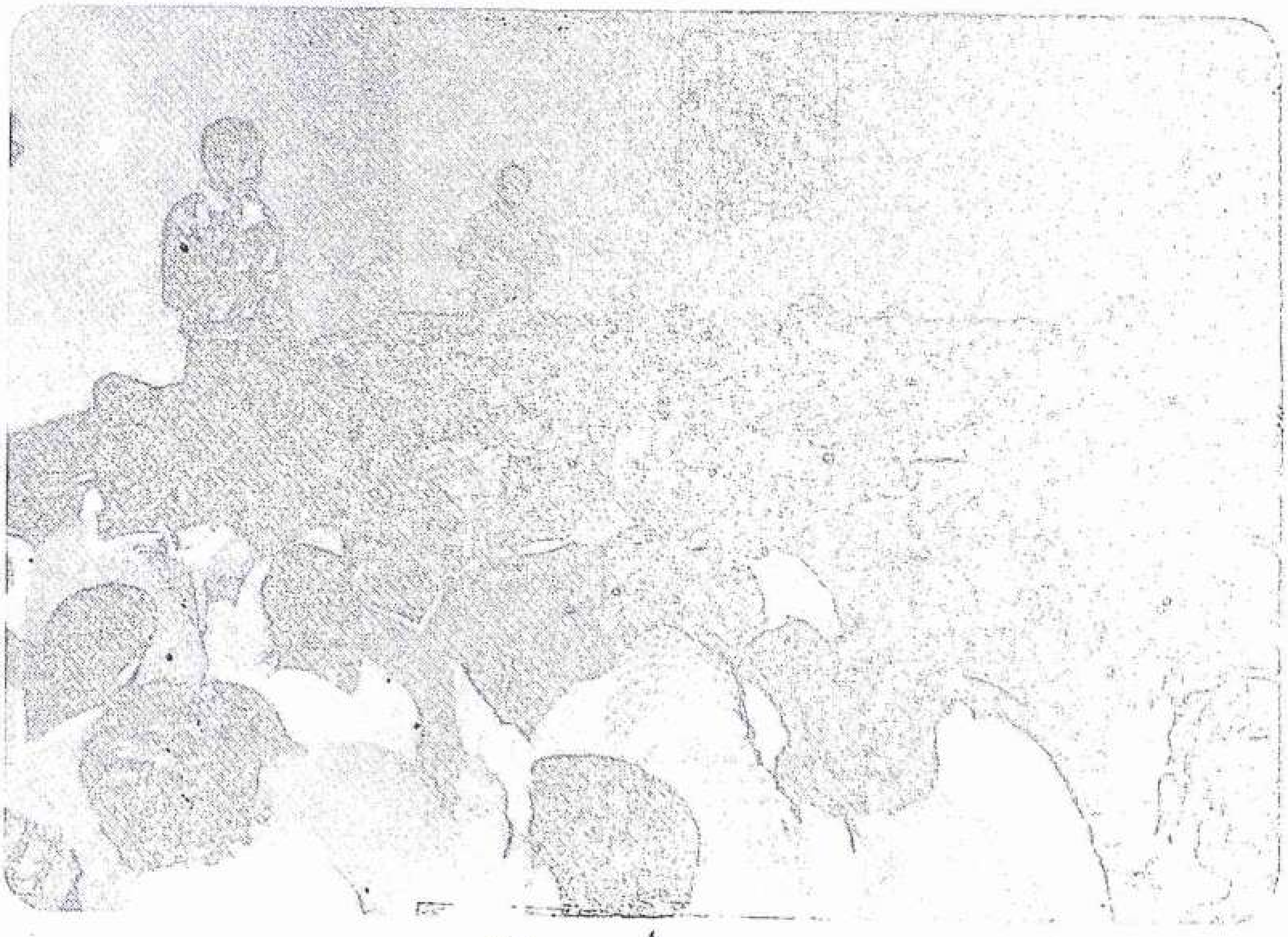

امامیہ اسکاوٹس سے خطاب

خارج میں پہنچنے کا تذکرہ تھا۔ آپ یہ خط پڑھ کر بے حد خوش ہوئے اور کئی مقامات پر تذکرہ فرمایا اور دعا دی۔ آپ کے ان تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے آپ طویل مسافت کے بعد منزل کے قریب پہنچ گئے ہیں۔

بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ سفیر انقلاب بیک وقت نوجوانوں کے بھائی' مہربان اور والدین جیسے مشفق تھے۔ انہوں نے نوجوانوں کو خدا کی سمت جانے والے راستوں سے آگاہ کیا' انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ و آل محمد علیہم السلام کی شفاعت کی راہوں کی رہنمائی کی۔ انہوں نے کسی تنظیمی بھائی کے شباب کو بے لگام نہ چھوڑا' انہوں نے نوجوانوں کو پستیوں سے اٹھا کر بلندیوں پر سوار کیا' آپ تعلیم و تربیت میں کئی نوجوانوں کا سہارا بنے اور آپ کئی پردیسی نوجوانوں کی کفالت کی۔

لاہور میں مجھ سمیت کئی برادران ایسے ہیں جنھوں نے اپنے آشیانے ڈاکٹر صاحب کی شفقت اور سرپرستی کے سہارے آپ کے گھر کے قریب بنائے ہوئے ہیں۔

بارہویں جماعت کے نصاب میں انگریزی کی ایک کہانی ''سمندری بگلے کی پہلی اڑان'' (First Flight Of Sea-Gull) کا خاکہ اگر کسی قاری کے ذہن میں ہے تو وہ میری اس بات کو گہرائی تک سمجھ سکتا ہے کہ سفیر انقلاب نے بہت سے نوجوانوں کو پہلی پرواز دی' انہیں فضا میں اڑایا' انہیں اعتماد دیا' ان کے سینے میں اڑان کا درد اور پرواز میں فتح کی چھنکار بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملک کی فضاؤں میں سفیر انقلاب کے نوجوانوں کی اڑان کا شور موجود ہے۔

سفیر انقلاب نے کئی افراد کو اپنے زخمی ہاتھوں سے اتنا بلند تعمیر کیا کہ اگر وہ نیچے اپنے نقطہ اساس کو دیکھیں تو ان کے حواس پگھلنے لگتے ہیں۔ بہت سے احباب کا خیال ہے کہ ماں نے انہیں انسان جنا .... تنظیم نے انہیں انسان بنایا .... اور ڈاکٹر صاحب نے انہیں انسانیت اور تہذیب سکھائی .....

انسانی فطرت ہے کہ وہ دنیاوی مشکل حالات کا سامنا کرنے کیلئے سرمایہ اکٹھا کرتا ہے' اپنے بچوں کیلئے جائیدادیں بنانے کی کوشش میں رہتا ہے' اپنے بڑھاپے کے سہارے کیلئے پونجی بچاتا ہے مگر سفیر انقلاب نے اپنی زندگی میں دو اثاثے جمع کیئے ہیں ایک ''اعمال'' جو وہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں دوسرے ''نوجوان'' جنہیں وہ قوم کیلئے

چھوڑ گئے ہیں۔ شاید آپ نظریاتی فوج کو دیکھ کر یقین سے کہا کرتے تھے۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے۔

☆☆☆☆☆

سفیر انقلاب اور سامراج

۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو برصغیر کی کوکھ سے جنم لینے والے معصوم پاکستان کو جو پہلی بیماری لاحق ہوئی وہ امریکی مداخلت کا سرطان تھا جو غیر محسوس انداز میں "Blood Cancer" کی شکل اختیار کرگیا۔ اگرچہ بانی پاکستان حضرت محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے چند ساتھیوں نے ملک کی قوت مدافعت بڑھانے اور فوری مرض سے بچنے کیلئے جتن کیئے مگر لیاقت علی خان کے قتل کے بعد ملکی وجود ضعف کا شکار ہوا اور موذی مرض غالب آگیا یہاں تک کہ وہ رفتہ رفتہ ناسور بن گیا۔

۲۴ سال بعد ملک کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے اپنی حکمت عملی کے تحت اس سرطان کا علاج کرنے میں بڑے بڑے پاپڑ بیلے مگر وہ نہ صرف ناکام رہے بلکہ خود بھی اس بیماری کی زد میں آکر اپنی جان بھی گنوا بیٹھے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ کو بھٹو کی معزولی اور پھر پھانسی کے بعد امریکی مداخلت پاکستان کی روح بن گئی جسے چھیڑنا ملکی بقاء کے خطرے کے مترادف ٹھہرا۔ اس دوران میں پاکستان امریکی ریاست کے روپ میں آیا اور یہاں امریکی سفیر نے بطور وائسرائے حکومت کی جس کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں امریکہ نے پاکستان کو اپنی چھاؤنی کے طور پر استعمال کرکے روس سے ٹکر لی اور افغانستان اور روس کی جنگ کو تاریخ کے دامن میں پھینکا۔ جس کی وجہ سے افغانستان کے لاکھوں مسلمانوں کا خون بہا، ملک کا شیرازہ بکھرا اور پاکستان کا جمہوری و سیاسی استحکام تباہ ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کے عوام ملک پر طاری مارشل لاء کے اندھیروں میں سسک رہے تھے انہیں دور دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی جبکہ امریکہ اس تاریکی سے مزید فائدہ اٹھاتے ہوئے ملکی نظام کی بنیادیں کھوکھلی کرنے میں مصروف تھا۔ اس صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے حریت پسند شاعر جناب حبیب جالب مرحوم نے لکھا تھا۔

کوئی تو پرچم لے کر نکلے چاک گریباں کا جالب
چاروں طرف سناٹا ہے دیوانے یاد آتے ہیں

یقیناً" ایسے ماحول میں جہاں جینا مرنے سے زیادہ مشکل تھا کوئی دیوانہ ہی آگے آسکتا تھا یا اگر ملک کا کوئی حقیقی مخلص اور ہمدرد آگے بڑھتا تو اسے دیوانہ ہی سمجھا جاتا ....

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ عین اسی دوران میں پاکستان کے پڑوس میں انقلاب اسلامی کی تحریک کامیاب ہوئی۔ شہنشاہ اپنا صد سالہ تاج عوام کے قدموں میں چھوڑ کر بھاگا .... ایران کے غیور عوام نے شہنشاہیت کے تاج اتارے اور تخت اچھالے .... سلاسل کی سلاخیں ٹوٹیں تو آزادی کا علم تھامے، ایک درویش منش اور بوریا نشین انسان' امریکی تخت و تاج کو تاراج کرنے کیلئے آگے بڑھا .... نور نے صدیوں پر محیط ظلمتوں کی تاریکیوں کا سینہ چیرا .... شفق کے رنگ بکھرے .... صنم کدوں میں اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہوئیں تو ہوا کے دوش پر نور کی کرنیں اور تکبیر کی گونجیں' پاکستان پہنچیں۔

یہاں کے ہر شخص اور ہر جماعت نے اپنے اپنے ادراک کے مطابق انقلاب ایران کا جائزہ لیا۔ البتہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان نے انقلاب اور روح انقلاب کو خوش آمدید کہنے کیلئے استقبالی جلوس نکالا جس میں پہلی بار ملک کی شاہراہوں پر "مردہ امریکہ" کا نعرہ گونجا۔ اسلامی جذبوں سے سرشار ان نوجوانوں کے جلوس دو طرح سے جرأت مندانہ تھے۔ ایک یہ کہ مارشل لاء کے شباب میں کسی کو اونچا سانس لینے کی اجازت نہ تھی دوم یہ کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ "مردہ باد امریکہ" کا نعرہ حکومت اور امریکہ کیلئے خطرے کا الارم تھا۔

عاشقانِ امام خمینیؒ پیغام امام خمینی لیکر سڑکوں پر نکلے تو ان پر لاٹھیاں برسیں .... سر زخمی ہوئے .... خون پھوٹا تو ہر قطرہ سے "مردہ باد امریکہ" کی صدا آئی .... یہاں تک کہ ظلم بڑھ کر اختتام کی جانب رواں ہوا۔ جبکہ خون ٹپک کر دائمی بنتا گیا۔ ایسے میں سفیر انقلاب جو میر کارواں تھے کی صدا گونجی دوستو!

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائیگا

آغاز میں "مردہ باد امریکہ" کا نعرہ نہ صرف امریکہ اور حکومت کیلئے تکلیف دہ تھا بلکہ خود ملت جعفریہ کے عوام اور زعماء کے لئے بھی حیران اور پریشان کن تھا۔ حکومت اور امریکہ تو اس کی گہرائی کا علم رکھتے تھے۔ مگر ملت مسلمہ پاکستان کو تاحال اس حقیقت کا ادراک نہ تھا۔ جب امام خمینی نے فرمایا کہ "مسلمانوں کی تمام تر مصیبتوں کا ذمہ دار امریکہ ہے۔ اس لیئے مرگ بر امریکہ کے نعرہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے" تب جا کر بہت سے لوگوں پر یہ عقدہ کھلا۔

امریکہ کے سابق صدر جارج بش کا پاکستان میں سرکاری دورے کا اعلان ہوا تو سفیر انقلاب نے اپنے احباب کو اکٹھا کیا اور یہ بات ان کے گوش گزار کی کہ "اسلام کا دشمن ہمارے ملک میں قدم رکھنے کا خواہشمند ہے لہٰذا یہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کے کانوں تک "Down with U.S.A" (مردہ باد امریکہ) کی صدا پہنچا دیں۔ نوجوانوں نے جب آپ کی بات سے اتفاق کیا تو آپ نے ان پر واضح کیا کہ " ایسا کرنے میں مار بھی پڑے گی ...... جیل بھی جانا پڑے گا اور تکلیفیں بھی برداشت کرنا پڑیں گی۔" احباب ذہنی طور پر تیار ہوئے تو آپ انہیں لاہور ایئر پورٹ پر لے گئے جہاں پہلے سے کرائے کے استقبالی مزدور، سرکاری دفاتر کے ملازمین اور پولیس کے اہلکار موجود تھے۔

سفیر انقلاب نے اپنے پروگرام کے مطابق احباب کو قطاروں میں کھڑا کر دیا اور پولیس کے اہلکاروں سے نظریں بچاتے ہوئے مزدوروں کی قطاروں میں جا گھسے .... باری باری تمام مزدوروں کو سمجھایا کہ امریکی صدر "Down with U.S.A" کے نعرہ پر بڑا خوش ہوتا ہے لہٰذا وہ اس کے استقبال پر یہ نعرہ بلند آواز میں لگائیں۔

آپ کے ساتھیوں نے "Dwon with U.S.A" کا بڑا بینر بغل میں دبایا ہوا تھا جبکہ آپ کے ہاتھ میں امریکی پرچم تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ جونہی جارج بش اور ضیاء الحق کی گاڑی عوام تک پہنچے اس کے سامنے بینر کھولنا اور امریکی پرچم نذر آتش کرنا ہوگا۔

پس جونہی مہمان اور میزبان کی گاڑی ایئر پورٹ سے عوام تک پہنچی، امام خمینی کے عاشقوں نے جارج بش کے سامنے "مردہ باد امریکہ" کا بینر کھولا اور بلند آواز میں

"Down with U.S.A" کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ اتنے میں ان پڑھ کرائے کے استقبالی مزدور بھی آگے بڑھے اور انہوں نے بھی سفیر انقلاب کے یاد کرائے گئے اس نعرہ کو بلند کیا۔ چنانچہ استقبال' احتجاج کی شکل اختیار کر گیا۔ جس کے باعث جارج بش کے چہرے پر زردی اور ضیاء الحق کے چہرے پر موت کی کیفیت طاری ہوگئی۔

یہاں ایک دلچسپ صورتحال اس وقت پیدا ہوئی جب سفیر انقلاب نے امریکی پرچم جلانے کیلئے اپنی پتلون کی جیب سے پٹرول کی بوتل نکالی تو وہ ڈھکنا کھلنے کے باعث خالی ہوچکی تھی یوں آپ اپنے فعل کو انجام دینے میں ناکام رہے۔

ابتدائی چند لمحوں میں نعروں کا شور سن کر پولیس اہلکاروں اور کمانڈوز کو بھی کچھ سمجھ نہ آیا کیونکہ انہیں اس قسم کی توقع تک نہ تھی تاہم جلدی سے انہوں نے ایکشن کیا۔ تمام نعرے لگانے والوں کو خاصی مار پڑی۔ سفیر انقلاب کے احباب مشخص ہونے کے باعث گرفتار کرلئے گئے جبکہ سفیر انقلاب پولیس کو چکمہ دے گئے۔ شاید آپ کی داڑھی اور بال بڑھے ہوئے تھے اس لئے وہاں پر موجود ایس۔پی آپ کے احباب سے بار بار استفسار کرتا رہا کہ وہ "بے حجامتا" کہاں گیا ہے ....؟

اس واقعہ کو بعض اپنے افراد نے تنقید کا نشانہ بنایا جس پر گرفتار ہونے والے ایک ساتھی نے علامہ سید عارف حسین الحسینی کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا اور اپنے خط میں اس فعل پر آپ کی رائے چاہی اس خط کا جواب "سفیر نور" نے اپنے مقدس ہاتھوں سے لکھا جس میں درج تھا کہ "امریکہ مردہ باد کا نعرہ بلند کرنا آپ کی اور ہماری ذمہ داری ہی نہیں بلکہ یہ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے"

کمانڈوز ایکشن کے باعث معاملہ رفع دفع ہوگیا مگر کئی روز تک گرفتار نوجوانوں سے تفتیش ہوتی رہی اس واقعہ کے بعد نہ صرف وفاقی حکومت کو تشویش ہوئی بلکہ امریکہ نے بھی پاکستانی حکومت سے نوٹس لیا۔

اس واقعہ سے قبل اگرچہ پاکستان کے عوام امریکہ سے متنفر تھے تاہم کسی جماعت نے اتنا بڑا قدم کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ اس کامیابی پر سفیر انقلاب بے پناہ خوش ہوئے اور اپنے نظریاتی احباب کو ان کی جرأت پر داد دی۔ آپ نے احباب پر واضح کیا کہ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ جس طرح امریکہ نے ایران پر جنگ مسلط کرکے

شہداء پرور قوم کا چین تباہ کیا ہے اس طرح ہم بھی اسے سکون کی نیند نہیں سونے دیں گے۔"

وقت جوں جوں گزرتا گیا سفیر انقلاب کے ذہن میں امریکہ دشمنی شدت اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب آپ کا مقصد حیات سامراج دشمنی ٹھہرا۔ آپ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے امریکہ کے خلاف سوچتے اور اس کے مفادات کو زک پہنچانے کی ٹوہ میں رہتے۔

آپ کی فکر کو حقیقی تقویت علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کی قیادت کے بعد ملی۔ چونکہ علامہ صاحب جوان عالم دین، امام خمینی کے عقیدتمند اور انقلاب ایران کی تحریک کے سرگرم رکن تھے۔ اس لئے ان کی فکر کا محور امام خمینی کی ذات تھی۔

قیادت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد انہوں نے اپنی تحریک کو اپنے ملک کے حکمران سے ٹکر تک محدود نہ رکھا بلکہ انہوں نے اس کے اہداف میں وسعت پیدا کرکے اسے بین الاقوامی تقاضوں سے مربوط کر دیا۔ انہوں نے اپنے ابتدائی دورہ جات میں "امریکہ مردہ باد" کے نعرہ کو تقویت دی اور پاکستان کے مسلمانوں کی مصیبتوں کا ذمہ دار بھی امریکہ کو قرار دیا۔

چونکہ سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی اور سفیر نور حضرت علامہ سید عارف الحسینی، امام خمینی کے پرستار تھے۔ اس لئے آغاز ہی سے یہ دونوں ملکوتی انسان ایک دوسرے میں ضم ہوگئے۔

علامہ سید عارف حسین الحسینی نے خود کو امام خمینی کی ذات میں اس قدر ضم کیا جس قدر وہ اسلام میں ضم تھے۔ ایک موقع پر آپ نے پشاور کے احباب سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ "اگر امام خمینی یہ کہیں کہ رات کا وقت ہے جبکہ وہ دن ہو تو میں یہی تصور کروں گا کہ واقعاً" رات ہوچکی ہے جبکہ میری آنکھیں صحیح کام نہیں کر رہیں۔" انہوں نے اپنی تحریک کو انقلاب ایران سے مربوط کیا اور برملا فرمایا "انقلاب اسلامی جس سمت مڑتا جائیگا ہم اپنا رخ اسی سمت کرتے جائیں گے۔"

یہی صورتحال سفیر انقلاب کی تھی کہ جب آپ پاکستانی نوجوانوں کا پہلا وفد ایران لے گئے تو امام رضا علیہ السلام کی زیارت گاہ پر پہنچتے ہی جونہی نوجوانوں نے

امام کی مرقد پر ہاتھ رکھے تو ڈاکٹر صاحب نے باآواز بلند نعرہ لگوایا۔

ایران ہے لہو لہو اسلام کیلئے
ہم جان دیں گے نائب امام کیلئے

جب واپس لوٹے تو معروف باطل شکن نعرہ "تکبیر" لے کر آئے۔ آتے ہی آپ نے ملک کی تمام امام بارگاہوں، مساجد اور عوامی اجتماعات میں یہ نعرہ لگوانا شروع کر دیا۔

اللہ اکبر - اللہ اکبر - خمینی رہبر
مرگ بر امریکہ - مرگ بر روسیہ
مرگ بر اسرائیل - مرگ بر دشمنِ ولایتِ فقیہہ

آغاز میں تو اپنے لوگ اس نعرہ سے متحیر ہوئے کیونکہ اس سے قبل ہمارے پروگراموں میں روایتی نعرہ بازی ہوا کرتی تھی تاہم آہستہ آہستہ عوام اس سے متفق ہوگئے۔ ایسے میں سامراج کی بے چینی بڑھتی گئی۔ اسے نہ صرف "مردہ باد" کا نعرہ نشتر محسوس ہونے لگا بلکہ وہ بہت دور کی سوچ کر اس کا دفاع کرنے لگا۔

سامراج بالخصوص امریکہ اس نعرہ سے سخت الرجک تھا۔ اور وہ "آگ کا جلا جگنو کی روشنی سے بھی خوفزدہ ہوتا ہے" کا مصداق تھا۔ اسے اس نعرہ کی حقیقت اور پس منظر کا اندازہ تھا۔ اسے وہ دن بھی یاد تھا جب عاشور کے روز امام خمینی نے اپنے عوام کے ایک اجتماع سے فرمایا تھا کہ "آج مظلوم کی حمایت اور ظالم سے نفرت کا روز ہے، آج حسینیت کی اطاعت اور یزیدیت سے ٹکر لینے کا دن ہے۔ لہٰذا امریکہ عصر حاضر کا بڑا ظالم اور یزید ہے۔ جس کے خاتمہ کیلئے حسینیت تقاضا کرتی ہے۔"

امام کا یہ اعلان سن کر عوام نے مرگ بر امریکہ کا نعرہ بلند کیا تھا جو گلی کوچوں سے بلند ہوتا ہوا بازاروں اور ایوانوں تک جا پہنچا۔ یہاں تک کہ ایران کے ہر فرد کی

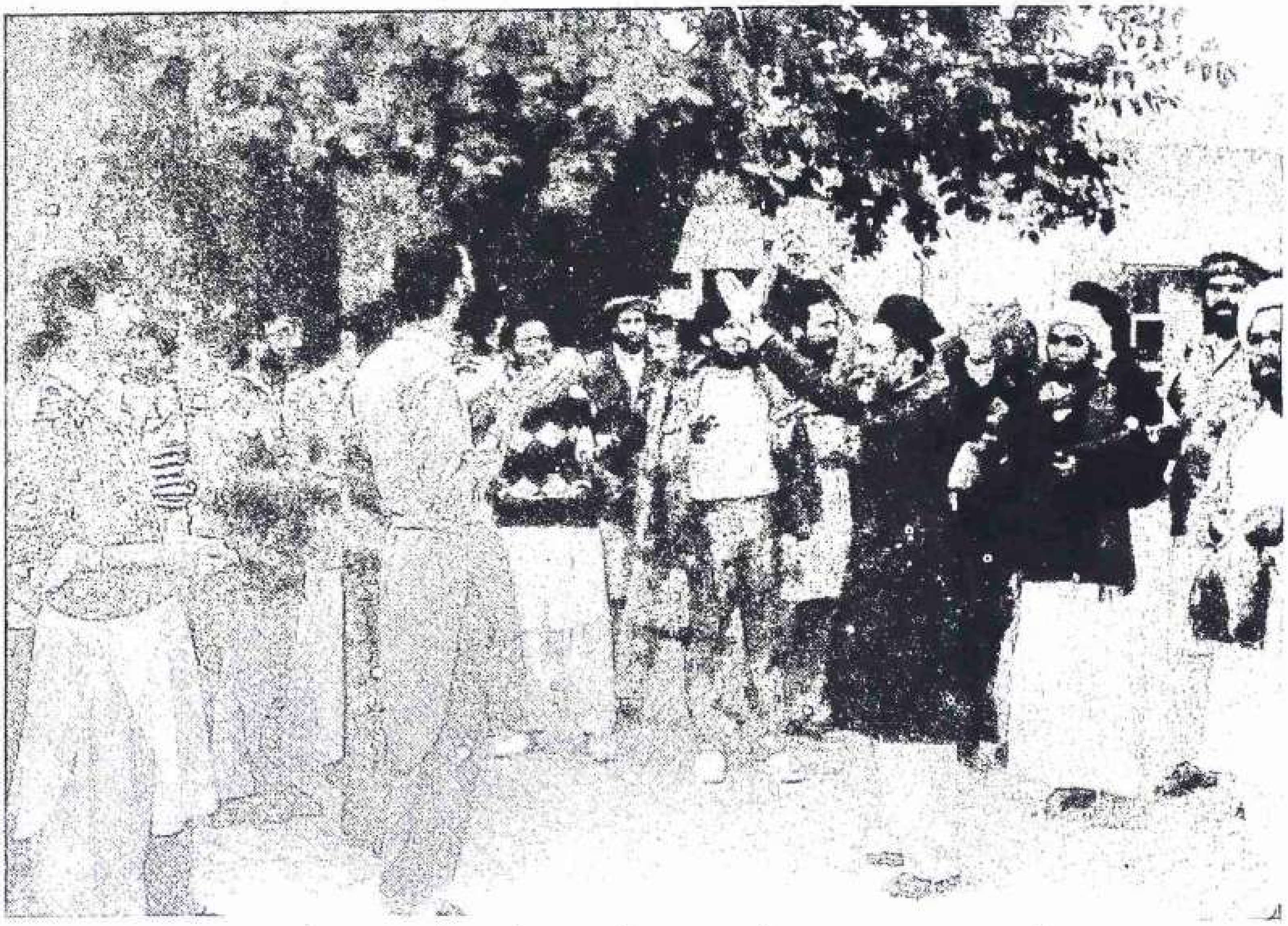

اسلام کی بقاء اور سامراج کی نابودی کی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے ہوئے

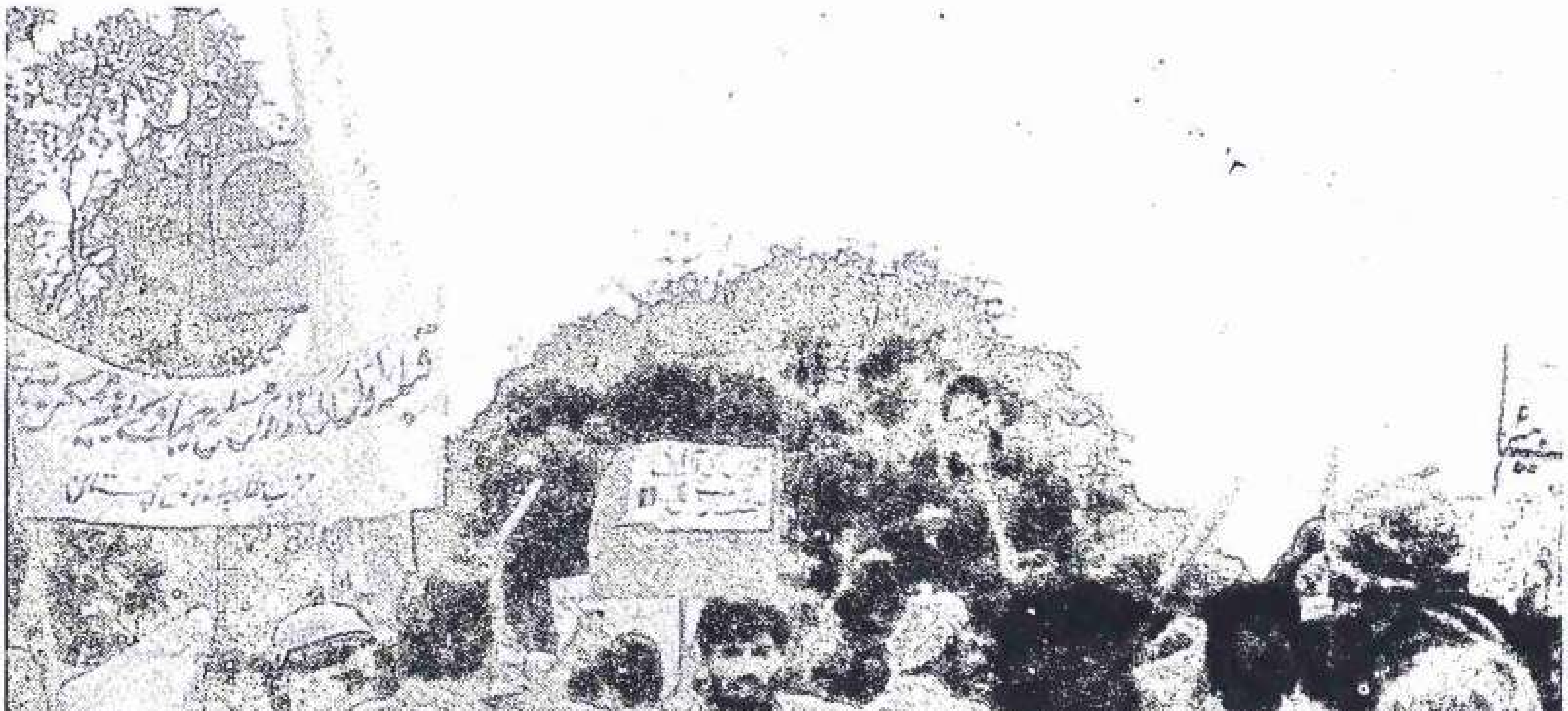

یوم القدس میں شریک

زبان پر یہ نعرہ ورد کا روپ اختیار کر گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب اس نعرہ کی صدائیں واشنگٹن پہنچیں اور وائٹ ہاؤس (White House) میں مدہوش قوتوں کی نیندیں حرام ہونے لگیں۔

• سفیر انقلاب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ انقلاب ایران کا پہلا درس "مرگ بر امریکہ، مرگ بر اسرائیل" کا نعرہ تھا۔ جیسے کلمہ پڑھتے وقت مسلمان پہلے انکار کرتا ہے اور پھر اقرار کرتا ہے۔ (لا الہ نہیں کوئی .... الا اللہ مگر اللہ کے سوا ....) اس طرح اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد سے قبل "مردہ باد امریکہ" کا نعرہ لگانا ضروری ہوگا۔

پاکستان کے در و دیوار پر "مردہ باد امریکہ" لکھنے کی ریت سفیر انقلاب نے ڈالی جب یہ نعرہ ملک کے طول و عرض میں دکھائی دینے لگا اور اس نعرہ کا شور فضاؤں میں پھیلا تو یہاں بھی سامراج کے پاؤں تلے زمین نکل گئی اور اس نے خفیہ اداروں اور چند شیعہ روایتی رہنماؤں کے ذریعہ اسے بند کرانے کی حتیٰ المقدور کوشش کی۔

پاکستان میں مردہ باد امریکہ کا نعرہ حکومت کیلئے رسوائی کا باعث تھا اس لئے حکمران درباری اور روایتی رہنماؤں پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ وہ اس نعرہ کا سدباب کریں۔ چنانچہ سدا بہار رہنما، مجالس و محافل میں یہ تاثر دینے کی کوشش میں تھے کہ اس نعرہ سے ملت جعفریہ پاکستان کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہوجائیگا۔ ایسے میں سفیر انقلاب، مخالفتیں اور طرح طرح کے الزامات مول لیتے ہوئے آگے بڑھے اور رہنماؤں کو گرجدار آواز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

خواب گاہوں سے نکلتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو
دھوپ اتنی تو نہیں ہے کہ پگھل جاؤ گے

ڈاکٹر صاحب اکثر یہ واقعہ سنا کر رگوں میں خون کی حرکت کو تیز کرتے تھے۔ کہ جب ایک موقع پر شہنشاہ ایران نے کرفیو کا اعلان کیا کہ "آج گھروں سے نکلنا منع ہے" تو یہ اعلان سن کر امام خمینی نے جواباً" فرمایا "آج عوام کیلئے گھروں میں رہنا حرام

ہے۔" جب یہ دونوں اعلانات عوام کے کانوں سے ٹکرائے تو عوام امام خمینی کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے "مرگ بر شاہ" کے نعرے بلند کرتے ہوئے گھروں سے نکل آئے۔ عورتیں اپنے بچوں کو ہاتھوں میں لئے سڑکوں پر آگئیں۔ جبکہ ایسے میں دونوں ٹانگوں سے معذور ایک شخص نے اپنے گھر والوں سے عرض کی کہ وہ اسے ریڑھی کے سہارے گھر سے باہر نکال دیں تاکہ امام کے فرمان کی تعمیل میں گستاخی نہ ہو۔

سفیر انقلاب کو کئی بار لوگوں کو قائل کرنا پڑا کہ یہ نعرہ سیاسی نہیں ہے بلکہ حسینیت کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر "امریکہ مردہ باد" سیاست ہے تو پھر "یزیدیت مردہ باد" بھی سیاست ہے۔ اگر آج کسی ظالم حکمران کے خلاف تحریک یا کسی ایسی سپر طاقت جو اسلام کے خاتمہ پر تلی ہوئی ہو کے خلاف قیام کرنا سیاست ہے تو پھر تحریک کربلا بھی سیاست تھی اور ایسی ہی سیاست ہمارے دین میں جائز ہے۔

ڈاکٹر صاحب ان ایام میں اپنے دروس میں یہ بات تکرار کیساتھ کرتے تھے کہ جب شداد کا زمانہ تھا تو لوگ اسے برا نہیں کہتے تھے لیکن جب وہ مرگیا تو تمام لوگوں نے اسے برا بھلا ٹھہرایا۔ موسیٰ کے زمانہ کے لوگ شداد کو مطعون کرتے تھے مگر فرعون کے خلاف زبان نہ کھولتے تھے جب وہ مرگیا تو لوگ اس کے خلاف بھی باتیں کرتے کرتے تھکتے نہ تھے۔ اسی طرح یزید کے زمانہ کے لوگ شداد اور فرعون کو ملامت کرتے تھے مگر یزید کے بارے میں کچھ نہ کہتے تھے آخر جب وہ چلا گیا تو لوگ اس پر لعنتیں بھیجتے تھے۔ آپ فرماتے کہ آج وہی صورتحال ہے کہ لوگ شداد' فرعون اور یزید کو جن خصائل کی بنا پر برا سمجھتے ہیں اس کردار کے حامل امریکہ کے خلاف آواز بلند نہیں کرتے۔

یہ بات دعویٰ سے کی جاسکتی ہے کہ پاکستان میں پہلی بار تحریک جعفریہ کے پلیٹ فارم سے "مردہ باد امریکہ" کا نعرہ منظم انداز میں گونجا اور پہلا نعرہ لگانے کا شرف ڈاکٹر محمد علی نقوی کی ذات کو حاصل ہوا۔

انہوں نے یہ نعرہ اس وقت بلند کیا جب تحریک جعفریہ کے کئی رہنماء بھی اس کے بارے میں زیادہ واضح اور حمایتی نہ تھے مگر علامہ سید عارف حسین الحسینی کی

قیادت کے بعد اس نعرہ کو تائید حاصل ہوگئی۔

سفیر انقلاب اپنے چند احباب کے ساتھ یہ نعرہ امریکن قونصلیٹ کے سامنے بلند کرتے رہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس فکر میں تیزی آتی گئی یہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے امریکی سفارتخانے کی دیوار پر "Dwon with U.S.A" لکھا اور کئی بار احتجاجی مظاہروں کے مواقع پر امریکی قونصلیٹ کی دیوار پر چڑھ کر ''مردہ باد امریکہ'' کا نعرہ بلند کیا۔

ایک مرتبہ آپ نے چند تنظیمی برادران کیساتھ لاہور میں امریکی قونصلیٹ کی دیوار پر "Down with U.S.A" (مرگ بر امریکہ) بڑے جلی حروف میں لکھا۔ آپ یہ لکھ کر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ آپ کو اچانک واپسی کا خیال آیا۔ آپ نے احباب سے کہا کہ ہماری لکھائی کو وہ صبح تک برداشت نہیں کریں گے۔ آئیں دیکھتے ہیں کہ امریکیوں کا کیا رد عمل ہے؟۔ .... آپ واپس لوٹے تو دیکھا کہ امریکی دیوار کی تصاویر لے رہے تھے اور ساتھ ساتھ صفائی بھی کرتے جا رہے تھے۔

آپ یہ منظر دیکھ کر چلے گئے۔ رات کے پچھلے پہر پھر لوٹے اور اسی دیوار پر پھر وہی لکھا۔ آپ نے فرمایا کہ ہماری خواہش ہے کہ اہالیان پاکستان امریکن قونصلیٹ کی دیوار پر ''امریکہ مردہ باد'' لکھا ہوا دیکھیں۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ صبح کے سورج نے خود اور عوام کو بھی ڈاکٹر صاحب کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے جملے دکھائے۔ اس واقعہ کے بعد گوروں پر اتنا خوف طاری ہوا کہ انہوں نے حکومت پاکستان سے امریکی سفارتخانوں اور امریکیوں کی رہائش گاہوں پر غیر معمولی پولیس تعینات کرنے کا مطالبہ کیا۔

امریکہ کے خلاف سفیر انقلاب اور ان کے احباب کو کھل کر تحریک چلانے کا موقع اس وقت میسر آیا جب حضرت امام خمینیؒ نے مسلمانان عالم سے رمضان المبارک کے آخری جمعہ ''جمعتہ الوداع'' کو یوم القدس منانے کی درخواست کی۔ امام خمینی نے فرمایا تھا کہ ''اسرائیل امریکہ کے بل بوتے پر ہمارے قبلہ اول پر قابض ہے لہٰذا مسلمانان عالم کو چاہیئے کہ متحد ہوکر اسرائیل کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔''

پاکستان میں پہلی بار یوم القدس کا جلوس علماء کرام کی قیادت میں برآمد ہوا جس کی منصوبہ بندی سفیر انقلاب نے کی تھی۔ آپ کی منصوبہ بندی اور جلوس کے

تیور دیکھ کر علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید نے بھی ایک موقع پر شرکت فرمائی تھی۔

سفیر انقلاب نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کیلئے ملک بھر کے دورہ جات کیئے اور عوام کو ضلعی سطح پر یوم القدس منانے کی اپیل کی۔ لاہور میں آپ نے بیت المقدس (قبلہ اول) کا ایک ماڈل بنوایا جسے مظاہرین کندھوں پر رکھ کر شاہراہ پر نکلتے تھے اور اسرائیل و امریکہ کے خلاف دل کا غبار نکالتے تھے۔ پاکستان میں امریکی اور اسرائیلی پرچم اور وہاں کے حکمرانوں کے پتلے جلانے کا رواج سفیر انقلاب نے رائج کیا۔ یہ آپ کی منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ ملک میں کئی مواقع پر امریکی پرچم نذرِ آتش ہوئے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ آئی۔ ایس۔ او کے نوجوان کسی بھی قومی حادثہ کے رونما ہونے پر امریکہ کا پرچم ضرور جلاتے۔ یہ صورت حال دیکھ کر حکومت پاکستان نے غیر ملکی پرچم جلانے کے خلاف آرڈیننس جاری کیا اور یہ آرڈیننس خالصتاً" تحریک جعفریہ اور آئی۔ ایس۔ او کے کارکنان کیلئے تھا جو اس وقت باقاعدگی سے امریکی پرچم جلایا کرتے تھے۔

۱۹۸۵ء میں یوم القدس کے مظاہرے کے بعد آپ گرفتار کر لیئے گئے اور پولیس آپ کو قلعہ گجر سنگھ لاہور کے تفتیشی سنٹر میں لے گئی۔ جہاں آپ سے کئی گھنٹوں تک تفتیش ہوتی رہی اور اس موقع پر پولیس نے آپ کو مختلف انداز میں بٹھا کر بہت سی تصاویر لیں۔

۱۹۸۶ء میں آپ اپنے محبوب قائد علامہ سید عارف حسین الحسینی کی خدمت میں پشاور حاضر ہوئے اور انہیں پروگرام پیش کیا کہ "یوم القدس" کو خالصتاً" اسرائیل کے خلاف استعمال کیا جائے جبکہ ۱۶ مئی کو یوم مردہ باد امریکہ کا انعقاد کیا جائے۔ کیونکہ اس روز امریکہ نے اس اسرائیل کو جنم دیا تھا۔

قائد کو آپ کی تجویز پسند آئی اور انہوں نے "یوم مردہ باد امریکہ" کی منظوری دے دی۔ قائد کی اجازت کے بعد قائد کے محبوب سپاہی نے ملک بھر میں اس یوم کے منانے کو اہمیت دی اور پہلے سال ہی ملک کے تمام اضلاع میں "یوم مردہ باد امریکہ" منا کر ملک کے ایوانوں اور وائٹ ہاؤس کے مکینوں کی نیندیں حرام کر دیں۔

مال روڈ پر للکارتے ہوئے

اس موقع پر ملک میں ہزاروں امریکی پرچم نذر آتش ہوئے' ملک کے در و دیوار پر امریکہ کے خلاف وال چاکنگ ہوئی' اور گھر گھر مردہ باد امریکہ کا پیغام پہنچا۔

یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا مگر علامہ عارف حسین الحسینی کی شہادت کے بعد حالات کے پیش نظر یہ یوم پھر نہ منایا گیا۔ جس کا سفیر انقلاب کو خاصا دکھ رہا۔

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ جب ۱۹۸۷ء میں یوم مردہ باد امریکہ منایا جانے لگا تو امریکی حکومت نے پاکستانی سفیر سے استفسار کیا کہ ۱۶ مئی کو پاکستان میں کون سا یوم منایا جاتا ہے۔ امریکہ نے اس موقع پر اپنی تشویش کا اظہار کیا جس کا پاکستان حکومت نے نوٹس لیا۔

سفیر انقلاب کا عقیدہ تھا کہ کسی محفل یا پروگرام کو مردہ باد امریکہ کے نعرہ کے بغیر شروع یا اختتام پذیر نہیں ہونا چاہیے۔ آپ فرمایا کرتے تھے جس طرح ہماری مجالس میں "نعرہ حیدری" عبادت سمجھ کر لگایا جاتا ہے اس طرح "مردہ باد امریکہ" بھی عبادت کے طور پر لگایا جائے۔ چونکہ قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کی مذمت کا واضح حکم موجود ہے۔ اس لئے قرآن کی اطاعت عبادت ہے۔" چنانچہ آپ اپنے عقیدہ کے پیش نظر کوئی پروگرام یا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو بے نظیر بھٹو نے دس سالہ جلاوطنی کے بعد پہلی مرتبہ لاہور میں جلسہ کرنا چاہا تو اس کی بازگشت دنیا بھر میں سنی گئی اور پیپلز پارٹی کے کارکنان نے جلسہ کی کامیابی کیلئے دن رات ایک کر دیئے۔

جلسہ سے ایک دو روز قبل تحریک جعفریہ کے دفتر میں اس جلسہ کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوئیں تو ڈاکٹر صاحب نے احباب سے فرمایا "یہ جلسہ پاکستان کی تاریخ کا بہت بڑا جلسہ ہوگا لہٰذا اس سے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہیے۔" چنانچہ آپ کی حکمت عملی سے اس جلسہ میں امریکہ کے خلاف لٹریچر تقسیم ہوا' مردہ باد امریکہ کے نعرے بلند ہوئے اور سینکڑوں کی تعداد میں امریکی پرچم نذر آتش کیئے گئے۔

امریکہ کے خلاف عوامی رخ دیکھ کر پیپلز پارٹی کی قیادت کو سٹیج پر اظہار کرنا پڑا کہ "امریکی پرچم نذر آتش کرنے اور امریکہ کے خلاف نعرہ بازی کرنے والوں کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔"

یہ اعلان سن کر آپ نے فرمایا "بیٹی باپ کے خون کا سودا کرچکی ہے اور امریکہ اس کے ذریعہ عوام میں اپنی جڑیں پھیلانا چاہتا ہے۔ لہٰذا اب پی۔ پی کا دور بھی سامراج پٹھو حکومت کا دور ہوگا اور یہ زہر اہالیانِ پاکستان کی رگوں میں غیر محسوس انداز میں پھیلے گا۔"

امریکہ سے آپ کی نفرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۷ء میں جب سعودی عرب میں ایرانی حجاج پر "برآت از مشرکین" کا مظاہرہ کرنے کے جرم میں گولی چلی تو آپ نے ملک بھر میں اپنے قائد کے حکم پر "حج سیمینار" منعقد کرائے اور تنظیمی پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے ملک کے اہم شہروں میں احتجاجی مظاہرے تشکیل دیئے۔

سفیر انقلاب نے سعودی حکومت کے ظلم کے خلاف ۲۴ جون ۱۹۸۸ء کو "فلیٹیز ہوٹل" لاہور میں ایک بہت بڑا "حج سیمینار" کرایا۔ جس میں ملک کی معروف سیاسی و مذہبی شخصیات نے شرکت کی۔ اس سیمینار کو کامیاب بنانے کیلئے آپ نے مقررہ تاریخ سے ایک ہفتہ قبل ہوٹل میں کمرہ بک کرالیا تھا جہاں دن رات آپ مصروف کار رہتے تھے یہاں تک کہ آپ نے ان ایام میں گھر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

سیمینار کی درمیانی شب مشاعرہ بعنوان "کعبہ سب کو پیارا ہے" منعقد ہوا جو انتہائی کامیاب رہا۔ شعراء کرام نے کعبہ سے عقیدت اور مسلط شاہی خاندان سے نفرت کا اظہار کیا اس پر سفیر انقلاب بے حد خوش ہوئے۔ اگلے روز "سیمینار" ہوا جو ہر حوالہ سے کامیاب رہا۔

یہ سیمینار شہید مظلوم علامہ سید عارف حسین الحسینی کی زندگی کا آخری سیمینار تھا۔ جس میں انہوں نے انتہائی پردرد اور منفرد لہجہ میں خطاب فرمایا تھا۔ آپ کا یہ خطاب سننے والے اس وقت بھی قیاس آرائیاں کرتے رہے کہ اس لہجہ میں بولنے والا شخص اس سرزمین پر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ زیرک لوگ اپنے وطن کے دستور سے آگاہ تھے۔ اور اکثر کہا کرتے تھے۔

نثار تیری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

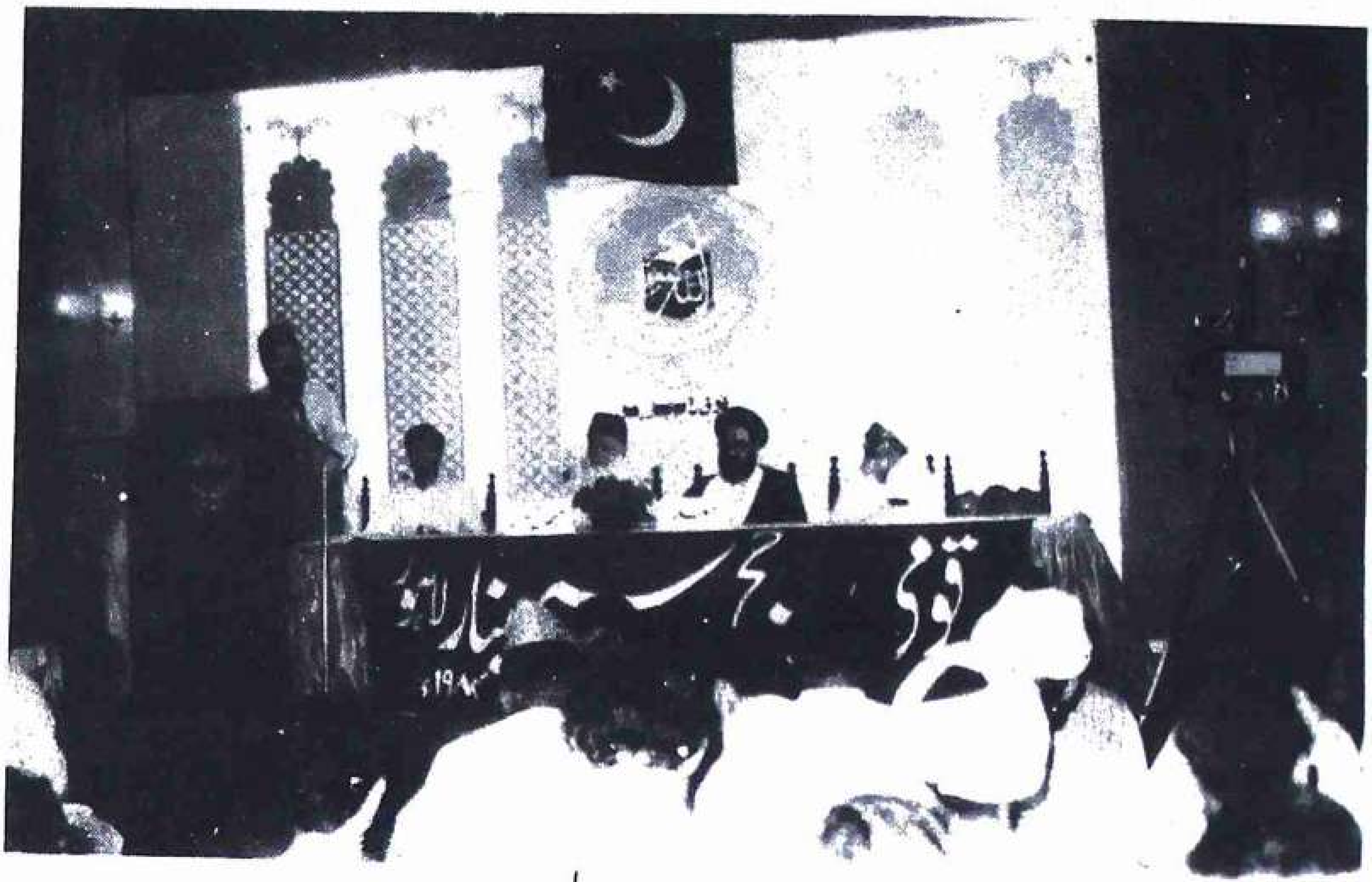

اپنے محبوب قائد شہید عارف حسین الحسینیؒ کے ساتھ حج سیمینار میں

حج سیمینار کے موقع پر سنی علماء کا استقبال کرتے ہوئے

ملت اسلامیہ کے محبوب قائد کے خطاب کے دوران سفیر انقلاب ڈاکٹر محمد علی نقوی ہال کے دروازہ پر کھڑے رہے اور وقفہ وقفہ سے پرجوش نعرے بلند کرتے رہے۔ اس روز کا منظر دیکھنے والے گواہ ہیں کہ شہید قائد اور شہید ڈاکٹر اتنے پرجوش تھے جیسے وہ کسی کربلا سے آئے ہیں اور جلد ہی لوٹ جانا چاہتے ہیں۔

سامراج پر یہ "حج سیمینار" اس قدر گراں گزرے کہ امریکی حکام اور سعودی شہزادوں نے پاکستانی سفیروں کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا اور علامہ سید عارف حسین الحسینی کی سرگرمیاں محدود کرنے کا مطالبہ کیا۔

اس سلسلہ میں ایران میں بین الاقوامی سطح پر "حج سیمینار" منعقد ہوا جس میں پاکستان سے علامہ سید عارف حسین الحسینی نے بطور نمائندہ امام خمینی اپنے شیعہ سنی مسلمان بھائیوں کے ساتھ شرکت فرمائی۔ وہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ سعودی عرب کی پابندیوں کی وجہ سے اگلے سال ایرانی عازمین حج شرکت نہیں کرسکیں گے تو بھلا "برآت از مشرکین" کے مظاہرے کا علم کون تھامے گا ......؟ اس پر تحریک جعفریہ پاکستان کے قائد نے حامی بھرلی اور فرمایا "انشاء اللہ اس بار پاکستانی مسلمان حج کے موقع پر امریکہ، اسرائیل اور روس سے برآت کا اعلان کرکے فلسفہ حج کی تکمیل کریں گے۔"

۱۹۸۸ء میں سفیر انقلاب اپنے قائد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے مخصوص احباب کے ہمراہ حقیقی حج ادا کرنے کیلئے سعودی عرب پہنچے۔ مناسک حج شروع ہوئے تو آپ نے منصوبہ بندی کے تحت امریکہ اور اسرائیل کے خلاف مسلمانان عالم تک اپنا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔

پہلے مرحلہ میں آپ نے لاکھوں کی تعداد میں حجاج کے درمیان وہ پرچیاں بکھیریں جن پر "مرگ بر امریکہ" لکھا ہوا تھا۔ آپ کا طریقہ کار کچھ یوں تھا کہ آپ اپنی پنڈلی کیساتھ پرچیاں "ربڑ بینڈ" سے باندھتے اور پھر جہاں مناسب سمجھتے ٹانگ زمین پر زور سے مارتے تو ربڑ بینڈ کے کھل جانے سے پرچیاں حجاج کے درمیان بکھر جاتیں اور حجاج ان کو اٹھا کر "برآت از مشرکین" کا پیغام پڑھتے۔ دوسرے مرحلے میں آپ نے مختلف اجتماعات یا محفلوں میں پمفلٹ تقسیم کئے جن پر قرآن مجید کی روشنی میں حج

کا فلسفہ تحریر ہوتا تھا۔ تیسرے مرحلہ میں آپ نے ایک پل پر "مرگ بر امریکہ' برگ بر اسرائیل" کا بینر لگایا جس کے بعد وہاں کی ایجنسیاں متحرک ہوئیں۔ آخری مرحلہ پر جب حجاج کرام شیطان کو کنکریاں مارنے لگے تو آپ کے احباب نے وہاں پیغام پہنچایا کہ "اے مسلمانو! تم جس شیطان سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو آج وہ امریکہ کی شکل میں موجود ہے لہٰذا آج کے شیطان بزرگ سے برآت کا اعلان کر کے قرآن مجید کے حکم کی تعمیل کرو' اس موقع پر ان افراد نے اپنے احرام جن پر مرگ بر امریکہ لکھا ہوا تھا ہوا میں لہرائے اور صدا بلند کی "اے خدا گواہ رہنا کہ ہم نے تیرے دین' رسول اور کتاب اور ان کے پیروکاروں کے دشمنوں کے خلاف اپنی استطاعت کے مطابق اعلان نفرت کر دیا ہے۔" اس منفرد مظاہرہ کی امریکیوں نے بھی فلمیں تیار کیں۔

۱۰ ذوالحجہ کی شام ایرانی نشریات نے یہ خبر نشر کر دی کہ آج سعودی عرب میں عالمی سامراج کے خلاف مظاہرہ ہوا ہے۔ اس خبر کے نشر ہونے کے بعد سعودی عرب کے محلات میں کھلبلی مچ گئی کہ انہوں نے امریکہ سے جو وعدہ کیا تھا کہ اس کے خلاف وہ کسی مسلمان کو یہاں زبان نہیں کھولنے دیں گے وہ خاک میں مل گیا۔

شہزادوں کی بے چینی کے بعد وہاں کی ایجنسیاں اور پولیس حرکت میں آئی اور انہوں نے لوگوں کو پکڑ کر تفتیش کرنا شروع کر دی اور حجاج کرام کے ٹھکانوں پر چھاپے مارے۔ بہت سے افراد کی پکڑ دھکڑ کے بعد انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مظاہرین پاکستانی تھے۔ آخر ایک مرحلہ پر سفیر انقلاب کو جاننے والا ایک ترکی مسلمان ان کی گرفت میں آیا تو اس نے آپ کی نشاندہی کر دی۔

نشاندہی کے بعد تحریک جعفریہ کے نائب صدر علامہ سید فاضل حسین موسوی سفیر انقلاب اور آپ کے بزرگ ساتھی سید اعجاز علی شاہ صاحب گرفتار کر لیئے گئے۔ علامہ سید فاضل حسین موسوی صاحب اس وقت قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی کے دست راست تھے جبکہ سید اعجاز علی شاہ صاحب کا شمار قائد اور امام خمینی کے جانثار عقید تمندوں میں سے تھا۔

پولیس کی تفتیش کے دوران میں صورتحال کئی مراحل پر دلچسپ رہی۔ وہ ڈاکٹر

صاحب کو گرفتار کر لینے کے بعد بھی آپ کے احباب سے پوچھتے تھے کہ "ڈاکٹر محمد علی کون ہے؟" نہ جانے ان کے ذہنوں پر کس ڈاکٹر محمد علی کا خوف طاری تھا۔ اسیران سے تفتیش کے دوران میں کئے جانے والے سوالات اور جوابات کچھ یوں تھے۔

○ آپ لوگوں کو یہاں کس نے بھیجا ....؟

☆ ہم مسلمان ہیں، ہم حج ادا کرنے خود آئے ہیں ....

○ ایران سے آپ کا کیا تعلق ہے ....؟

☆ ہم ان کے مسلمان بھائی ہیں۔

○ آپ ان کے ایجنٹ ہیں ....؟

☆ ہم کسی کے ایجنٹ نہیں اسلامی انقلاب کے حامی ہیں۔

○ ایران سے آپ کو کتنی ایڈ ملتی ہے ....؟

☆ خدا کے دین اور محمد عربی کی شریعت کی فکر کی ایڈ لیتے ہیں ....

○ تم نے یہاں امریکہ کے خلاف مظاہرہ کیوں کیا ہے ....؟

☆ قرآن مجید کی اطاعت کرتے ہوئے کہ مشرکین سے برآت کریں ....

○ سید اعجاز علی صاحب سے پوچھا گیا۔ ڈاکٹر محمد علی نقوی تمہارے لیڈر ہیں ....؟

☆ جواب ملا۔ پاکستانی سارے لیڈر ہیں ....

○ پاکستان میں کون کون لوگ امریکہ اور سعودی عرب کی مخالفت کرتے ہیں ....؟

☆ اس سوال کے جواب میں سید اعجاز علی شاہ صاحب نے ان شیعہ رہنماؤں کے نام لکھوائے جو یہاں علامہ سید عارف حسین الحسینی کی تحریک کے مخالف، حکومت کے طرفدار اور بالواسطہ یا بلاواسطہ امریکہ یا سعودی عرب کے حامی تھے۔

سعودی حکومت نے یہ تمام نام حکومت پاکستان کو بھجوائے اور واضح کیا کہ انکی معلومات کے مطابق یہ لوگ ہمارے اور امریکہ کی مخالفت میں سرگرم ہیں۔ جس کے جواب میں حکومت پاکستان کو وضاحت کرنا پڑی۔

سفیر انقلاب بڑے دل گردہ والے انسان تھے۔ خدا نے انہیں پہاڑوں جتنا حوصلہ عطا کیا تھا اور لوگ ان کے بارے میں اکثر سوچا کرتے تھے کہ اس نحیف جسم میں جگر کس چیز کا موجود ہے۔ وہ علامہ اقبالؒ کی فکر کا مظہر تھے کہ۔

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

ڈاکٹر صاحب بہت گہرے شخص تھے۔ ان کی گہرائیوں کے اندازے لگانے کا دعویٰ کوئی نہیں کرسکتا۔ ان کے افکار اور رازوں کو سمندر سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے تاہم کبھی کبھار معتمد احباب کی محفلوں کی ہواؤں سے ان کی موجیں کناروں سے چھلک جایا کرتی تھیں اور وہ اس عالم میں اختصار کے ساتھ "سانحہ مکہ" کے بارے میں اتنا فرمایا کرتے تھے کہ "سعودی ادارے غیر تربیت یافتہ لگتے تھے۔ انہیں تفتیش کا کوئی ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ ان کے ذہنوں پر ایران کے اسلامی انقلاب کا خوف طاری تھا۔ وہ پاکستان کے اسلامی رہنما علامہ سید عارف حسین الحسینی کی قیادت سے لرزاں تھے۔ ان کی نظروں میں "موت" کوئی بڑی چیز تھی وہ ہر وقت ہمیں موت سے ڈرانے کی کوشش کرتے تھے۔"

ایک موقع پر آپ نے بتایا کہ "برادر سید تصور حسین نقوی (سابق مرکزی صدر آئی۔ ایس۔ او۔ پاکستان) کی دو باتیں سعودی عرب میں تفتیش کے دوران میں میرے بہت کام آئیں ایک کم خوری اور دوسرا جس تشدد سے آپ کو کم تکلیف ہوتی ہو اس پر زیادہ تکلیف کا اظہار کرنا۔ آپ کہتے تھے کہ سعودی عرب کی پولیس نے ہمارے احباب پر بے پناہ تشدد کیا۔ ان کا ہر ظلم نہایت تکلیف دہ ہوتا تھا البتہ وہ وقتاً فوقتاً ہمیں بجلی کا کرنٹ بھی لگاتے تھے۔ جو میرے لئے نسبتاً کم تکلیف دہ ہوتا تھا اس لئے میں اس پر زیادہ چیخ و پکار کرتا اور یوں وہ بدو اکثر مجھے کرنٹ سے ڈراتے رہتے۔ آپ ایک واقعہ بڑے دکھ کے ساتھ بیان کرتے تھے کہ وہاں کے تفتیشی افسر عقائد کے حوالہ سے خاصے سخت تھے وہ ہم سے پوچھتے تھے کہ تم یہاں کیا کرنے آتے ت[illegible] ، ا[illegible] تے کہ اللہ کا [illegible] ہے اور ہمارے' نبی پاک کا روضہ ہے تو وہ

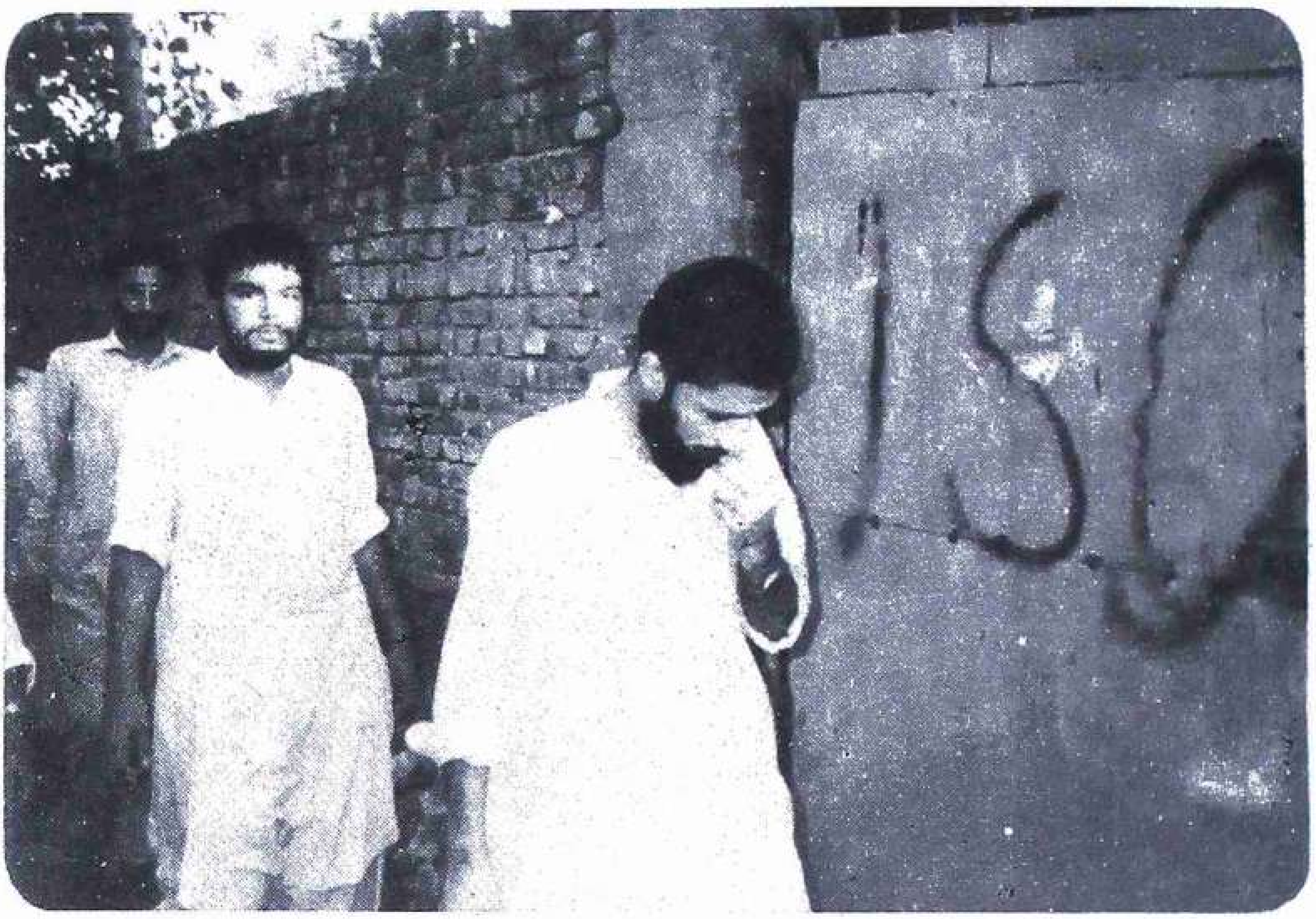

سعودی عرب سے رہائی کے بعد تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر آتے ہوئے

سعودی عرب سے رہائی کے بعد نئے روپ اور نئے انداز میں

بڑے کرخت لہجے میں کہتے کہ ہم تو آج تک مدینہ نہیں گئے وہاں کیا پڑا ہے .....؟

تفتیش کے مراحل ابھی جاری تھے کہ ۷ اگست ۱۹۸۸ء کو آپ تک ایک ایسی خبر پہنچی جو آپ کو یتیم کرگئی۔ آپ اپنے تمام درد بھول گئے۔ آپ پر سکتہ طاری ہوگیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ یہ خبر قائد ملت اسلامیہ علامہ سید عارف حسین الحسینی کی شہادت کی خبر تھی۔

آپ شاید جانتے تھے کہ اب موت آجائے گی۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ یہاں پاکستان میں قائد کی شہادت کے بعد جتنے احتجاجی مظاہرے ہوئے ان میں "اسیران مکہ" کو رہا کرنے کا شدید مطالبہ کیا گیا۔ بلکہ جب سابق صدر ضیاء الحق' علامہ سید عارف حسین الحسینی شہید کے جنازہ پر آئے تو وہاں پر ڈاکٹر صاحب کے ایک عقید تمند نے ان سے گرجدار آواز میں کہا "اسیران مکہ" کو رہا کروائیں۔ جس پر ضیاء الحق نے پوچھا "وہ کون ہیں ......؟ پھر انہوں نے نام لیکر واضح کیا۔

ملت جعفریہ کے غم و غصہ کے تیور دیکھ کر حکومت پاکستان نے سعودی حکومت سے رابطہ کیا اور "اسیران مکہ" کو رہا کروایا۔ پاکستان پہنچنے پر باقی افراد تو رہا کر دیئے گئے مگر سفیر انقلاب کو پھر زیر تفتیش لایا گیا۔ آپ اس دوران سہالہ کیمپ اسلام آباد میں رہے۔ تفتیشی مراحل کے اختتام پر آپ کو ۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کی سہ پہر رہا کیا گیا۔ اسی روز شہید قائد کے چہلم کے بارے میں کمیٹی کا اجلاس تھا۔ آپ رہائی کے فوراً بعد اسی اجلاس میں پہنچے۔ تمام علماء کرام اور زعماء قوم کو تعزیت کی اور پھر دوسرے روز لاہور آئے۔ گھر جانے سے پہلے تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر واقع ۲۔ سماج روڈ پر حاضری دی وہاں پر موجود افراد کو شہید قائد کا پرسا دیا اور بے حد افسردگی کے عالم میں یہاں دیر تک بیٹھے رہے۔

یہاں جب آپ کی نظر سید اعجاز علی شاہ صاحب پر پڑی تو آپ ان کی طرف بڑھے ان کے قدموں پر ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے کہا "بزرگ شاہ صاحب میں انتہائی معذرت خواہ ہوں کہ آپ لوگوں کو میری وجہ سے مصائب برداشت کرنے پڑے ہیں اپنی سفید ریش کا صدقہ مجھے معاف کرنا۔"

جونہی لاہور میں یہ اطلاع پھیلی کہ ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے دفتر پہنچ چکے

ہیں تو لوگ اپنی مصروفیات ترک کر کے دفتر پہنچے۔ سینکڑوں افراد نے آپ سے سعودی عرب کے مظالم کے بارے میں سوالات کیئے مگر آپ نے واضح کیا کہ اس موقع پر قائد شہید کے پرسا اور ان کے خون سے ایفائے عہد کے متعلق گفتگو کی جائے۔ دفتر سے اٹھ کر آپ گھر پہنچے تو وہاں عزیز و اقارب کو بھی اپنے قائد کی تعزیت پیش کی۔

آپ ایک روز بعد تنظیمی امور میں پھر سے متحرک ہو گئے اور ۱۶ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ہونے والے شہید قائد کے چہلم کو کامیاب بنانے کیلئے دورہ جات کا شیڈول تیار کیا اور چند احباب کیساتھ دورے پر چل نکلے۔

ملتان ڈویژن کے دورہ کے دوران میں آپ کبیر والا پہنچے تو وہاں پر تنظیمی برادران نے آپ کا شایان شان استقبال کیا۔ آپ یہ منظر دیکھ کر خاصے ملول ہوئے اور جونہی آپ سے تنظیمی برادران ملے تو آپ نے انتہائی سخت لہجے میں کہا کہ "شرم آنی چاہئے کہ قائد شہید کی شہادت کے بعد مجھ جیسے بدنصیبوں اور بے وقعت لوگوں کا اس انداز میں استقبال کرتے ہو"۔ آپ کو اس بات کا اتنا رنج ہوا کہ آپ نے یہاں کھانا بھی نہ کھایا بلکہ اس موقع پر احباب کو تاکید کی کہ آئندہ ان کی توانیاں اور ان کے سرمائے قائد شہید کے افکار کی ترویج کیلئے اور قاتل امریکہ کے مفادات کے خلاف استعمال ہونے چاہئیں۔

آپ کا روز اول سے یہ مؤقف تھا کہ ان کے قائد کے قتل میں امریکہ براہ راست ملوث ہے۔ اگرچہ کچھ دوست اس خون کا ذمہ دار حکومت کو قرار دیتے تھے مگر آپ احباب کے مؤقف سے اتفاق کرتے ہوئے بھی اپنے مؤقف پر قائم تھے۔ آخر زمانہ نے دیکھا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد اجرتی قاتل گرفتار ہوئے اور انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ قتل امریکی جوڑے کی سازش کا نتیجہ تھا جسے ضیاء الحق کے اے ڈی سی ماجد گیلانی اور جنرل فضل حق اور اس کے سالہ ہاشم خان نے تکمیل تک پہنچایا تھا۔

امریکی مفادات کو زک پہنچانا اور اسے اپنے پیارے وطن سے دفع کرنا آپ کی دلی حسرت تھی۔ ۱۹۹۰ء میں ایک اعلیٰ ایرانی وفد پاکستان آیا۔ جس میں سابق چیف جسٹس آیت اللہ خلخالی بھی شامل تھے۔ جب یہ وفد خانہ فرہنگ لاہور پہنچا تو سفیر انقلاب نوجوانوں کے ایک وفد کے ساتھ انہیں ملنے گئے۔ احباب وہاں پر موجود

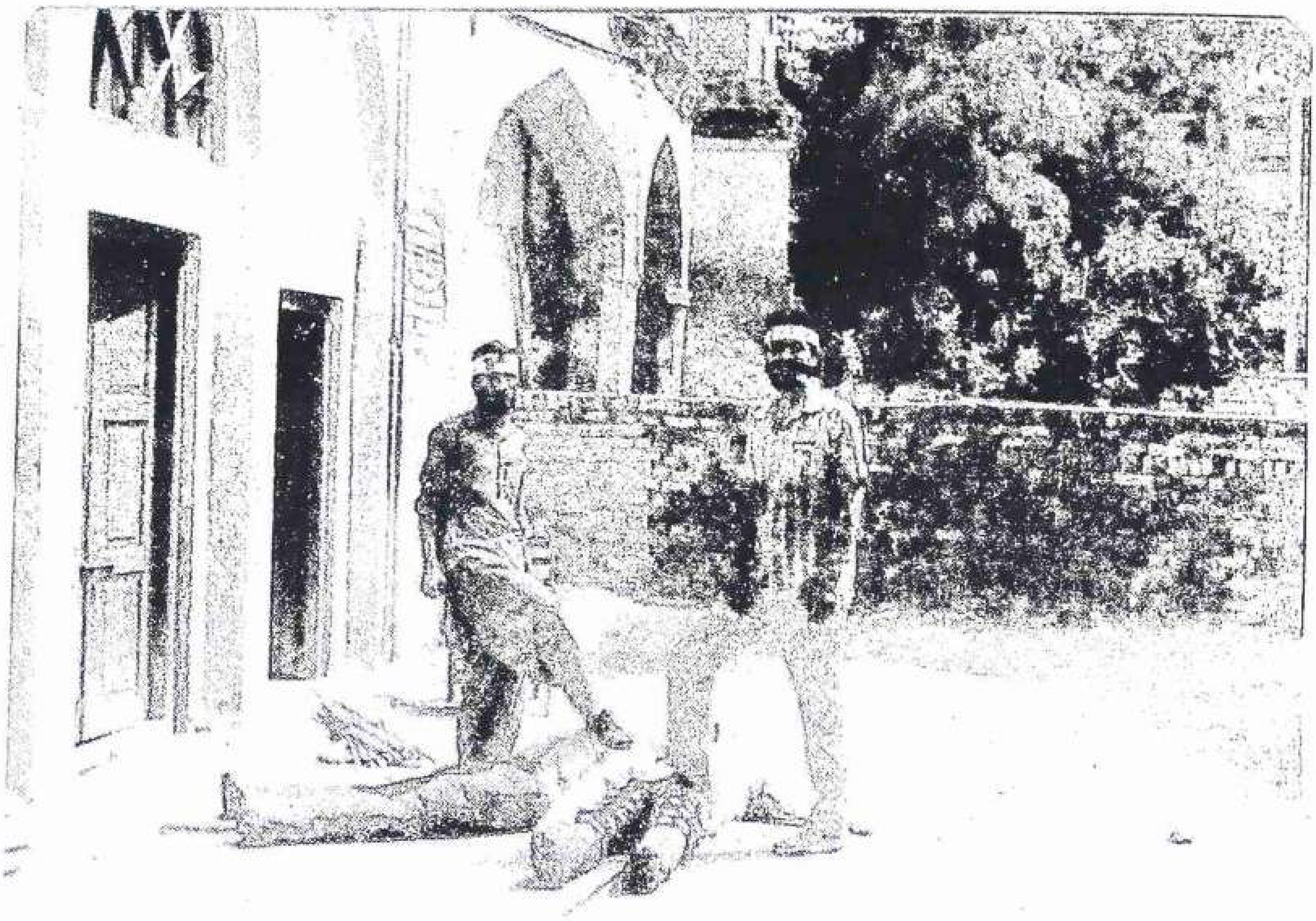

اسرائیلی اور امریکی وزراء اعظم کے پتلے تیار کرتے ہوئے۔

صدائے کلمہ حق بلند کرنے کے جرم میں پولیس کا وحشیانہ تشدد۔

کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ گئے جبکہ ڈاکٹر صاحب آغا خلخالی کے قدموں کے پاس جا بیٹھے۔ آپ اور آپ کے وفد نے ان سے کچھ سوالات کیئے اور انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے مفصل جوابات دیے۔ ایک مرحلہ پر ڈاکٹر صاحب نے امریکہ کے بارے میں ان سے سوال کیا جس کا جواب سننے پر آپ ایک دم نعرہ تکبیر بلند کر کے اٹھے اور احباب کو بتایا کہ "آغا صاحب فرماتے ہیں کہ "امریکہ کے مفادات کو جہاں تک ممکن ہو زک پہنچاؤ اس سے بڑی عبادت کیا ہو سکتی ہے۔"

مجھے یاد ہے کہ سفیر انقلاب کے چہرے پر اس فتویٰ کے بعد گلاب کی سی سرخی آگئی اور آپ کے تاثرات سے یوں لگتا تھا جیسے کسی نے آپ کے دل کی بات کو شرعی حیثیت دے دی ہو ....

آپ کھلملاتے چہرے اور چمکتی آنکھوں کیساتھ معزز مہمانوں سے رخصت ہوئے راستہ میں ایک دوست نے آغا خلخالی کے فتویٰ کو دہرایا اور ڈاکٹر صاحب سے سوال کیا کہ "کیا امریکہ کی دشمنی عبادت کے زمرے میں آتی ہے تو آپ نے قرآن مجید کی سورہ مائدہ کی آیت تلاوت کرتے ہوئے فرمایا۔

ترجمہ :۔ "اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ یہ تمہارے کھلے دشمن مگر ایک دوسرے کے کھلے دوست ہیں۔ اگر تم سے کسی نے ان کو اپنا سرپرست بنایا پس وہ بھی انہی لوگوں میں سے ہو جائیگا۔ بیشک خدا ظالموں کو راہ راست پر نہیں لاتا۔"

مزید فرمایا کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر تذکرہ ہے کہ جو خدا اور اس کے رسول کا دشمن ہے اس کے خلاف جہاد کرو اور جہاد بہت بڑی عبادت ہے۔

امریکہ سے نفرت آپ کے خون کے ہر قطرہ میں شامل تھی۔ چونکہ آپ امام خمینی اور شہید حسینی کے روحانی فرزند تھے۔ اس لئے آپ ان بزرگان کی فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ "عالم اسلامی کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار امریکہ ہے اور ہم اپنی ہر مصیبت کا بدلہ امریکہ سے چکائیں گے"۔

۱۹۹۰ء میں جب کویت پر عراق نے حملہ کیا اور امریکی فوجیں خلیج میں اتریں تو پاکستان میں امریکہ کے خلاف مسلسل مظاہرے ہوئے اس موقع پر تحریک جعفریہ

پاکستان کی جانب سے لاہور کی اہم شاہراہ "مال روڈ" پر جو مظاہرہ ہوا اس میں ڈاکٹر صاحب نے امریکہ کا جنازہ برآمد کیا۔ اور مسجد شہداء کے سامنے اسی پر جوتے برسائے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ "آج ملک بھر میں امریکہ کے خلاف جس شد و مد سے نفرت کا اظہار ہوا ہے یہ ہمارے نوجوانوں کی تحریک اور قائد شہید کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ آپ نے بتایا کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب ہم چند نوجوان اس شاہراہ پر "مردہ باد امریکہ" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے نکلتے تھے۔ ہمارے سروں پر لاٹھیاں پڑتی تھیں، ہمارے سینوں پر شیل پھینکے جاتے تھے، ہمارے ہاتھوں میں زنجیر پہنائے جاتے تھے اور ہمارے خلاف بغاوت کے مقدمات درج ہوتے تھے۔ مگر آج وہی شاہراہ ہے جس پر ملک کے ہزاروں لوگ مردہ باد امریکہ کا نعرہ یوں بلند کر رہے جیسے یہ نعرہ ان کی ثقافتی علامت ہو۔ گویا آج ہم نے امریکہ سے اپنے قائد کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "افراد کے قتل ہونے سے زیادہ نقصان دہ مرحلہ افکار کے قتل کا ہے۔ امریکہ نے ہمارے افراد قتل کرائے ہیں اور ہم نے یہاں اس کے افکار کا خاتمہ کیا ہے۔"

ایک مرتبہ پاکستان میں سامراج کی خدمت کرنے والے عناصر اور ان کے طرزِ عمل" پر گفتگو ہوئی۔ تو بات چل نکلی کہ "ایجنٹ" کیا ہوتا ہے۔ آپ نے جواباً" فرمایا جو کسی کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے وہ ایجنٹ ہوتا ہے اور ایجنٹ بالواسطہ بھی ہوتے ہیں اور بلاواسطہ بھی .... جو لوگ یہاں سامراج کے عزائم کی تکمیل کر رہے ہیں ان کے اقدامات سے اسلام یا وطن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ وہ سامراج کے ایجنٹ ہیں چاہے وہ کسی روپ میں ہی کیوں نہ ہوں۔"

میں نے برجستہ کہا۔ "ڈاکٹر صاحب پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ بھی ایرانی ایجنٹ ہیں ...."؟ آپ نے بلا تامل جواب دیا۔ "بالکل"

آپ نے تشریح کرتے ہوئے فرمایا "ایجنٹ معاشرہ میں ایک معیوب لفظ یا گالی بن گیا۔ ایجنٹ کا مقصد سفیر اور پاسبان ہے۔ یعنی وہ پیغام پھیلاتا ہے اور پھر اس کا دفاع کرتا ہے۔ چنانچہ ہم اسلامی انقلاب کے سفیر اور پاسبان ہیں۔ یہ انقلاب سعودی

عرب' افغانستان' کشمیر یا کسی بھی اسلامی خطہ میں برپا ہو ہم اس کا خیر مقدم کریں گے اور ابطور ایجنٹ (سفیر و پاسبان) کام کریں گے .... لہٰذا مجھے اسلامی انقلاب ایران کا ایجنٹ ہونے پر فخر ہے۔" (آپ کا یہ جملہ [illegible] ماہنامہ العارف لاہور کو دیئے گئے انٹرویو میں بھی شامل ہے۔)

آپ جس طرح امریکہ و اسرائیل سے متنفر تھے بالکل اسی طرح سے روس سے بھی نفرت کرتے تھے۔ آپ کی امریکہ سے دشمنی اسلامی انقلاب ایران کے بعد شروع ہوئی جبکہ روس کی مخالفت ۲۳ سال پرانی تھی۔ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے قیام کے وقت سوشلزم اور کیمونزم کا خاصا چرچا تھا۔ چنانچہ ایک فرزند اسلام ہونے کے ناطے آپ ان ایام میں ان ملحدانہ نظاموں کی پرزور مخالفت کیا کرتے تھے۔

یہ بات بڑی واضح ہے اور سفیر انقلاب خود بھی اس کا اعتراف کیا کرتے تھے کہ انہیں امریکہ کی طرح روس کے خلاف تحریک چلانے کی سمت میسر نہ آئی۔ امریکہ دشمنی دو اہم وجوہات کی بدولت تھی ایک یہ کہ امریکہ ہمارے پیارے وطن کو گرفت میں رکھے ہوئے ہے اور تمام ملکی امور اس کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچتے ہیں۔ دوم یہ کہ دیگر اسلامی ریاستوں میں روا مظالم میں اس کا ہاتھ ہے

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "ہماری غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ وطن عزیز جسے ہمارے بزرگوں اور بھائیوں نے بے پناہ قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے اس کے امور سلطنت کی باگیں یہودیوں کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ہماری قسمت کے فیصلے کریں۔ دوم ہمارا دین ہمیں یہ اجازت نہیں دیتا کہ یہودی ہمارے مسلمان بھائیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑیں اور ہم خاموش بیٹھے رہیں۔"

آپ بوسنیا' فلسطین' کشمیر و دیگر اسلامی ریاستوں میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر کرکے انتہائی درد بھرے انداز میں کہا کرتے تھے کہ "یہ سب کچھ یہودیوں کی بدولت ہے۔ وہ اپنی سازشوں کو کبھی اقوام متحدہ' کبھی عرب شہزادوں اور کبھی دیگر مصلحت پسند مسلمان حکمرانوں کے ذریعہ تکمیل تک پہنچا رہے ہیں"۔

آپ قرآن مجید کی سورہ النساء کی آیت ۷۵ کا حوالہ دیکر فریاد دہرایا کرتے تھے کہ "اے مسلمانو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم کمزور' بے کس مردوں' عورتوں اور بچوں

کو (کفار کے پنجوں سے چھڑانے) کیلئے خدا کی راہ میں جہاد نہیں کرتے۔"

آپ قرآن کریم کی سورہ توبہ آیت ۴۱ عموماً" تلاوت فرما کر جذبہ جہاد پیدا کرتے۔ "مسلمانو خواہ تم ہلکے ہو یا بوجھل جب تمہیں حکم دیا جائے اپنے مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کرو اگر تم کچھ جانتے ہو تو سمجھ لو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔"

آپ کا عقیدہ تھا کہ وطن اور اسلام کے دفاع سے بڑی عبادت کوئی نہیں اور اس راستہ میں آنے والی موت سے بڑھ کر کوئی عزت نہیں۔ آپ کا خیال تھا کہ وطن کی سرحدوں کی حفاظت کا صرف یہ مقصد نہیں کہ آپ دشمن کے ٹینکوں کے آگے سو جائیں بلکہ یہ بھی سرحدوں کی محافظت میں آتا ہے کہ آپ دشمن کے افکار نظریات اور سازشوں کو اپنے ملک میں نہ گھسنے دیں۔ آج ہمارے ملک میں امریکی عزائم یہاں تک سرایت کرچکے ہیں کہ ہمارا ملک امریکی سفیر کے رحم و کرم پر چل رہا ہے اور امریکہ اسے اپنی ریاست سمجھتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے روس اور امریکہ سے اپنی دشمنی کے بارے میں بتایا کہ جب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں روس نے ہماری سرحدیں پھلانگنے کی کوشش کی تھی تب بھی ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق دفاع کیا تھا اور جب امریکہ نے تسلط کی ٹھانی تو ہم نے اس استعمار کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔

جہاد افغانستان کے دوران میں بھی آپ حالات سے لاتعلق نہیں رہے بلکہ آپ نے لاکھوں روپے کی دوائیاں اور امامیہ ڈاکٹرز کی ٹیمیں بھیجیں۔ آپ اس بات پر خوش تھے کہ افغان مجاہدین کے ہاتھوں روس جیسی سپر طاقت کو پسپائی حاصل ہو رہی ہے البتہ اپنی محافل میں اس دکھ کا بھی اظہار ضرور کرتے کہ امریکہ اس جنگ کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے جبکہ پاکستان کی کچھ مذہبی جماعتیں اپنے نوجوانوں کو مسلح تربیت دلوا رہی ہیں جو مستقبل میں خود پاکستان کے استحکام کیلئے خطرہ ہیں۔

اسرائیل کے لبنانی اور فلسطینی مسلمانوں پر مظالم کے خلاف نہ صرف آپ اپنے وطن میں سراپا احتجاج رہے بلکہ وہاں کی اسلامی تنظیموں سے آپ کے گہرے

روابط تھی۔ آپ کی شہادت پر آپ کے اہل خانہ کو اسرائیل کے خلاف برسرپیکار مجاہدین کے تعزیتی خطوط موصول ہوئے جس میں واضح طور پر تحریر تھا کہ ”ہم پاکستان میں امریکہ اور اسرائیل کے خلاف جہاد کرنے والے ایک مجاہد بھائی سے محروم ہوگئے ہیں“

حزب اللہ لبنان سے آپ کے گہرے مراسم تھے۔ اور ان سے آپ کا قلمی رابطہ رہتا تھا۔ آپ کی خواہش رہی کہ آپ بیت المقدس کی آزادی کی خاطر اپنے فلسطینی اور لبنانی بھائیوں کے ساتھ اسرائیل کے خلاف عملی جہاد میں حصہ لیں اور شہادت سے ہمکنار ہوں۔ آپ کی اس حسرت کا اظہار آپ کی وصیت میں واضح ہے آپ لکھتے ہیں کہ ”کاش! موت سے نہ بھاگے ہوتے' کاش! لشکر خمینی میں شمولیت اختیار کی ہوتی تو شاید ان پاک و پاکیزہ نوجوانوں کے صدقے ہم بھی بخشش کا کوئی سامان لے جاتے“

مسئلہ کشمیر کے حوالہ سے آپ وہاں کے مجاہدین سے مربوط تھے۔ جہاد کشمیر میں حصہ لینے والے مصروف مجاہدین جب بھی لاہور آتے آپ سے ضرور ملتے۔ حزب المومنین کے کمانڈر عموماً“ آپ کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ آپ دیگر مجاہدین کی ہر طرح سے معاونت فرماتے تھے۔

آپ نے اپنی زندگی کا آخری درس آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی طالبات کو ”کشمیر“ کے موضوع پر دیا اور اس درس سے قبل تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر میں احباب کو تاکید کی کہ وہ کشمیر کی آزادی کیلئے مصروف جہاد مجاہدین کا تعاون کریں اور عوام الناس میں حقیقی تصویر اجاگر کر کے انہیں پس منظر اور حقائق سے آگاہ کریں۔

اسلام کی خدمت اور سامراج سے نفرت کیلئے کوئی شخص بھی قدم اٹھاتا تو آپ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور دعا دیتے۔

۱۹۹۲ء میں آئی۔ ایس۔ او پاکستان کے زیر اہتمام اسلام آباد میں بین الاقوامی سطح پر ”کشمیر و فلسطین کانفرنس“ منعقد ہوئی جس میں سامراج کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے ”سفیر انقلاب“ نے ایک مسلم بچے کے جذبات کو جذبات میں سراہتے ہوئے فرمایا کہ ”میں نے گذشتہ دنوں کشمیر کے ایک بچے کی داستان پڑھی ہے جو دشمن سے

مخاطب ہو کر کہتا ہے .... اے میرے وطن کے دشمن ! میں تیرے خلاف جہاد کرتا ہوا آگے بڑھوں گا ... تجھے یہ ناگوار گزرے گا اور تو میری ٹانگیں کاٹ دے گا .... پھر میں بازو بلند کر کے تیرے خلاف نعرے بلند کروں گا ..... یہ بھی تجھے ناگوار گزرے گا اور تو میرے بازو کاٹ دے گا .... پھر میں تیرے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروں گا اور تجھے وہ بھی ناگوار گزرے گا اور تو میری زبان کاٹ دے گا .... پھر میں سر کے بل تیرے خلاف آگے بڑھوں گا یہاں تک کہ وہ بھی تجھے ناگوار گزرے گا اور تو میرا سر کاٹ دے گا ..... اب تو مطمئن ہو گا کہ تو نے ایک ننھے مجاہد کا خاتمہ کر دیا ہے نہیں ..... نہیں اب میرے جسم سے بہتے ہوئے خون کا ہر ذرہ تیرے خلاف سراپا احتجاج بنے گا ..... پھر میرے خون کے قطرے سیلاب بن تیری جانب بڑھیں گے اور تجھے غرق کر دیں گے "

سفیر انقلاب جب یہ واقعہ سنا رہے تھے تو ان کے لہجے سے واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ وہ حوالہ ایک بچے کی داستان کا دے رہے ہیں مگر وہ بذات خود ایسے ہی جذبات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

آپ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ آپ اسلام اور وطن کے دفاع کیلئے سامراج کیخلاف ہر طرح سے نبرد آزما رہے۔ آپ نے خون کے آخری قطرہ تک سامراج سے ٹکرانے کا عزم کر رکھا تھا۔ آپ نے نہایت بے جگری سے سامراج کی ہر سازش کا مقابلہ کیا۔

امریکہ نے خلیج میں مداخلت کی، کشمیر کے حق خود ارادیت کو اقوام متحدہ میں ٹھکرایا، بیت المقدس کی بے حرمتی پر اسرائیل کو اکسایا، اسلامی ریاستوں میں غنڈہ گردی کی یا پاکستان میں فرقہ واریت کو جنم دے کر اس کی پرورش کی۔ سفیر انقلاب نے ہر قدم پر اسے للکارا۔ ہر مرحلہ پر اس کے خلاف احتجاج کیا ...... گھر گھر اسکے خلاف پیغام پھیلایا اور غیور عوام میں اسے رسوا کیا۔

آپ پر احباب اور خفیہ اداروں سے تعلق رکھنے والے مخلص افراد نے کئی بار واضح کیا کہ امریکہ کے خلاف آپ کی سرگرمیاں حکومت پاکستان کو گراں گزرتی ہیں اور پاکستان میں امریکی مفادات کا تحفظ کرنے والے گروہ آپ کے وجود کو برداشت

کرنے کا حوصلہ ہار چکے ہیں لہٰذا آپ اپنے رویہ میں نرمی پیدا کریں، مگر آپ فرماتے "اسلام دشمن سامراج کے خلاف نرمی یا مصلحت میرا نہیں حکمرانوں کا شیوہ ہے" میری زندگی کا ایک وقت مقرر ہے آپ وصیت میں بھی یہ فقرہ لکھتے ہیں کہ "دوستو ! وقت مقرر آپہنچا اور ہم ایک طویل سفر کی طرف روانہ ہو گئے"

آپ نے عمر بھر قبیلہ (ملت) کے افراد کو بقول شاعر یہ درس دیا کہ

زندگی کا سفر کاٹنا ہے اگر آگ پر رقص کرنے کا فن سیکھ لو
جسم چاہے جلے، روح پھولے پھلے، جینا چاہو تو مرنے کا فن سیکھ لو

آپ کی عظمتوں کو سلام کرتے ہوئے یہ بات دعویٰ سے کی جاسکتی ہے کہ آپ شعور کی پہلی سوچ سے خون کے آخری قطرہ تک اسلام اور وطن کی عظمت کے دفاع کی خاطر سامراج اور اس کے ایجنٹوں سے معرکہ آراء رہے اسلئے آپ کے جنازہ پر خطاب کرتے ہوئے شیعہ سنی عمائدین نے آپ کو شہید اسلام اور شہید وطن کا خطاب دیا۔

☆☆☆☆☆

سفیر انقلاب کی ذاتی زندگی

یوں تو جو کچھ کتاب کے دامن میں موجود ہے آپ ہی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عکس ہے تاہم یہاں ہماری مراد آپ کی بودو باش، رہن سہن، اخلاق کردار کے چند زاویوں کو اجاگر کرنا ہے تاکہ واضح ہوسکے کہ گوشت پوست کا ایک انسان کمالات کی منزل تک کیسے پہنچتا ہے۔......؟

خداوند کریم نے آپ کی فطرت میں سادگی اور خلوص کا عنصر اس قدر نمایاں فرمایا کہ ہر وہ شخص جو آپ سے زندگی میں چند لمحات یا ماہ وسال کیلئے شناسا ہوا آپ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض خوبیاں بنیادی طور پر ہر انسان کی فطرت میں شامل ہوتی ہیں جبکہ بعض اوصاف کو انسان خود سازی کے مراحل میں فطرت کا جزو بنا لیتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سفیر انقلاب نے اپنے نفس سے متواتر محاذ آرائی کی اور بہت سی خوبیوں کو اپنی فطرت میں شامل کیا۔ آپ نے حضرت علی علیہ السلام کے فرمان ”سب سے بہترین عمل اپنے نفس کو مجبور کرنا ہے“ کے مطابق اپنے اعمال کو اس قدر انجام دیا کہ آپ کی زندگی دوسروں کیلئے نمونہ عمل بن گئی۔

کم کھانا، کم پہننا اور کم سونا ایسی صفات ہیں جو ”صالحین“ میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے بندگان خدا کو اپنی زندگی کی بے ثباتی، دنیا و آخرت کا مکمل ادراک ہوتا ہے اسلئے وہ فرمان معصومؑ کی روشنی میں جتنا دنیا میں رہنا ہے یہاں کیلئے اور جتنا آخرت میں رہنا ہے وہاں کیلئے سامان اکٹھا کرتے ہیں۔

اگر کسی شخص نے محاذ جنگ پر کسی مجاہد کی زندگی کے لمحات کا جائزہ لیا ہو تو وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کتنا سوتا ہے ...... کتنا پہنتا ہے اور کتنا کھاتا ہے ......؟ جن افراد نے ڈاکٹر محمد علی نقوی شہید کو قریب سے دیکھا ہے وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ آپ کی تمام عمر ایک ایسے مجاہد کی سی تھی جو اسلام دشمن قوتوں کے خلاف پہلے مورچے ..... کفن لڑتا رہا اور اپنی زندگی کے تمام طور اطوار مجاہدوں کی طرح

اپنائے۔

معاشرتی حوالے سے آپ ڈاکٹر اور ملی حوالے سے ملت جعفریہ کے قدآور رہنما تھے مگر آپ کا لباس دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ آپ نے لباس کو صرف بدن ڈھانپنے کیلئے پہنا ہوا ہے۔ انتہائی سادہ مگر صاف شرٹ اور پتلون میں آپ اکثر ملبوس پائے جاتے تھے۔ تین سے زیادہ پتلون شرٹ اور دو سے زیادہ شلوار قمیص آپ کے پاس کسی نے نہ دیکھے۔ آپ بعض اوقات کسی پروگرام میں قیمتی لباس پہن کر آتے تو قریبی احباب تذکرہ ضرور کرتے مگر اب پتہ چلا کہ وہ لباس جو اس وقت زیر بحث آتے تھے وہ آپ کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر عباس علی نقوی کے ہوتے تھے۔

آپ ایک لباس کو اتنا استعمال میں لاتے کہ وہ آپ کا تعارف بن جاتا بسا اوقات کسی مرکزی پروگرام میں جب نئے تنظیمی برادران (جو ڈاکٹر صاحب سے شناسا نہ ہوتے) کو ڈویژنز کی جانب سے بھیجا جاتا تو سینئر برادران ڈاکٹر صاحب کا غائبانہ تعارف کراتے کہ ''دوستو جین کی نیلی پتلون' دھاری دار شرٹ اور سفید و سیاہ رنگ کے بوٹوں والے نحیف شخص کی باتیں غور سے سننا اور اسے قریب سے جانچنے کی کوشش ضرور کرنا وہ ڈاکٹر محمد علی نقوی ہوں گے''

آپ کے ہم عصر رفیق نے بتایا کہ ایک مرتبہ ان کیلئے ایک دوست ایران سے شرٹ کا تحفہ لایا جو انہیں کسی طور بھی پسند نہ آیا۔ انہوں نے بصد شکریہ تحفہ وصول تو کر لیا مگر پہننے سے گریز کیا کہ ایسے میں ڈاکٹر صاحب بھی ان کے گھر پہنچ گئے۔ شرٹ ابھی میز پر پڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو آپ کے دوست نے صورتحال واضح کر دی کہ انہیں یہ غیر معیاری شرٹ پسند نہیں آئی۔ دوست کی یہ بات سن کر ڈاکٹر صاحب نے ان سے یہ شرٹ طلب کی اور دو سال تک اسے خوب استعمال کیا۔

بقول آپ کے رفیق کہ وہ جب بڑی بڑی محافل میں ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت کے جسم پر اپنی ناپسندیدہ معمولی سی شرٹ کو دیکھتے تو انہیں ندامت ہوئی کہ انہوں نے جس چیز کو غیر معیاری جان کر ٹھکرایا تھا آج اسے ایک معیاری انسان نے گردوپیش سے بے نیاز ہوکر زیب تن کیا ہوا ہے۔

ایک مرتبہ دو نوجوان آپ کیلئے پتلون شرٹس خریدنے لاہور کے معروف "پینو راما سنٹر" جانے لگے تو انہوں نے کپڑوں کے نام لیکر آپ سے آپ کی پسند چاہی۔ آپ نے فرمایا "دوستو یقین جانیئے کہ مجھے کپڑوں کی اقسام کا کوئی علم نہیں مجھے اتنا معلوم ہے کہ کپڑے سے جسم ڈھانپا جاتا ہے" جب یہ دوست دکان پر پہنچے تو دکان کا مالک بھی آئی۔ ایس۔ او کا سابق عہدیدار نکلا غالباً" ڈاکٹر صاحب پہلے بھی اسی دکان سے اپنے کپڑے خریدا کرتے تھے' انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے کبھی بھی لباس کے بارے میں اپنی پسند نہیں بتائی بلکہ اپنی پیمائش بتا کر ہماری پسند پر لباس لے لیتے ہیں۔

شیخ زید اسپتال میں جب آپ کلیدی عہدے پر فائز ہوئے تو بعض احباب کا خیال تھا کہ اب آپ کے لباس میں تبدیلی ضرور آئیگی مگر یہاں بھی فطرت غالب رہی۔ ایک روز میں آپ سے ملنے آپ کے آفس گیا۔ دیکھا کہ آپ نے نہایت معمولی سا لباس پہنا ہوا تھا جبکہ آپ کے جوتے خاصے پرانے تھے۔ میں نے عرض کی "ڈاکٹر صاحب ہوسکے تو بے چارے بوٹوں کو چھٹی دے دیں" ...... مسکرائے اور فرمانے لگے کہ "دیکھو یار اس ماہ کپڑے لیئے ہیں۔ اگلے ماہ جوتے کی بھی سوچیں گے ایک وقت میں سب کچھ خریدنا مشکل ہے"

میں سمجھتا ہوں کہ دو چار سو روپے کے جوتے خریدنا آپ کیلئے مشکل نہ تھا مگر ایک ساتھ نئے کپڑے اور جوتے پہننا آپ کیلئے مشکل تھا۔ آپ کا معمول تھا کہ آپ نئے کپڑے کو دھلا کر استعمال کرتے تا کہ ان کی چمک باقی نہ رہے جبکہ جوتے ایسے استعمال کرتے جنہیں پالش کرنے کی نوبت تک نہ آتی۔

آپ کی زندگی مسافروں جیسی تھی۔ جس طرح ایک مسافر سفر میں اپنے پاس نہایت کم سامان رکھتاہے اس طرح آپ نے زندگی کے سفر میں اپنے پاس اتنا کچھ رکھا جو آپ کیلئے اشد ضروری تھا۔ آپ دوسرے رہنماؤں کی طرح دو یا تین روزہ پروگرام کیلئے کپڑوں سے بھرا بریف کیس اپنے پاس نہ رکھتے۔ احتیاطاً" ایک سوٹ اپنے ساتھ لے لیتے جس کیلئے بریف کیس کا ہونا لازمی نہ ہوتا۔ آغاز میں آپ کے پاس ایک چھوٹا سا تھیلا ہوا کرتا تھا جسے آپ کندھوں پر لٹکائے پروگرام میں پہنچ جاتے۔ بعد میں

زینبیہ اسپتال کے بارے میں قائد ملت کو بریفنگ دیتے ہوئے۔

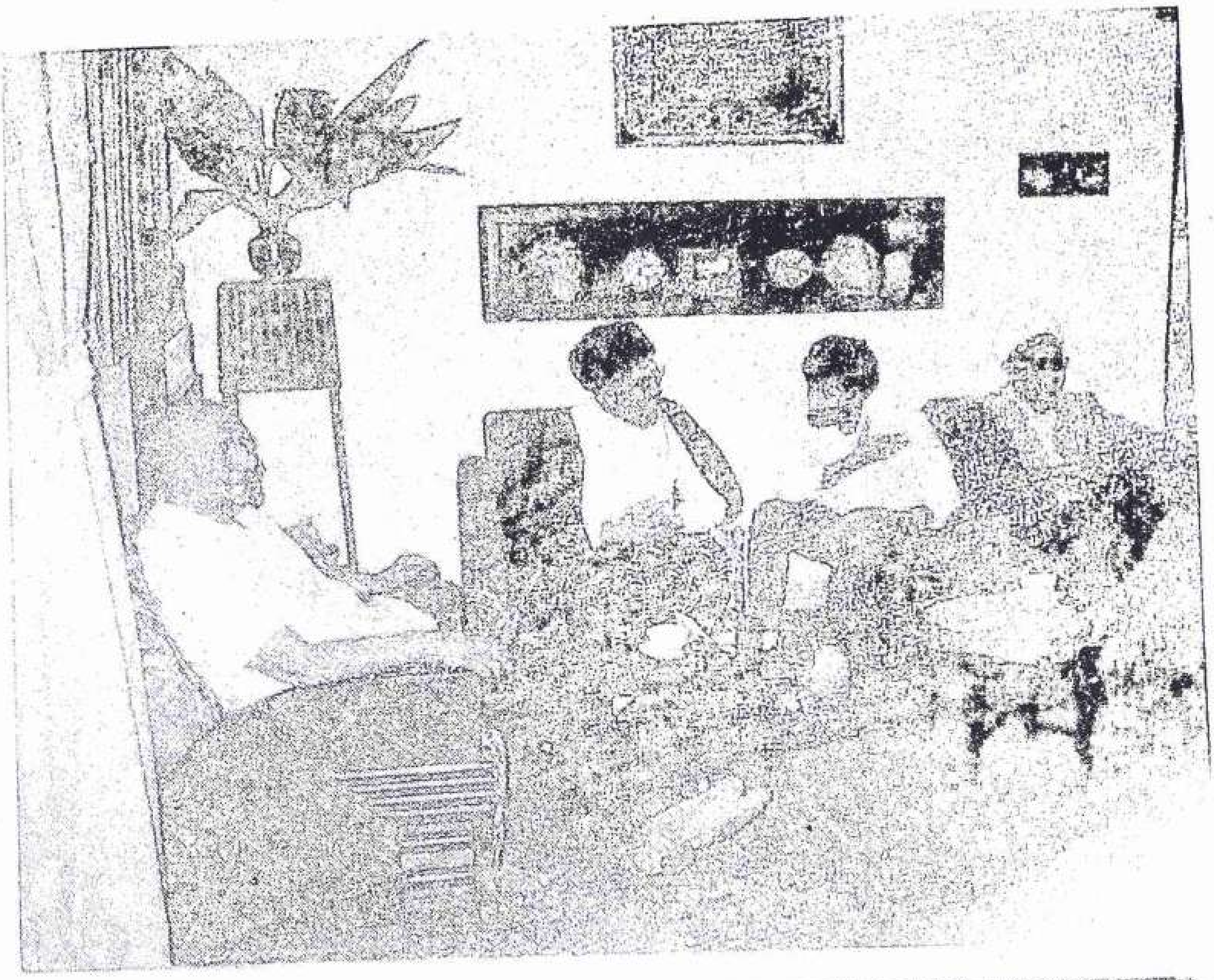

شاپنگ بیگ کا رواج آیا تو آپ اپنا سوٹ لفافہ میں بھی رکھ لیتے۔

ایک مرتبہ لندن میں ہونے والی "ورلڈ اہلبیت کانفرنس" میں شرکت کیلئے جانے لگے تو آپ کی اہلیہ نے آپ کے بریف کیس میں دو تین عدد سوٹ رکھ دیئے۔ چار پانچ روز بعد آپ لندن سے واپس آئے تو آپ کے کپڑے اسی ترتیب سے پڑے ہوئے تھے۔ آپ نے صرف ایک شرٹ نکال کر استعمال کی تھی۔ گھر والوں کے استفسار پر معلوم ہوا کہ آپ نے وہاں کپڑے استعمال ہی نہیں کیئے۔ جب انہوں نے شکوہ کیا تو فرمایا "میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں وہاں کپڑے تبدیل کرتا رہتا۔ وقت مختصر تھا لہٰذا میں نے وہاں بڑی بڑی شخصیات سے مستفید ہونے کو ترجیح دی"

آپ کے ایک قریبی رفیق نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ ایک دفعہ کسی پروگرام میں شرکت کیلئے چند احباب ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گئے۔ پروگرام دو تین روز کا تھا لہٰذا ہر ساتھی نے اپنے اپنے بیگ میں ایک آدھ سوٹ لے لیا جبکہ ڈاکٹر صاحب نے کوئی اضافی لباس نہ لیا۔ دوسرے روز کی اہم نشست معززین شہر کے ساتھ تھی چنانچہ احباب نے ڈاکٹر صاحب سے التماس کی وہ رات کو سوتے وقت اپنا لباس تبدیل کر لیا کریں تاکہ پتلون شرٹ سلوٹوں سے محفوظ رہے۔ جتنے احباب آپ کے ہمراہ تھے ان میں سے کسی کا لباس بھی آپ کو فٹ نہ آتا تھا۔ چنانچہ آپ کو ایک لمبا قمیص اور دھوتی پہننے کیلئے دی گئی۔ آپ نے دھوتی باندھنے سے خاصا گریز کیا تاہم مجبوری کے باعث آپ کو ایسا کرنا پڑا۔

چونکہ ڈاکٹر صاحب انتہائی مہذب شخصیت تھے لوگوں کے سامنے قمیص تک اتار کر بیٹھنا آپ کیلئے ناممکن ہوتا تھا۔ اس لیئے آپ قمیص اور دھوتی کے ساتھ رات بھر نہ سوسکے۔ صبح احباب کی آنکھ کھلی تو انہوں نے آپ کو جاگتے دیکھا ..... احباب نے گزری شب کے بارے میں پوچھا تو آپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "بہت فضول قسم کا لباس ہے" اس موقع پر برادران نے خاصا مزاح کیا اور زندگی میں کبھی کبھار اس واقعہ کی یاد سے آپ بھی محظوظ ہوتے رہے۔ بقول شاعر ؎

پھرا ہوں کوچہ بہ کوچہ متاع درد لیئے
اگرچہ خلق میری سادگی پہ ہنستی تھی

آپ اکثر اوقات پتلون شرٹ میں گزارتے ٹائی لگانے یا اضافی کوٹ پہننے سے گریز کرتے۔ کبھی کبھار چھٹی کے روز شلوار قمیض پہن لیتے۔ آپ شیخ زاید اسپتال میں تھے کہ وہاں کے چیئرمین نے آپ کو ٹائی لگانے کی تکرار کی مگر آپ اس مسئلہ پر اسے ہر بار ٹال گئے۔ آخر ایک بار وہ امریکہ گئے واپس لوٹے تو انہوں نے آپ کو ٹائی کا تحفہ دیا۔ ان کے اصرار پر آپ نے یہ تحفہ قبول کر لیا مگر پھر بھی استعمال نہ کیا۔ ایک مرحلہ پر چیئرمین نے کہا "محمد علی ٹائی لگانا کہیں فقہ جعفریہ میں حرام تو نہیں ہے .....؟" آپ نے جواباً فرمایا "جناب ! اسلام میں جائز نہیں ہے" اس جواب کے بعد انہوں نے پھر کبھی اصرار نہ کیا۔

چونکہ آپ اپنے جسم کی زیادہ حفاظت کرتے تھے۔ موٹاپا سے آپ کو از حد نفرت تھی اسلیئے آپ عمر بھر سمارٹ اور چاک و چوبند رہے۔ جسم میں تبدیلی نہ آنے کے باعث آپ لباس کو برسوں تک استعمال میں لاتے۔ آپ کے پاس ایک عدد کوٹ تھا جو نہ جانے آپ نے کب سلوایا تھا۔ شدید سردیوں کے موسم میں کبھی کبھار یہ کوٹ آپ کے گھر سے باہر نکل آتا۔ ایک مرتبہ ایک میٹنگ میں آپ یہ کوٹ پہن کر آئے تو خاصے خوبصورت لگے۔ اس محفل میں شریک ایک برادر نے مجھے بتایا کہ "آج تو ڈاکٹر صاحب نے کوٹ پہنا ہوا تھا اور بہت خوبصورت لگ رہے تھے دعا کریں کہ انہیں نظر نہ لگ جائے"

آپ کے پاس سبز رنگ کی ایک "کمانڈو جیکٹ" تھی جسے آپ مخصوص انداز میں استعمال کرتے۔ اس کے بازوؤں میں اپنے بازو کم ڈالتے صرف کندھے پر لٹائے رکھتے۔ آپ کا یہ انداز اس قدر مقبول ہوا کہ تنظیمی ساتھیوں نے اسے بطور "اسٹائل" اپنا لیا۔

ان احباب کا خیال تھا کہ شاید آپ بازار جانے اور لباس خریدنے سے پرہیز کرتے تھے لہٰذا وہ آپ کیلئے قیمتی لباس کا تحفہ لاتے مگر آپ یہ اچھے کپڑے اپنے قریبی ساتھیوں میں تقسیم کر دیتے۔

ایک دفعہ آپ کے ایک جانثار نوجوان نے آپ کی استعمال شدہ شرٹ پہنی ہوئی تھی اور وہ احباب کی محفل میں اسے اعزاز سمجھ رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ایسے

انسان کے استعمال شدہ لباس کو زیب تن کرنا تو کجا بلکہ ان کے جسم سے مس شدہ لباس کا پہننا بھی سعادت ہے اس نوجوان نے دعا کی کہ خدا کرے کہ اس لباس کے اثرات میرے وجود میں داخل ہوں اور میں بھی راہ خدا میں ڈاکٹر صاحب کی طرح متحرک رہوں"

آپ قیمتی لباس سے اسقدر الرجک تھے کہ ایک مرتبہ "یوم القدس" کے موقع پر ایک دوست امریکی صدر اور اسرائیلی وزیر اعظم کا پتلا بنانے کیلئے انارکلی سے دو پتلون شرٹس لائے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی قیمت پوچھی تو معلوم ہونے پر مزاحا" کہا "بدبختوں کے بڑے قیمتی لباس لائے ہو" یہ سن کر تنظیمی ساتھی نے جواب دیا "ڈاکٹر صاحب صدر اور وزیر اعظم کے پتلے بنانے ہیں خرچ تو ہوگا"

ایک مرتبہ کسی پروگرام میں شرکت کیلئے آپ دوست کو بلانے اس کے گھر گئے۔ تو اس نے نہانے، کپڑے استری کرنے اور جوتے پالش کرنے میں خاصی دیر لگا دی، وہ معطر ہوکر گھر سے نکلے۔ گاڑی میں بیٹھے تو آپ نے فرمایا "عزیز دوست صفائی نصف ایمان ہے مگر کپڑوں اور جوتوں کو اتنی اہمیت نہ دیں کہ وہ آپکے سر پر سوار رہیں۔ اچھا لباس پہننا بھی اچھی بات ہے مگر یاد رکھیں کہ لباس انسان کی قیمت نہیں بڑھاتا بلکہ انسان سے لباس اور زمان و مکان کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے...

سفیر انقلاب کی اس فکر سے یہی اخذ ہوتا ہے کہ ریشم زیب تن کرنے سے انسان قیمتی نہیں بنتا بلکہ انسان کی وجہ سے کھدر بھی قیمتی بن جاتا ہے...... تخت و تاج اور محلات انسان کی قیمت میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ انسان کی بدولت بوریا اور جھونپڑی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں دور حاضر کی بہترین مثال امام خمینی رضوان اللہ علیہ کی ذات گرامی ہے کہ آج شاہ ایران کے محلات کو لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ پیر جماران کا بوسیدہ گھر محبتوں کا محور بنا ہوا ہے۔ شاہ ایران کے ہیروں سے مزین تخت و تاج باعث عزت نہیں ہیں جبکہ امام خمینی کا ٹاٹ نما بوسیدہ قالین بوسہ گاہ بنا ہوا ہے۔

سفیر انقلاب کی فکر کا نچوڑ یہ تھا کہ ایک مجاہد کی پسینہ سے شرابور وردی شہنشاہوں کے معطر پیرہن سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام

میں شہید کو اسکے خون آلود لباس کے ساتھ دفنانے کی تاکید ہے کیونکہ شہید کا جسم بارگاہ الٰہی میں اتنا باعظمت ہوتا ہے کہ اس پر اس کے اپنے لباس کے علاوہ کوئی اور لباس نہیں جچتا۔

آپ آئی۔ ایس۔ او اور تحریک جعفریہ پاکستان کے صرف رہنما ہی نہیں تھے بلکہ بانی بھی تھے۔ اس کے علاوہ ملت جعفریہ کے کئی فلاحی ادارے آپ کی زیر سرپرستی چل رہے تھے۔ آپ کا تعارف صرف ملکی حدود تک محدود نہ تھا بلکہ بین الاقوامی سطح پر آپ اسلام کے ایک عظیم فرزند کے حوالے سے جانے جاتے تھا۔ معاشرتی طور پر ایک ڈاکٹر ہونے کے علاوہ لوگ آپ کا بے پناہ احترام کرتے تھے۔ آپ کی ایک چِٹ پر لوگ ہزاروں روپے دے دیتے۔ آپ کی لبوں کی ایک جنبش پر لاکھوں روپے آپ کی گود میں ڈال دئے جاتے۔ بات صرف اسی اعتماد تک محدود نہ تھی بلکہ ہزاروں نوجوان اپنی زندگیوں کے بارے میں آپ کے اشارے کے منتظر رہتے۔ اتنی بڑی عزت کے باوجود آپ نے ایک پل کے لئے بھی تکبر نہ کیا۔

آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ ہر جلسہ یا میٹنگ میں پہلے پہنچیں تاکہ دیر سے پہنچنے پر لوگوں کو احتراماً" اٹھنا نہ پڑے۔ اگر کبھی میٹنگ یا کسی پروگرام میں تاخیر سے پہنچتے تو جہاں جگہ ملتی جلدی سے بیٹھ جاتے۔ بعض اوقات بڑے پروگراموں میں آپ اتنا پیچھے بیٹھے ہوتے کہ سٹیج سیکرٹری کی نظر آپ پر نہ پڑتی اور یوں آپ کی اہم مہمانوں میں نشست خالی رہتی۔

قومی اجتماعات میں آپ کو ہمیشہ وی ۔ آئی ۔ پی (V.I.P) کارڈ جاری ہوتا مگر آپ یہ کارڈ کبھی استعمال نہ کرتے اور نہ ہی کارڈ کے طفیل (V.I.P) نشستوں پر بیٹھنے کی خواہش کرتے۔ آپ کارکنوں میں کھڑے ہو کر مقررین کا خطاب سنتے یا عمومی نشستوں پر بیٹھ کر مستفید ہوتے۔ بعض اوقات عوام کے ہجوم میں اضافہ ہوتا تو آپ اپنی نشست تک ان کی حوالے کرتے۔ مگر عام طور پر ایک عام انسان کو محسوس نہ ہوتا تھا کہ اسے اپنی نشست پیش کرنے ولالا کتنا بڑا انسان ہے ....؟

۱۹۹۱ء میں "روزنامہ جنگ لاہور" کے زیر اہتمام ایک مذاکرہ "آئی جے آئی کی حکومت نے کیا کھویا کیا پایا" منعقد ہوا۔ جس میں قومی رہنماؤں نے کئی روز تک اظہار

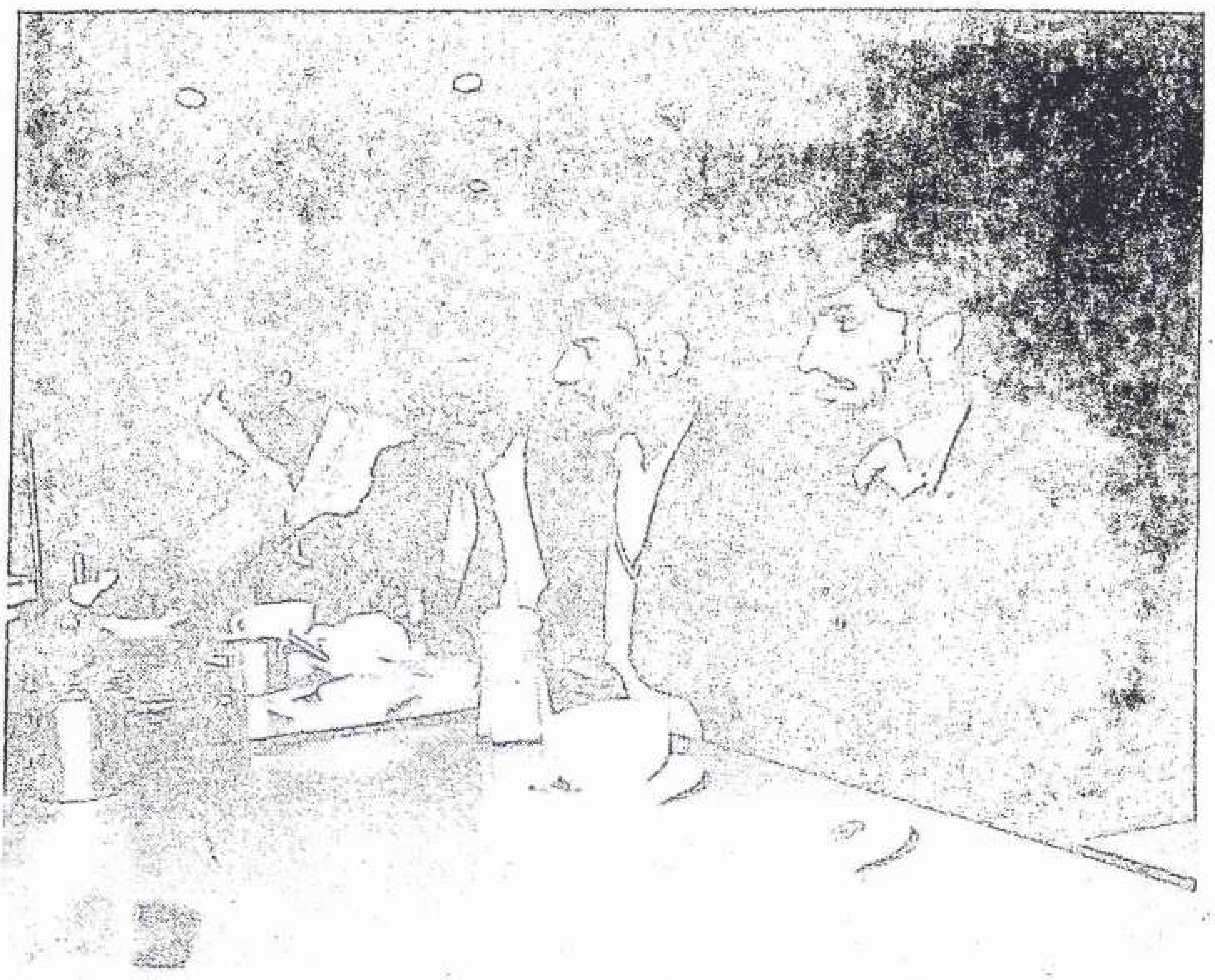

خیال کیا۔ جس روز تحریک جعفریہ پاکستان کے سربراہ علامہ سید ساجد علی نقوی نے پاکستان کے عوام سے خطاب کرنا تھا۔ اسی روز ہم بھی فورم پہنچے۔ اگلی نشستوں پر اہم شخصیات کے ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک نشست پر ڈاکٹر صاحب کا نام نمایاں تھا۔ روایتی شیعہ اور تحریک جعفریہ کی چند قد کاٹھ رکھنے والی شخصیات اپنے مخصوص انداز میں آئیں اور مخصوص نشستوں پر براجمان ہو گئیں۔ جبکہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے نام کی تختی چپکے سے ہٹائی اور وہاں پر موجود ایک بزرگ کو پکڑ کر اپنی نشست پر بٹھا دیا اور خود ہمارے ساتھ نیچے قالین پر بیٹھ گئے۔

آپؒ قیادت کے ساتھ سر اونچا کر کے چلنے یا عوام پر قیادت سے اپنی قربت ظاہر کرنے سے گریز کرتے۔ یہاں تک کہ فوٹو گرافی کے دوران میں چپکے سے سرک جاتے۔ آپؒ اپنے قائد کی حفاظت کے لئے عام کارکن سے زیادہ متحرک رہتے۔

آپؒ جس طرح کسی کی غیبت سننے پر منہ پھیر لیتے اسی طرح اپنی تعریف کے وقت بات کا پہلو بدل دیتے۔ آپؒ چوں کہ ہزاروں نوجوانوں کی پسندیدہ شخصیت تھے اس لئے برادران جب بھی آپؒ کے بارے میں تعریفی جملے ادا کرتے تو آپؒ انہیں ایسے کرنے سے منع فرماتے۔

ایک مرتبہ آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی مجلس عاملہ کا اجلاس جعفریہ کالونی لاہور میں منعقد ہوا۔ شام کی نشست "سابق مرکزی صدور طلباء کے حضور" کی کمپیر نگ مجھے کرنا تھی۔ نشست کے آغاز سے قبل ڈاکٹر صاحب نے مجھے بلایا اور کہنے لگے کہ "مجھے سٹیج پر نہیں بلانا آج میری خواہش ہے کہ میں سامعین میں بیٹھ کر نوجوان سابق مرکزی صدور کے خیالات ایک مبصر کی حیثیت سے سنوں" میں ان کی فکر کی گہرائی تک نہ پہنچ سکا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے انہیں سٹیج پر تشریف لانے کی دعوت دی۔ آپؒ دعوت پر تشریف لائے اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گئے۔ آپؒ کے بعد باری باری سابق مرکزی صدور تشریف لائے اور انہوں نے بھی اپنی نشستیں سنبھالیں۔ البتہ پروگرام کے اختتام پر آپؒ نے اظہار ناراضگی فرمایا اور کہنے لگے کہ "خطاب کی دعوت دے دیا کریں آئندہ گھنٹوں تک سٹیج پر نہ بٹھایا کریں"۔ چونکہ آپؒ ہر محفل کی جان ہوا کرتے تھے اور آپؒ کی شخصیت حاوی

ہوتی تھی اس لئے آپؒ کی شان و عظمت کے پیش نظر آپؒ کو سٹیج پر پہلے دعوت دی جاتی اور آخر میں خطاب کی گزارش کی جاتی جس کی وجہ سے آپؒ کو حاضرین جلسہ کے سامنے دیر تک اونچے سٹیج پر بیٹھنا پڑتا جو آپ کو گراں گزرتا۔ آپؒ اپنے امام اول حضرت علی علیہ السلام کے فرمان "سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ فخر نہ کریں" کے تابع تھے"۔

اس پروگرام میں جب سابق مرکزی صدر برادر سید تصور حسین نقوی سے پسندیدہ شخصیت کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کا نام لیا جسے سن کر آپؒ نے "استغفراللہ" پڑھنا شروع کر دیا۔ ایسے ہی جب کچھ احباب محافل میں آپؒ کو بطور آئیڈیل پیش کرتے تو آپؒ انہیں منع فرماتے اور تاکید کرتے کہ "وہ اپنی پسند کا معیار بلند کریں۔ تنظیمی افراد کی کم از کم پسندیدہ شخصیات ائمہ طاہرینؑ ہونے چاہئیں"

ایک دفعہ چند احباب کی محفل میں آپؒ کا ذکر ہونے لگا تو میرے منہ سے میرے دل کی بات چھلک گئی اور میں نے کہا کہ "ڈاکٹر محمد علی نقویؒ ایک ایسے انسان ہیں جن کا نام بھی باوضو ہو کر لینا چاہئے۔ غالباً" برادر مظفر اعوان نے ان تک یہ بات پہنچا دی اور آپ نے پہلی ملاقات میں مجھے سختی سے ڈانٹا۔

شہادت سے تقریباً" بیس روز قبل آپؒ سے ملاقات ہوئی برادر ارشاد حسین ناصر کمالیہ اور میں نے آپؒ کے حضور تجویز پیش کی کہ آئی۔ ایس۔ او کی تاریخ اور سابق مرکزی صدور کے انٹرویوز پر مبنی ایک کتاب منظر عام پر لانی چاہئے تاکہ برادران کے خیالات اور افکار سے نئے ساتھی اپنی سمت کا تعین کریں اور عمل پیرا ہوں۔ آپؒ نے یہ سنتے ہی نفی کی کہ ہم جیسے گناہگاروں اور نکمّے لوگوں کی زندگی بھلا کس کے لئے نمونہ عمل بنے گی ۔ اگر آپ نے زحمت کرنی بھی ہے تو پھر عقائد کی حقیقت اور ائمہ طاہرینؑ کی زندگی اور اسوہ حسنہ کو اجاگر کریں تاکہ صحیح معنوں میں نوجوانوں کو رہنمائی حاصل ہو۔

عام طور پر محسوس کیا گیا ہے کہ بعض شخصیات کی لفظی کسر نفسی کے پیچھے تکبر کی بو آرہی ہوتی ہے۔ مگر آپ نہ صرف کسر نفسی سے کام لیتے بلکہ کڑھتے دل کے

ساتھ فرماتے کہ "خدا نے ہمیں اسلام کی خدمت کی توفیق دی مگر ہم اس توفیق سے انصاف نہ کر سکے"۔

زندگی کے آخری ایام میں اپنے قریبی رفیق برادر نثار ترمذی سے کہا "زندگی کے ۴۳ سال بیت گئے، جذبہ اور جرات کی عمر گزر گئی مگر ہم قوم اور اسلام کی خاطر خواہ خدمت نہ کر سکے" نثار بھائی نے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ نے تو قوم اور اسلام کی بے پناہ خدمت کی ہماری زندگی کو دیکھیں جو بالکل ضائع چلی گئی" یہ سنتے ہی آپؒ نے فرمایا "جو میں نے قوم کے لئے سوچا تھا وہ نہ کر سکا"۔

نہ جانے آپ نے اپنی مظلوم قوم کے لئے کیا سوچا تھا جو اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی کچھ نہ کرنے کے درد کا اظہار کرتے رہے۔ ایسا ہی ایک جملہ آپؒ کی وصیت میں بھی ملتا ہے کہ "میں اپنے احباب سے شرمسار ہوں کہ میں وہ کچھ نہ کر سکا جس کی دوسروں کو تلقین کرتا رہا"۔

ایک اور حقیقت جو آپ میں موجود تھی وہ کم خوری کی علامت تھی آپؒ سفرو حضر، تنظیمی پروگراموں اور پر تکلف دعوتوں پر انتہائی تھوڑا کھاتے۔ ہم نے برسوں کی قربت میں آپ کو کسی کھانے کی فرمائش کرتے نہیں پایا کبھی یہ دیکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی کہ آپ نے کسی موقع پر خدا کی کسی نعمت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہو۔ یہاں تک کہ ہمیں اتنا معلوم نہیں ہو سکا کہ آپؒ کی پسندیدہ یا مرغوب غذا کیا تھی ....؟

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "پیٹو کبھی ترقی نہیں کرتا اس لئے کہ اس کا پیٹ اس کے ذہن پر سوار ہوجاتا ہے وہ عقل کو مثبت سمت میں استعمال نہیں کرپاتا اس کی تمام سوچ پسندیدہ غذاؤں اور مرغن کھانوں کی جستجو میں مصروف رہتی ہے"۔

شہید مظلوم علامہ عارف حسین الحسینیؒ اپنے ایک درس میں فرماتے ہیں کہ "جسم کی اکثر بیماریاں خوراک سے پیدا ہو جاتی ہیں اور بسیار خور ہمیشہ بیماریوں میں مبتلا رہتا ہے۔ کھانے کی لذت کا دلدادہ ہونا بھی ایک بیماری ہے جو خدا کی نعمتوں میں تفریق کا باعث بنتی ہے۔

علامہ سید عارف حسین الحسینی شہیدؒ کے بارے میں مستند روایات ملتی ہیں کہ آپ کے عزت و احترام میں مومنین پر تکلف ضیافتوں کا اہتمام کرتے مگر آپ مرغن یا

زیادہ لذیذ غذا میں ہمیشہ پانی ڈالدیتے اور کھانے کی لذت ختم کر کے تناول فرماتے۔

آپ خود سازی کے دروس میں اکثر اس بات کا ذکر فرماتے کہ انسان کو اتنا کمزور نہیں ہونا چاہئے کہ اسے کھانے کی ایک پلیٹ مکمل طور پر اپنی طرف مائل کر دے یا اس کا نفس کھانے کی لذت پر مجبور ہو جائے۔

چونکہ سفیر انقلاب ائمہ طاہرینؑ کی سیرت پر حتی المقدور عمل پیرا تھے اور شہید علامہ عارف حسین الحسینی جیسی ملکوتی شخصیت کے افکار کا عکس تھے اس لئے آپؒ دیگر امور کی پابندی کے علاوہ کم خوری پر کاربند تھے۔

میں گذشتہ چھ سال کے عرصہ سے آپ سے مربوط رہا ہوں جہاں تک میں نے اخذ کیا ہے کہ آپؒ صبح سویرے گھر سے ہلکا پھلکا ناشتہ کر کے ملازمت کے لئے نکلتے۔ ڈیوٹی کے اختتام پر سیدھا تحریک جعفریہ کے دفتر پہنچتے۔ دن بھر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے، ملک بھر کے حالات کی خبرگیری کرتے۔ دو اڑھائی گھنٹے تنظیمی خدمات سرانجام دیتے اور ٹھیک پانچ بجے اپنے کلینک پر پہنچ جاتے۔ بیسیوں دفعہ اسپتال سے تحریک کے دفتر ایک ساتھ پہنچنے کا اتفاق ہوا۔ آپؒ کا معمول تھا کہ دفتر کے ملازم سے روٹی کا پتہ کرتے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر کے ساتھ کھا لیتے یا اسے پانچ روپے دے کر تین روپے کی دال سبزی اور دو روپے کی روٹیاں منگوا کر پیٹ بھر لیتے۔

ایک مرتبہ میں آپ کے ساتھ شیخ زید اسپتال سے تحریک جعفریہ کے دفتر مسلم ٹاؤن پہنچا۔ آپؒ حسب معمول کھانا منگوانے لگے تو ملازم کو پانچ روپے سپرد کرتے ہوئے فرمایا "شاباش کھانا کھلا دو" اس نے پوچھا ڈاکٹر صاحب دو آدمیوں کے لئے دو روٹیاں کافی ہیں" تو آپ نے فرمایا ہاں ..... ہاں ایک روٹی میں اور ایک تسلیم میاں کھا لیں گے" میں نے یہ سنتے ہوئے عرض کی حضور آپ کا پیٹ نور سے بھرا ہوا ہے ہمارا ایک روٹی پر گزارہ نہیں ہوتا" مسکرائے اور کہنے لگے پھر میرا بجٹ تو پانچ روپے کا ہے ایک روپیہ تم خود دے دو .... باقی دال کی ایک پلیٹ کافی ہے ...."۔

اگر آپؒ دوپہر کا کھانا کھالیتے تو شام کے کھانے سے پرہیز کرتے۔ کلینک پر جاتے تو سموسہ اور چائے سے بھوک مٹا لیتے۔ اگر شام کا کھانا کھانا مقصود ہوتا تو دوپہر کو مکئی کے ایک "سٹہ" سے پیٹ بھر لیتے۔ آپؒ دیگر رہنماؤں کی طرح اپنے آگے

دسترخوان نہ سجاتے نہ تحریک کے دفتر کے ملازمین کو کھانا کھانے تک پابند رکھتے۔ اخبار میں لپٹی ہوئی روٹیاں اپنے سامنے رکھ لیتے اطمینان سے کھانا کھاتے شکراً" للہ پڑھ کر اپنے کام میں مصروف ہوجاتے۔

آپؒ کا معمول تھا کہ آپؒ گھر بہت دیر سے لوٹتے۔ آٹھ بجے شب تک کلینک میں مریضوں کی خدمت کرتے اور آٹھ بجے کے بعد شہر میں جاری کئے گئے دروس میں شرکت فرماتے اور رات گئے تک قومی امور نمٹاتے رہتے۔ گھر لوٹتے تو عموماً" گھر والے سو چکے ہوتے جو کچھ گھریلو کچن میں میسر آتا کھا کر سو جاتے۔

چونکہ آپ کے گھر والوں کو آپ کے کھانے کے بارے میں یقین نہ ہوتا تھا اس لئے وہ آپ کے لئے کھانا تیار کر کے نہ رکھتے۔ بعض اوقات آپ کو ڈبل روٹی اور ایک انڈہ سے دن بھر کی بھوک مٹانا پڑتی۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ کچھ میسر نہ ہونے کے باعث آپؒ پانی پی کر بھوکے سوجاتے۔

آپؒ کھانے کے قطعاً" رسیا نہ تھے۔ بڑے بڑے پروگراموں میں شرکت کرتے اختتام پر مہمانوں کو کھانے کی دعوت دی جاتی تو آپ عام طور پر کھانا کھائے بغیر چلے جاتے۔ کھانے پر ٹوٹ پڑنے والے لوگوں کو دیکھ کر خاصے رنجیدہ ہوتے اگر ایسا کسی تنظیمی ساتھی سے ہوتا دیکھتے تو افسردگی کے ساتھ اس کے نوٹس میں بات لاتے۔

۱۹۹۴ء میں ایران کی قومی اسمبلی کے سپیکر آغا ناطق نوری پاکستان تشریف لائے تو ان کے اعزاز میں ایرانی قونصلیٹ نے عشائیہ دیا۔ اسی تقریب میں یہاں کے اسلامی و سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ اس موقع پر قوالی کا اہتمام کیا گیا اور قوالی کے دوران وہاں پر موجود ایک معروف صاحب عمامہ شخصیت پر کچھ لوگوں نے نوٹوں کی بارش کی اور وہ خود اٹھ کر قوالوں پر نوٹ پھینکتے رہے غالباً" یہ منظر دیکھ کر ڈاکٹر صاحب رنجیدہ ہوئے اور تقریب سے اٹھ کر چلے گئے۔ دوسرے روز ڈاکٹر صاحب نے وہاں پر موجود تنظیمی ساتھیوں سے تقریب کے بارے میں معلومات لیں اور نہایت دکھ کا اظہار کیا۔ یہ سنتے ہی آپؒ تنظیمی برادران پر غصے ہوئے اور کہنے لگے کہ "یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود تم لوگ کھانے کے لئے بیٹھے رہے آئندہ اہداف کو اہمیت دیا کریں"

بعض اوقات آپ کی مصروفیات اس قدر زیادہ ہوتیں کہ آپ کو دن بھر کھانا کھانے کا موقع نہ ملتا۔ یوں آپؒ چائے کے ذریعے بھوک ختم کرتے رہتے۔ آپ نے ہفتہ بھر دروس کا اہتمام کیا ہوا تھا اور لاہور کے مختلف علاقوں میں ہر شام دروس میں شرکت کرتے۔ حتیٰ المقدور صاحب خانہ کے گھر کھانا کھانے سے گریز کرتے۔ ایک مرتبہ جعفریہ کالونی لاہور میں شام کے درس میں شریک ہوئے اسی روز مصروفیت کے باعث آپؒ دن بھر کھانا نہ کھا سکے۔ احباب نے بھی کھانے کا پوچھا تو بھوک کے باوجود ٹال گئے۔ واپسی پر ہمسفر احباب نے تکلف کرنے کا شکوہ کیا تو آپ نے فرمایا درس کا وقت میری بھوک سے زیادہ اہم تھا۔ میں اپنے ذاتی مسئلہ کی وجہ سے دیگر احباب کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ آپؒ کے محافظین احباب نے خصوصی کھانا تیار کیا اور آپؒ کو دعوت دی۔ آپؒ ان کے ہاں پہنچے، کھانا کھایا۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کھانے کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے مگر آپ نے ایسا نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد کسی دوست نے کھانے کے بارے میں تاثرات لئے تو آپؒ نے فرمایا "میں نے کھانا بھوک ختم کرنے کے لئے کھایا تھا لذت کے لئے نہیں" یعنی آپؒ "خوردن برائے زیست نہ کہ زیست برائے خورد" (کھانا زندگی کے لئے ہوتا ہے نہ زندگی کھانے کے لئے) کے مقولہ پر عمل پیرا تھے۔

آپؒ کی کوشش ہوا کرتی تھی کہ ایک دسترخوان پر زیادہ کھانے نہ کھاتے تھے عموماً" تھوڑے چاول، دہی، یا سلاد لیا کرتے تھے۔ اور ایک دن میں دو بار پر تکلف کھانا کھانے سے گریز کرتے۔ اپنی شہادت سے چند روز قبل آپؒ عید کے روز احباب سے عید ملتے ملتے برادر سید راشد نقوی کے قصبہ پہنچے۔ شام کے کھانے کے بارے میں آپؒ نے میزبانوں سے درخواست کی کہ وہ آپ کو ایک روٹی اور ایک کپ چائے دے دیں۔ آپؒ نے واضح کیا کہ اگر اس کے علاوہ تکلف کرنے کی کوشش کی گئی تو آپ ہرگز کھانا نہیں کھائیں گے۔ میزبانوں نے اپنی محبت کے بدولت تکلف کیا۔ کھانا سامنے آیا تو آپؒ نے بصد معذرت واپس لوٹا دیا اور چائے کا ایک کپ پی کر سو گئے۔ میزبانوں نے اصرار کی تو آپؒ بر ہوئے کہ آپ کی درخواست پر توجہ نہ دی گئی۔

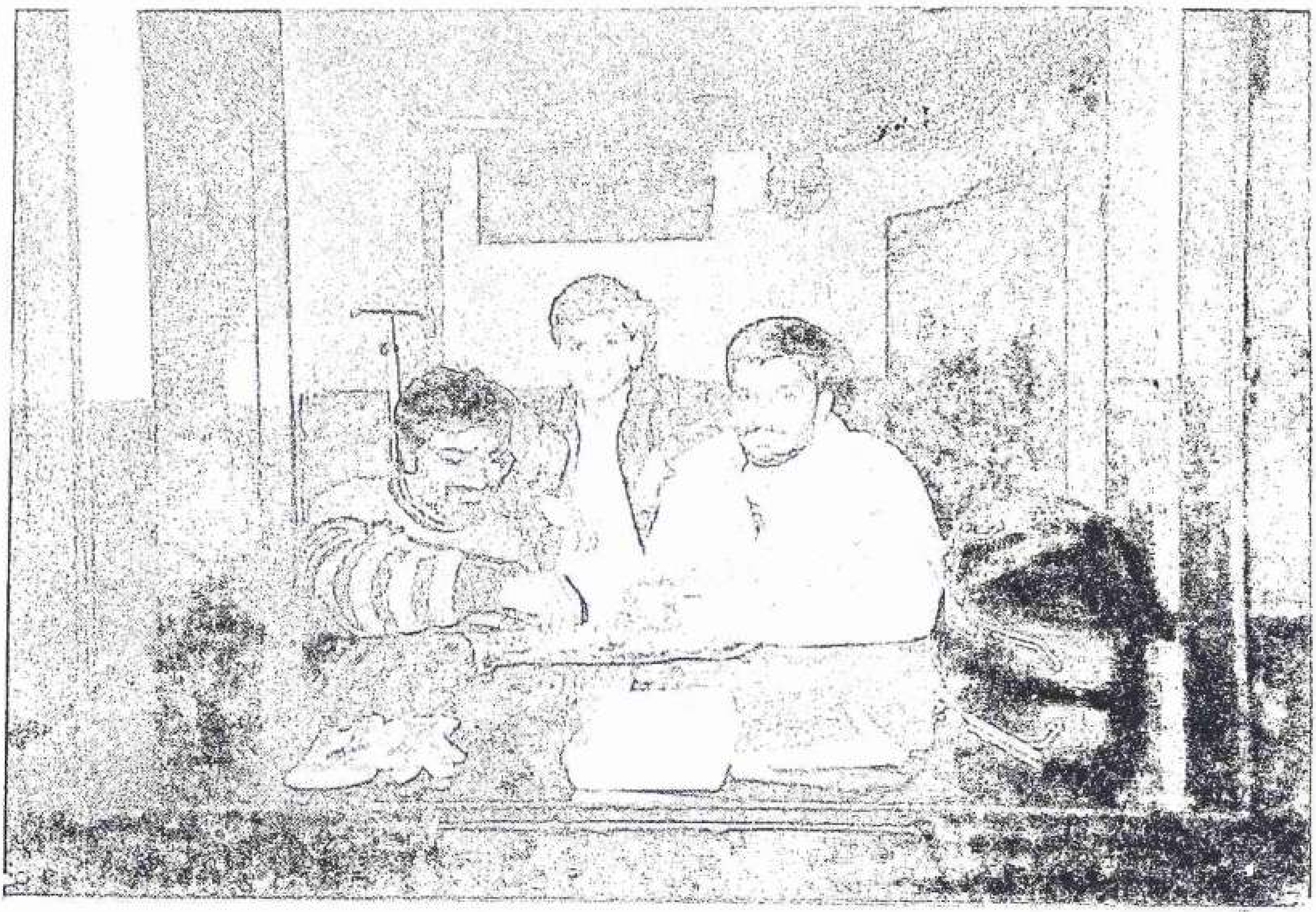

دانش اور سلماں کے درمیان گھر میں کھانا کھاتے ہوئے۔

آپؒ بھوکے بھی تھے مگر دوپہر کو اچھا کھانا کھانے کی وجہ سے شام کا پر تکلف کھانا نہیں کھانا چاہتے تھے۔ آپؒ خدا کی نعمتوں کے بارے میں اپنے جد امجد حضرت علی علیہ السلام کے حقیقی پیروکار تھے۔ یہ بات تاریخ کے دامن میں موجود ہے کہ امام اولؑ اپنی زندگی کا آخری روزہ اپنی دختر حضرت ام کلثوم سلام اللہ علیہا کے گھر افطار کرنے لگے تو انہوں نے جو کی روٹی، نمک اور دودھ کا گلاس پیش کیا۔ امامؑ نے اپنی دختر کو بلا کر فرمایا "بیٹی! علی بیک وقت خدا کی تین نعمتوں سے روزہ افطار کرنے کے قابل نہیں" دختر نے نمک اٹھانے کی کوشش فرمائی تو حضرتؑ نے ان سے نمک لے لیا اور دودھ کا گلاس واپس کر دیا فرمایا "ہماری مستقل خوراک ہمارے پاس رہنے دو .... یہ دودھ رکھ لو کل کام آئے گا" دوسری صبح آپؑ مسجد کوفہ میں ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہوئے قاتل کو پکڑ کر لایا گیا تو آپؑ نے فرمایا "حسنؑ بیٹا یہ شخص پیاسا لگتا ہے اسے دودھ کا گلاس پلا دو یوں آپؑ کا رکھا ہوا دودھ قاتل کو پلا دیا گیا۔

سفیر انقلاب کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کو اس چیز پر توجہ دینی چاہئے جو اس کے کام آسکے۔ جسم کیڑے مکوڑے کی خوراک بنتا ہے اسے فربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مومن کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ "اس کا پیٹ اس کی کمر کی طرف دھنسا ہوا، اس کے کندھوں سے گوشت اترا ہوا، اس کی پسلیاں واضح اور اس کی آنکھیں خوف خدا میں رونے سے باہر سے سیاہی مائل اور دھنسی ہوئی ہوں گی"۔

سفیر انقلاب جہاں فعل و عمل سے حضرت علی علیہ السلام کے لاریب مومن تھے وہاں جسمانی لحاظ سے بھی امامؑ کے فرمان پر پورے اترتے تھے۔ آپؒ وہی فاقہ کش تھے جس کے بارے میں حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ اسلام دشمن قوتیں ایسے لوگوں کی زندگی سے خائف ہوتی ہیں اس لئے وہ منصوبہ بندی کرتی ہیں کہ ۔

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا!
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال لو

قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے

کہ "میرے بندے وہ ہیں جو صبر کرتے ہیں، سچے ہیں، قناعت کرتے ہیں، میری راہ میں خرچ کرتے ہیں اور رات کے پچھلے پہر استغفار کرتے ہیں۔ یعنی خدا کو یاد کرتے ہیں" اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ صبرو قناعت، صداقت، خدا کی راہ میں قربانی اور رات کو خدا کی یاد کے لئے کم سونا خدا کے بندوں کی علامت ہے۔

تفسیر میں ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا مقصد صرف فقراء یا مستحقین میں پیسے یا اناج تقسیم کرنا نہیں بلکہ خدا پاک نے جتنی نعمتیں انسان کو عطا کی ہیں انکو راہ خدا میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔ بولنے، لکھنے اور کام کرنے کی صلاحیت بھی خدا کی نعمتیں ہیں لہٰذا پر اثر مقرر، مبلغ، لکھاری، کارکن یا مجاہد کا ان صلاحیتوں کو مثبت بروئے کار لانا خدا کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔

سفیر انقلاب کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ خداوند کریم کے بندہ کامل کی تمام شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ آپؒ عقیدہ اور گفتگو کے سچے، صابر و شاکر، قناعت پسند، راہ خدا میں اپنا سب کچھ قربان کرنے والے اور رات کو یاد خدا اور اس کے دین کی خدمت کے لئے بہت کم سونے والے تھے۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ آپؒ صبح سویرے گھر سے نکلتے اور رات گئے گھر واپس لوٹتے۔ آپؒ کا سارا وقت رزق حلال کے حصول اور دین اسلام کی خدمت میں صرف ہوتا۔ دن بھر آپ مسلسل مشین کی طرح متحرک رہتے۔ وقت کے اتنے قدردان تھے کہ ایک پل ضائع نہ ہونے پاتا۔ حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان کہ "جو وقت کو برباد کرتا ہے وقت اسے برباد کرتا ہے" آپؒ کی زندگی کا اصول تھا جس پر آپ تمام عمر کاربند رہے۔

آپؒ وقت کو اتنا استعمال کرتے کہ وقت تھک کر آپ کی گود میں آرام کرتا تھا۔ کھانا کھاتے، غسل کرتے، کپڑے بدلتے، احباب سے ملتے، یہاں تک کہ گاڑی چلاتے تو آپ کو ہر پل وقت کا خیال رہتا۔ کپڑے بدل کر شیشے کے سامنے سنورنا یا زلفیں سنوارنا تو آپؒ کے آئین حیات کے منافی تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپؒ گھر میں کپڑے بدلتے بدلتے بیلٹ ہاتھ میں لیتے، بالوں پر ہاتھ مارتے ہوئے گھر سے جلدی

نکلتے' بیلٹ اور جوتوں کے تسمے گاڑی میں ٹھیک کرتے۔

ایک مرتبہ بوٹوں کے بارے میں کسی دوست نے کہا کہ جوتے اچھے ہیں' آپ کہنے لگے دوڑنے میں مدد دیتے ہیں مگر خامی یہ ہے کہ تسمے باندھنے میں وقت ضائع ہوتا ہے اسی طرح آپ نے موٹر سائیکل تیز چلائی تو دوست نے وجہ پوچھی 'فرمایا "بندہ خدا آہستہ چلنے سے وقت کا ضیاع ہے۔

احباب آپؒ کا مزاح سناتے ہیں کہ آپ کے پاس جب بھی کوئی مریض قبض کی شکایت لے کر آتا تو آپؒ مزاحاً کہتے "بندہ خدا شکر کرو کہ آپ کا وقت ضائع نہیں ہوتا"۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "مومن کی زہد و تقویٰ سے نہیں بلکہ امور کے بجالانے اور ان کے نظم و ضبط سے اس کی پہچان کرو"

زندگی کے نظم و نسق اور امور کے بجا لانے میں آپ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ آپؒ کے طرز زندگی کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے انسانی جسم میں کمپیوٹر نصب کر دیا ہے۔ جو پروگراموں کو ترتیب اور انجام دینے میں کامیابی کے ساتھ مصروف کار ہے۔ وقت کی قدردانی اور اسلام کی خدمت کے تسلسل کو دیکھ کر ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے آپ زندگی کے چند روز بھی مشروط لائے ہیں۔

آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر انسان کی جیب سے اس کی کچھ رقم وغیرہ گر جائے یا کٹ جائے تو وہ بے حد افسردہ ہوجاتا ہے مگر ہر روز ہماری زندگی کے چوبیس گھنٹے ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں لیکن ہم ان کا احساس ہی نہیں کرتے۔

لاہور سے باہر کا کوئی ساتھی اگر کام کے لئے لاہور آتا آپؒ ملاقات میں وجہ آمد دریافت کرتے۔ اگر کام معمولی ہوتا تو آپؒ نہایت افسوس کی ساتھ فرماتے کہ وہ آئندہ ایسے کاموں کے لئے فون پر رابطہ کر لیا کریں یا خط لکھ دیا کریں مگر وقت ضائع نہ کیا کریں۔

آپؒ اپنی قوم کے کسی نوجوان کو بے روزگار دیکھتے تو فرماتے کہ اس کا قیمتی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس درد اور احساس کی بدولت آپؒ اسے کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتے۔

شیخ زید اسپتال میں آپ ایسے عہدے پر فائز تھے جہاں آپ کو صرف فائلوں پر دستخط کرنے پڑتے تھے یوں میری نوکری بھی کچھ ایسی ہی تھی البتہ کام کی نوعیت مختلف تھی۔ ایک روز آپؒ میرے پاس تشریف لائے کام کے بارے میں پوچھا۔ چائے پی اور فرمایا ”اس کا مطلب ہے کہ آپ اور میں وقت ضائع کر رہے ہیں“ مجھے یہ بات گہرائی تک سمجھ نہ آئی تو آپؒ نے وضاحت فرمائی کہ یہ کام ”کلرکوں“ والے ہیں۔ یہ کام ان لوگوں کو کرنے چاہئیں جن کے صرف ہاتھ کام کرتے ہوں اور ان کی زندگی کا مقصد صرف کرسی پر بیٹھنا ہو۔ جن لوگوں کے ذہن کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ان کے لئے یہ وقت کاضیاع ہے“ اس موقع پر آپ نے اپنی نوکری سے مستعفی ہونے کے ارادہ کا اظہار فرمایا اور میرے لئے ”ہفت روزہ رضاکار لاہور یا ”المصطفیٰ سکولز پروجیکٹ“ کو سنبھالنے کی خواہش کی۔

آپؒ پیشہ وارانہ طور پر انسانیت کے خدمت گار تو تھے ہی مگر اسپتال سے باہر بھی آپ کا یہ جذبہ نمایاں کارفرما تھا۔ ایک مرتبہ گاڑی پر اپنے دوستوں کے ہمراہ لاہور کی مصروف شاہراہ سے گزر رہے تھے دیکھا کہ ایک ضعیف شخص کے سائیکل سے اس کا سامان نیچے گرگیا ہے اور وہ مدد کا خواہاں بزرگ کسی مددگار کا منتظر کھڑا ہے۔ آپؒ کی گاڑی تیزی سے آگے نکلی تو آپ نے گاڑی روکی پیچھے مڑے اور گاڑی سے خود اتر کر بزرگ کی گٹھڑی اٹھائی اور اس کے سائیکل پر لاد دی۔ سامان کو رسی کے ساتھ مضبوطی سے باندھا اور بابا کو روانہ کیا .... بابا جان چل دئے مگر آپؒ اسے کچھ دیر تک دیکھتے رہے۔ جب آپ کو اطمینان ہوا کہ اب سامان نہیں گرے گا تو فوراً عازم سفر ہو گئے۔

ایک دفعہ آپؒ لاہور کے فیروز پور روڈ سے گزر رہے تھے آپ کا ساتھی گاڑی بڑی تیزی سے چلا رہا تھا کہ ایسے میں دو ٹانگوں سے ایک معذور انسان اچانک آگے آگیا۔ ڈرائیور نے بریک لگائی اور گاڑی مشکل سے معذور کے قریب جا رکی۔ آپؒ جلدی سے نیچے اترے معذور سے دست بستہ معافی مانگی اور اسے پکڑ کر سڑک کے دوسرے کنارے چھوڑ آئے .... واپس لوٹے تو ڈرائیور ساتھی پر برس پڑے کہ انہوں نے گاڑی روک کر معذور کے گزر جانے کا انتظار کیوں نہیں کیا۔ آپؒ اس

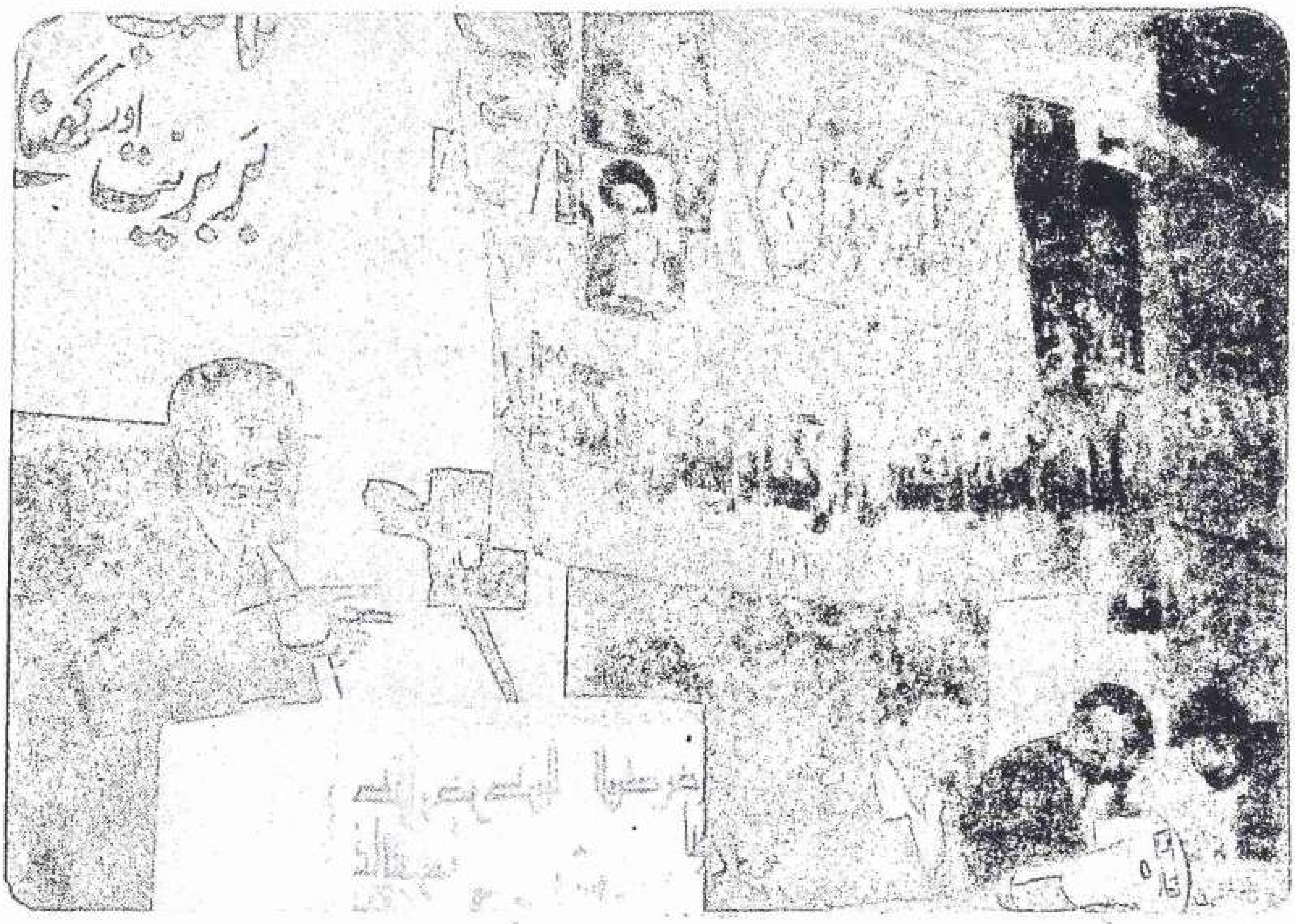

آئی-ایس-او کی محفلوں میں منفرد انداز کے ساتھ۔

نماز ادا کرنے اور چائے پینے کے بعد راہ خدا میں حرکت کرنے کے لئے آمادگی کا منظر

واقعہ پر دن بھر اداس رہے اور اپنے احباب کو ایسے لوگوں کا احساس دلواتے رہے۔

خدمت انسانی کا ایک واقعہ یوں بھی ملتا ہے کہ ایک شب آپ ''مصباح القرآن ٹرسٹ'' کے ہفتہ وار اجلاس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے دیکھا کہ ایک بڑھیا گندم کی بوری کے ساتھ کھڑی کسی مزدور کا انتظار کر رہی تھی۔ آپؒ اماں کے پاس گئے پریشانی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے ماجرا سنایا........ آپؒ نے اپنے ساتھ والے دوست کو آستین چڑھانے کا اشارہ کیا اور ان کا بازو پکڑ کر مزدوروں کی طرح بوری اٹھائی اور بڑھیا کے گھر (جو عمارت کی بالائی منزل پر تھا) کے کمرہ میں رکھ دی۔

سیرت ائمہ طاہرینؑ کی پیروی آپ کا شعار تھا۔ ایک مرتبہ ایک شیعہ مذہبی نوجوان نے کسی بات پر آپ سے لڑائی کی یہاں تک کہ اس نے آپ کے گریبان میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جو بہت سے دیکھنے والوں کو ناگوار گزری مگر آپؒ نے اپنے احباب کو اس پر ہاتھ ڈالنے سے روکا اور فرمایا کہ خدا اسے ہدایت کرے........ کچھ عرصہ بعد آپؒ کو اطلاع ملی کہ وہ نوجوان بستر علالت پر ہے۔ آپؒ خبر ملتے ہی سیدھا اس کے گھر گئے۔ اس کی عیادت کی اور ہر ممکنہ تعاون کا یقین دلایا......... کسی دوست نے آپ کے رویہ پر اعتراض کیا تو آپ نے فرمایا یہ نوجوان اگر میری ذات کا مخالف ہے تو کیا غم .... ''میرے خدا' رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہؑ کا مخالف تو نہیں ہے.........'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا معیار دوستی یا دشمنی خدا' رسولؐ اور ائمہؑ کی ذات تھی۔''

آپؒ نوجوانوں کی خداداد صلاحیتوں کے معترف تھے۔ باصلاحیت نوجوان سے مل کر آپ کو دلی مسرت ہوتی۔ آپ فرماتے کہ خدا کی بے مثال نعمتوں میں سے صلاحیت ایک بہت بڑی نعمت ہے جو شخص خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو قومؒ' ملک اور اسلام کی خدمت کے لئے بروئے کار لاتا ہے وہ عدل کرتا ہے اور عدل تو بہت بڑی نیکی ہے۔''

آپؒ ملازم پیشہ نوجوان سے اکثر کہا کرتے تھے کہ وہ چوبیس گھنٹوں میں آٹھ گھنٹے راہ خدا میں ضرور استعمال کریں۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ دو گھنٹے جلسے' جلوس' میٹنگ یا دروس میں صرف ہوں بلکہ ان دو گھنٹوں میں دین شناسی کے لئے مطالعہ کرلینا بھی وقت کا بہترین مصرف ہے۔

بعض اوقات بعض باصلاحیت نوجوانوں کے بارے میں فرماتے کہ "فلاں نوجوان ضائع ہو گیا" حالانکہ وہ بظاہر کسی نہ کسی نیک کام میں مصروف ہوتا تھا۔ آپ کا خیال ہوتا تھا کہ وہ شخص جتنی صلاحیتوں کا مالک ہے اور اس کی صلاحیتوں سے قوم کو جس قدر فائدہ پہنچ سکتا ہے نہیں پہنچ رہا۔ ایسے نوجوانوں سے بالمشافہ ملتے تو علامہ محمد اقبالؒ کی فکر کو اپنے لبوں پر لاتے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

یہ بات دعویٰ سے کہی جا سکتی ہے کہ جس شخص نے آپ کے ساتھ زندگی کے لمحات گزارے ہیں وہ شاہد ہے اس نے آپ کو ایک لحہ بھی وقت ضائع کرتے نہیں پایا۔ آپؒ یا تو قومی امور میں مسلسل متحرک رہتے یا فلاح کے لئے فکر مند.........؟

آپؒ سفر میں ہوتے یا گھر میں .... دفتر میں ہوتے یا گاڑی میں .... آپ کا ہر لحہ اسی تفکر میں گزرتا جس کے بارے میں فرمان معصومؑ ہے کہ "مجاہد کا تفکر بہت سارے علماء کی عبادت سے بہتر ہے"۔ اپنی ذات کے لئے سوچنا آپ کی زندگی کے آئین کے منافی تھا۔ اسلام کے لئے تحرک آپ کا دین اور ملک و قوم کی فلاح آپ کی شریعت تصور کی جاتی تھی۔

آپؒ کا معمول تھا کہ عموماً" چھٹی کا روز لاہور سے باہر تنظیمی پروگراموں میں صرف کرتے۔ راتیں بسوں میں بسر کرتے ' دن نوجوانوں کے درمیان گزارتے۔ نفس آپ کے تابع تھا۔ طویل سفر کے دوران میں آپ عادتاً" بس کی سیٹ یا ٹرین میں اپنی ٹانگیں سمیٹتے اور چند گھنٹوں میں نیند مکمل کر لیتے۔ پروگرام میں شرکت کرتے یا واپسی پر دفتر پہنچتے۔ آپ کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار ہوتے نہ آنکھوں میں نیند کا خمار ہوتا' چمکتی آنکھوں اور خوشگوار طبیعت کے ساتھ آپ مسلسل مصروف کار رہتے۔ جمائیاں یا انگڑائیاں لینا آپ کی تہذیب کے خلاف تھا۔ کئی کئی گھنٹوں کی مسافت اور کئی کئی گھنٹوں کی ریاضت آپ پر تھکاوٹ طاری نہ کرتی۔

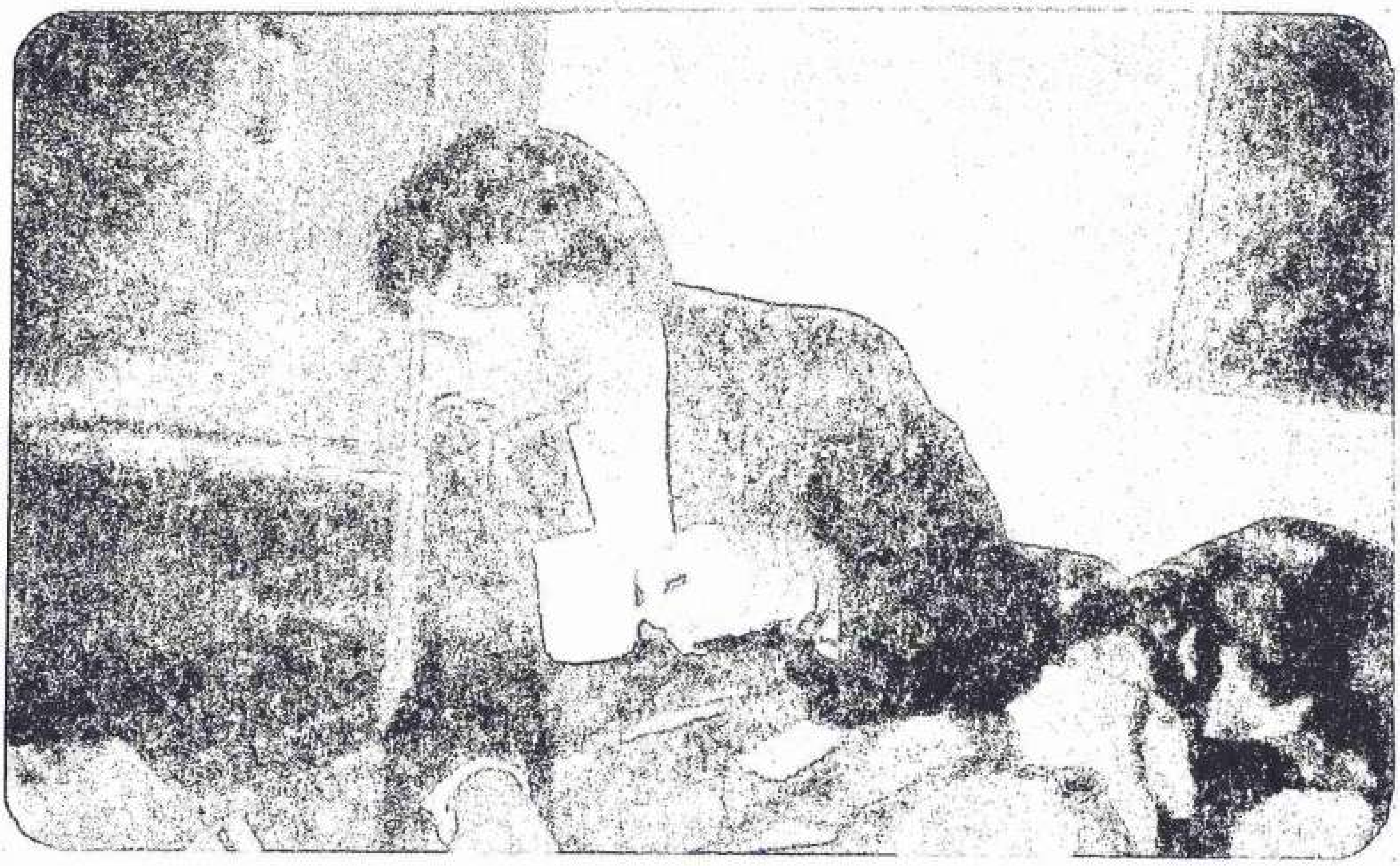

علی الصبح ملکی اخبارات کا مطالعہ کرتے ہوئے

بے پناہ تھکاوٹ کے بعد چند لمحوں کے لئے آرام کرتے ہوئے

آپؒ انسان تھے کبھی کبھار بہت زیادہ تھک جاتے تو سر کے نیچے بازو رکھ کر یا بسا اوقات اپنے پنجہ میں پنجہ ڈال کر دونوں ہاتھ سر کے نیچے ڈال دیتے اور تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لینے سے آپ کی تھکاوٹ دور ہو جاتی۔

طویل سفر میں آپ کے پاس سفری بستر ہوا کرتا تھا۔ جہاں موقع ملتا اور ضرورت ہوتی آپؒ کبھی ٹرین کے فرش پر اور کبھی پلیٹ فارم پر سکون سے سو جاتے۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ ڈاکٹر صاحب رات گئے تک تنظیمی اجلاس میں مصروف رہتے مگر صبح کی نماز ان سے قضا نہ ہو پاتی۔ یہ نوبت بہت کم ہی آئی کہ کسی دوسرے شخص کو کبھی تھکے ہارے ڈاکٹر محمد علی نقویؒ کو نماز کے لئے جگانا پڑا ہو۔

انسانی فطرت کے باعث آپؒ رات کو نیند کی آغوش میں سونے کے لئے گھر لوٹتے تو پاکستان بھر سے تنظیمی افراد فون پر آپ سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ چونکہ انہیں آپ کے شیڈول کا علم ہوتا تھا کہ آپؒ تقریباً" بارہ بجے گھر لوٹتے ہیں اس لئے وہ اہم امور کے بارے میں آپ سے بارہ بجے کے بعد رابطہ کرتے اور آپؒ کو بسا اوقات بار بار نیند سے بیدار ہونا پڑتا۔ احباب کے بقول بعض اوقات آپ کی یہ حالت بھی ہوتی تھی کہ آپ گفتگو تو کر رہے ہوتے مگر تازہ دم انسان کو پتہ چل جاتا تھا کہ آپ بے آرامی کے آخری مراحل میں ہیں۔ یہ آپ کی عظمت تھی کہ ان لمحات میں بھی آپ فون بند کرتے نہ گفتگو کرنے والے سے خلل کا شکوہ لب پر لاتے۔

آپؒ کے تحرک کو دیکھ کر اکثر احباب آرام کرنے کی گزارش کرتے تو آپ فرماتے کہ "آرام صرف ایک دن کے لئے موت کے روز ملے گا مگر دوسرے روز دفن کے بعد پھر سوال و جواب اور دیگر مرحلے شروع ہو جائیں گے" شاید آپ کا خیال تھا کہ اگر آپ سو گئے تو پھر جاگے گا کون ......؟۔

ممکن ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال انگڑائی لے کہ سفیر انقلاب اپنی مصروفیات کے ہوتے ہوئے اپنی گھریلو ذمہ داریاں کہاں تک پوری کرتے تھے .... اہل و عیال کو کتنا وقت دیتے تھے ....؟ بچوں کی پرورش اور تربیت کے لئے کیا کرتے تھے ....؟ تو جواب بڑا سادہ سا ہے کہ آپؒ نے اپنی اہلیہ سے اس طرح فکری ہم آہنگی پیدا کر لی تھی کہ جو تربیت سفیر انقلاب ملک بھر میں اپنے روحانی

بھائیوں اور بچوں کی کر رہے تھے وہی ذمہ داری آپ کی زوجہ محترمہ گھر کی چاردیواری کے اندر اپنے بچوں کی سرانجام دے رہی تھیں۔ اگرچہ آپ کے اہل عیال کو ذاتی سطح پر آپ سے زیادہ وقت نہ دینے کا شکوہ بدستور قائم تھا مگر اجتماعی و قومی مفادات کے لئے وہ آپ کی مصروفیات میں قطعاً" حائل نہ تھے۔

ایک مرتبہ آپ کی والدہ ماجدہ کی طبیعت خاصی ناساز تھی اور اسی روز فیصل آباد میں ایک اہم قومی معاملہ پر اجلاس منعقد ہو رہا تھا جس میں آپ کی شرکت انتہائی اہمیت کی حامل تھی۔ چنانچہ آپؒ نے اپنی والدہ سے اجازت طلب کی اور اجلاس کے لئے چلے گئے۔ آپ کے اس فیصلہ کی قریبی رشتہ داروں نے نفی کی مگر آپ نے فرمایا کہ میری والدہ کی حیات خداوند کریم کی رضا پر ہے میرا یہاں ہونا زندگی دلوا سکتا ہے اور نہ کسی حادثہ سے بچا سکتا ہے۔ جب کہ قومی حساس معاملہ میں میری شرکت سے اگر کوئی مثبت لائحہ عمل سامنے آگیا تو وہ قوم کی حیات میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے"

بعض اوقات آپؒ ہفتہ وار تعطیل اپنے گھر گزارتے بچوں اور قرابت داروں کو وقت دیتے مگر اس روز بھی تحریک جعفریہ یا آئی۔ ایس۔ او کے دفتر کا چکر لگاتے اور دفتر وغیرہ کی صفائی اور اس کی ترتیب و آرائش کے لئے خود مصروف ہوجاتے اور وہاں پر موجود تمام نوجوانوں سے بھی کام کرواتے۔

آپؒ کے بچوں اور رشتہ داروں کی خواہش ہوا کرتی تھی کہ آپؒ ان کے درمیان بیٹھیں اور وہ آپ سے مستفید ہوں۔ لہٰذا آپؒ دو ماہ میں عموماً" اور مخصوص مذہبی ایام میں خصوصاً" اپنے گھر کھانے کا انتظام کرتے جہاں کئی کئی گھنٹوں تک حالات حاضرہ سے انہیں آگاہ کرتے۔ اگر آپ کسی خصوصی پروگرام میں رشتہ داروں کے گھر تشریف لے جاتے تو وہاں وہ آپ کی تصاویر' آڈیو' ویڈیو فلمیں تک بناتے جو آج بھی ریکارڈ میں موجود ہیں۔

جب مجھے اہل خانہ سے آپ کی زندگی کے بارے میں تاثرات نوٹ کرنا پڑے تو آپؒ کے بڑے فرزند سید محمد سلمان نقوی نے کہا "ڈیڈی تو آپ لوگوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے تھے ہم تو بعض اوقات ان کی زیارت بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ جب

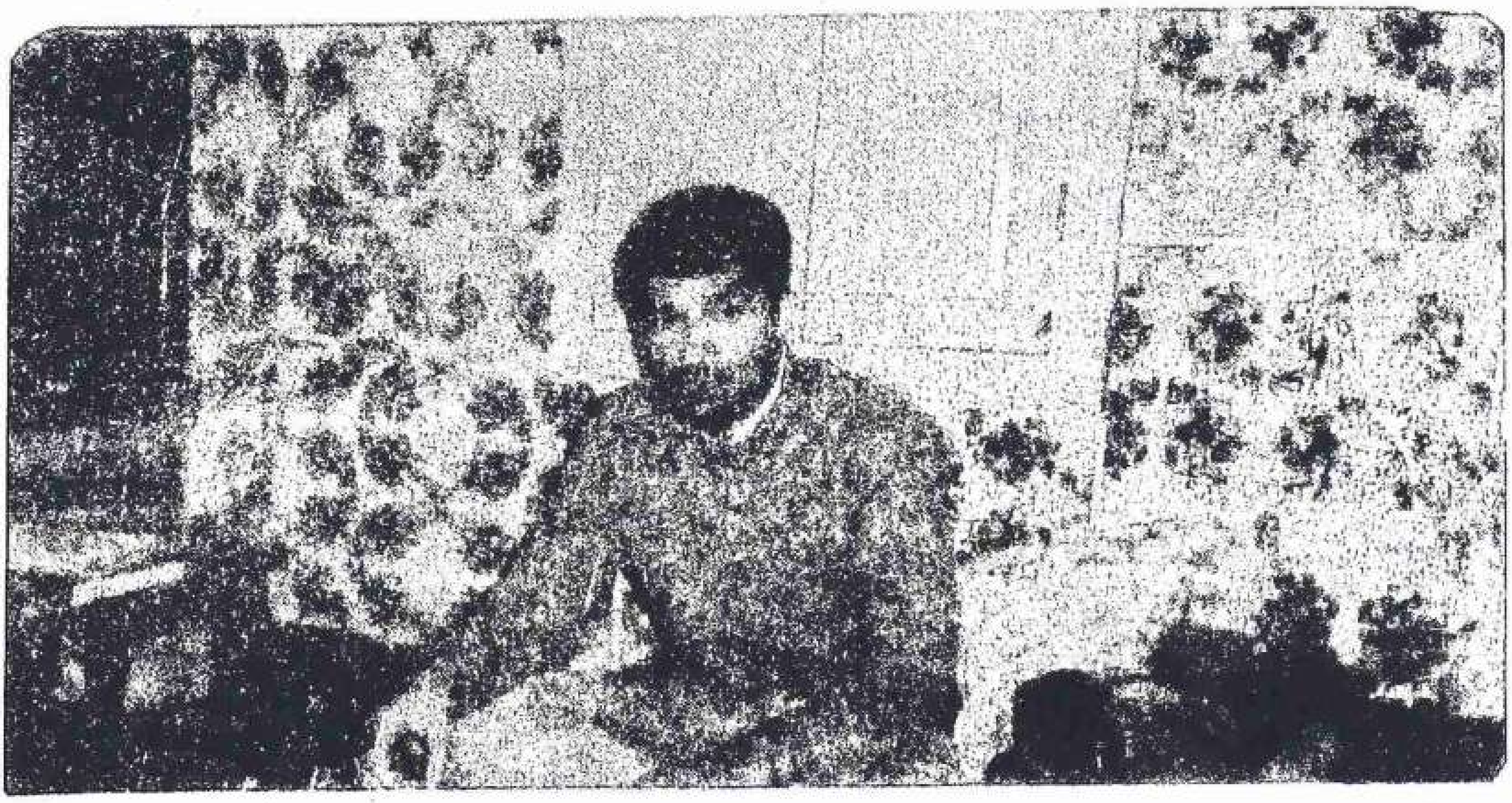

بچوں سے پیار کا ایک منظر

رات کو لوٹتے تو ہم سوئے ہوئے ہوتے تھے اور جب صبح سویرے گھر سے نکلتے تو تب ہم اسکول کی تیاری وغیرہ میں مصروف ہوتے تھے یا کبھی کبھار ہمارے بیدار ہونے سے پہلے بھی آپ گھر سے روانہ ہوجاتے تھے۔

آپؒ کی اہلیہ سے خواتین کے مختلف تعزیتی وفود کے سامنے دکھ کا اظہار فرمایا کہ ”وہ اس لیئے نہیں روتیں کہ ان کے گھر کا سربراہ انتقال کر گیا ہے بلکہ وہ اس لیئے روتی ہیں کہ قوم ایک عظیم مجاہد سے محروم ہوگئی ہے اور ہزاروں تنظیمی نوجوان یتیم ہو گئے ہیں۔

آپؒ کی صاحبزادی سیدہ زہرا جو اس وقت قم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں نے آئی ۔ ایس ۔ او شعبہ طالبات کے تعزیتی وفود اور تعزیتی اجلاس میں بار بار یہ جملے دہرائے کہ ”میں تمام دختران اسلام کو ایک عظیم مجاہد کا پرسا پیش کرتی ہوں، شہید نہ صرف میرے والد تھے بلکہ ایک دختر قوم کے حوالے سے وہ میرے عظیم رہنما بھی تھے اس لئے مجھے قوم کا سرمایہ لٹ جانے کا شدید دکھ ہے۔

سفیر انقلاب نے گھر کا ماحول اس قدر مذہبی بنایا کہ آپؒ کے گھر سے چھ سال کی بچی بھی ننگے سر نہیں نکلتی۔ نابالغ بچے باقاعدگی سے نمازیں ادا کرتے ہیں .... انہیں قرآن مجید کی تعلیم گھر پر دی جاتی ہے اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو فروع دین سے روشناس کرایا جاتا تھا

ایک مرتبہ آپؒ کے منجھلے صاحبزادے سید محمد دانش نقوی جن کی عمر اس وقت نو سال تھی نے ایک تنظیمی نوجوان سے نماز دیر سے پڑھنے کا شکوہ کیا تو اس نے کہا کہ مصروفیات کی وجہ سے بھول گیا تھا۔ جواب سنتے ہی دانش نقوی نے برجستہ کہا ”انکل آپ کھانا کھانا تو کبھی نہیں بھولتے“

ایک دفعہ آپؒ کے بڑے صاحبزادے سید محمد سلمان نقوی جو اس وقت آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے ہمارے گھر میں پڑھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ گھر میں کوئی معاملہ زیر بحث آیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا ”یہ جو مسئلہ آپ کو درپیش ہے اسلام اس کے بارے میں کیا کہتا ہے ....؟ میں یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ایک کم سن بچہ کو گھریلو معاملات میں اسلام کا کس قدر خیال ہے۔

یہ آپ کی گھریلو تربیت کا اثر تھا کہ آپؒ کی بڑی صاحبزادی اس وقت علوم دین کے حصول کی خاطر قم المقدسہ ایران میں زیر تعلیم ہیں اور وہ جب بھی پاکستان تشریف لاتی ہیں یہاں کی خواہران کو علوم دین سے مستفید کرتی ہیں۔ ان کے ذہن معیار اور افکار کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب کی شہادت کی خبر ایران پہنچی تو وہاں کے چند احباب نے آپ کی دختر کو یہ خبر براہ راست سنانے سے گریز کیا۔ جب بعض پاکستانی خواتین نے سیدہ زہرا کے سامنے یہ بات کی کہ لاہور میں آئی ۔ ایس ۔ او اور تحریک جعفریہ کے ایک سرکردہ رہنما شہید ہوگئے ہیں تو انہوں نے یہ سنتے ہی فرمایا "وہ میرے والد ہی ہو سکتے ہیں .... یہ درجہ انہیں ہی حاصل ہو سکتا ہے" جب ایک مرحلہ پر آپ کی دختر کو حوصلہ دینے کیلئے خواتین نے کہا کہ ان پر حملہ ہوا ہے مگر وہ زخمی حالت میں اسپتال میں ہیں تو یہ سن کر آپ کی دختر نے کہا "یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ شہادت کیلئے بے قرار میرے والد زخمی حالت میں بستر پر ہوں اور خدا سے ملاقات میں تاخیر کر رہے ہوں یقیناً" وہ موقع پر ہی شہید ہوئے ہوں گے"۔

یہ آپؒ کی تربیت اور خون کی تاثیر ہے آپ کی شہادت پر آپ کے عزیز و اقارب کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے مردہ باد امریکہ کے نعرے بلند کئے۔ آپؒ کے دفن کے تیسرے روز جب چند احباب آپ کے اہل خانہ سے ملنے گئے تو اس وقت یہ معصوم بچے بدستور امریکہ کے خلاف نعرہ بازی کر رہے تھے۔ جنہیں دیکھ کر احساس ہوا کہ واقعاً" ان کو ڈاکٹرؒ کا نعرہ یاد ہے۔ امریکہ مردہ باد ہے۔

یہ منظر دیکھ کر اقرار کرنا پڑا ہے۔

چھری کی دھار سے کٹتی نہیں چراغ کی لو
بدن کی موت سے کردار مر نہیں سکتا

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

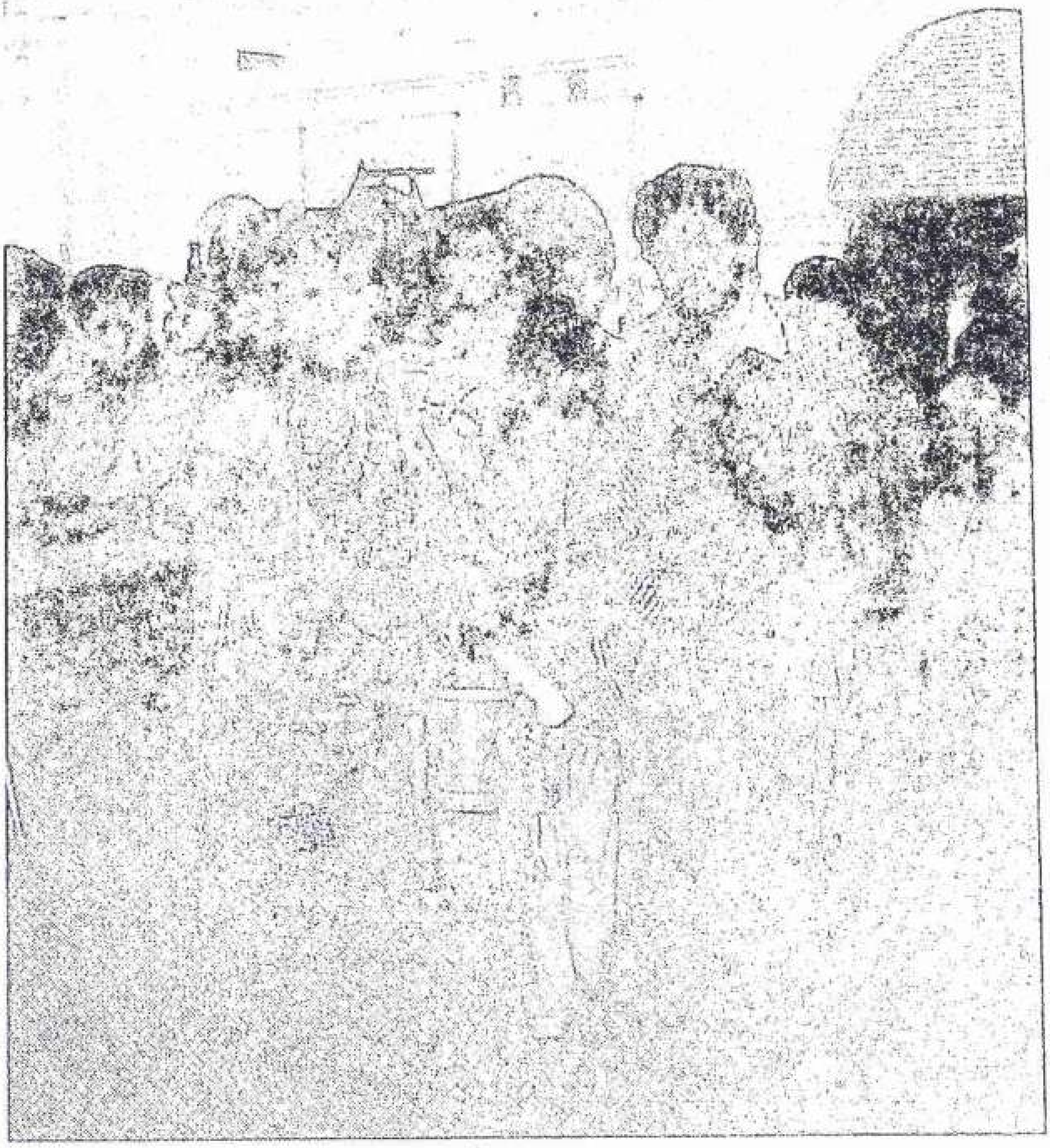

ایک ملنگ کے ساتھ خوشگوار موڈ میں

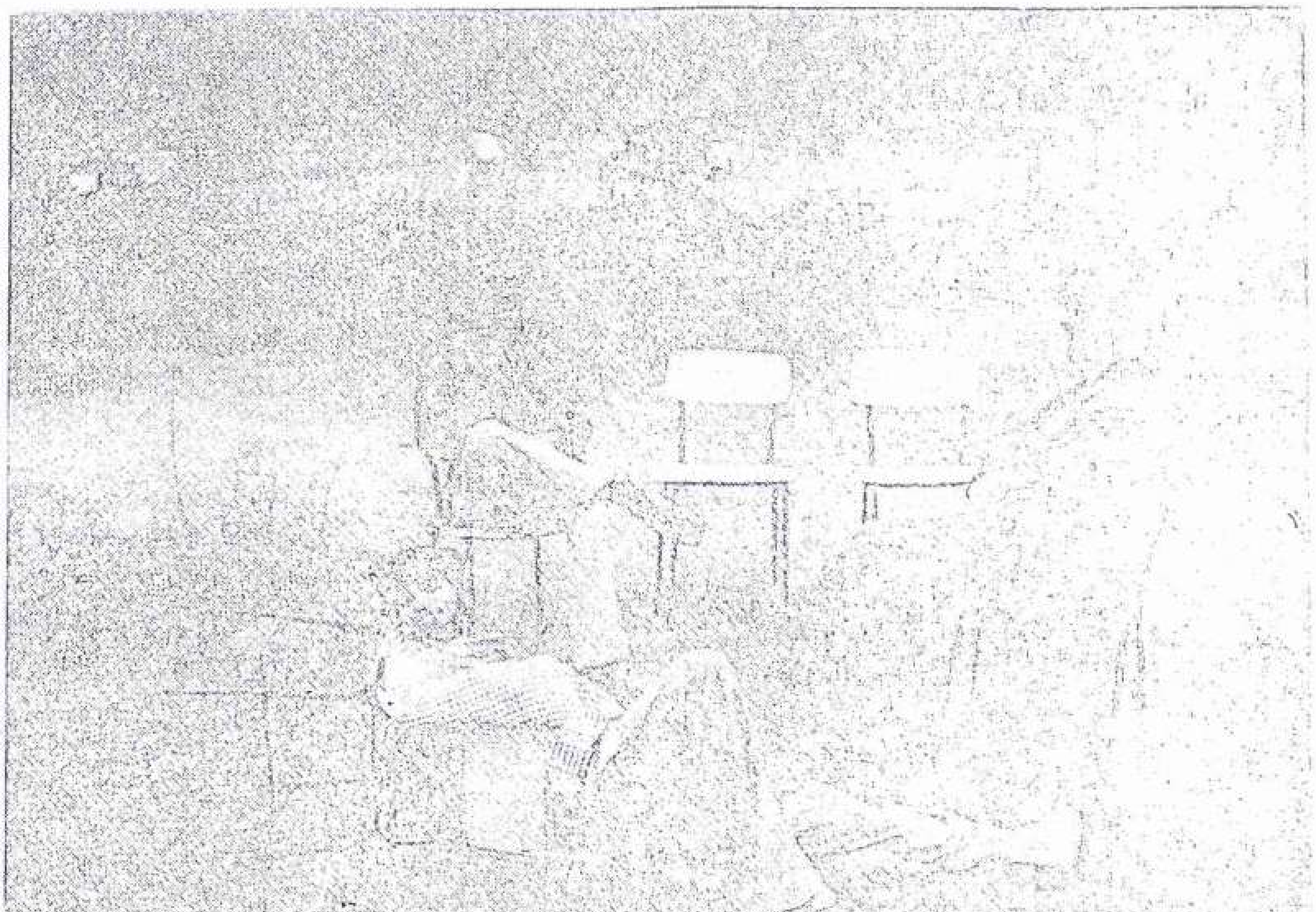

ہاسٹل کی کنٹین پر اپنے چچازاد بھائیوں کے ساتھ گردو پیش سے بے نیاز

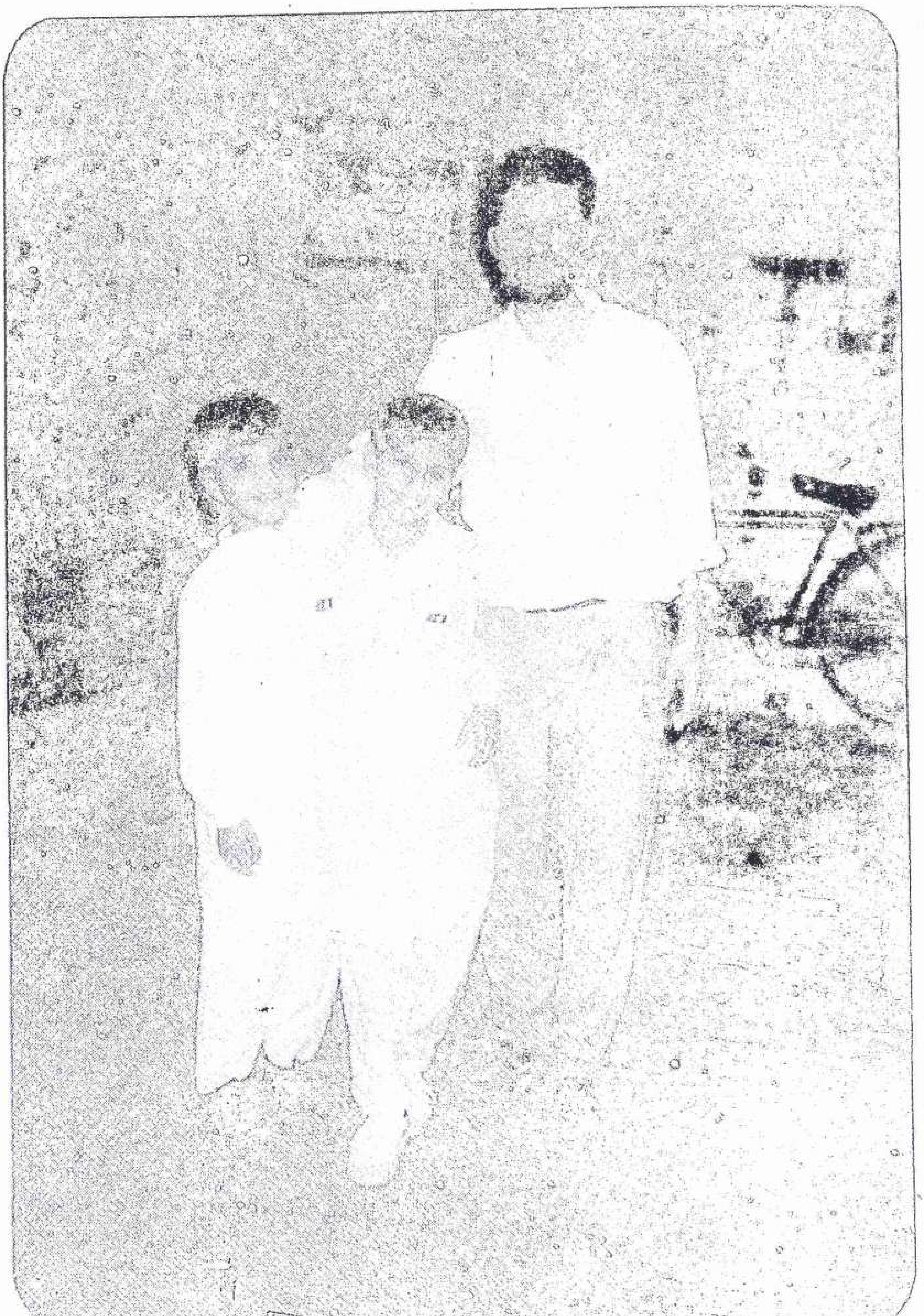

اپنے بیٹوں دانش اور سلمان کے ہمراہ

سفیر انقلاب کے آخری ایام زندگی

بزرگ کہتے ہیں کہ بچے کی پنگھوڑے میں حرکات و سکنات سے اس کے جو بن اور بڑے کی منفرد و عادات اور تاثرات دیکھ کر اس کی زندگی کے اختتام کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسی کہاوت کا احساس ہمارے بہت سے احباب کو سفیر انقلاب کی شہادت سے ڈیڑھ دو سال قبل ہو گیا تھا اور وہ اکثر اپنی محافل میں اس خدشہ کا اظہار بھی کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب جو ایران کے محاذوں پر رہے' سعودی عرب کے عقوبت خانوں میں ٹھہرے' پاکستان کی آمریت سے زور دار ٹکر لی اور امریکہ کے لئے درد سر بنے۔ انہوں نے مشکل سے مشکل حالات میں بھی کبھی اپنی زندگی کی تارکٹ جانے کا عندیہ نہ دیا مگر ملک میں پھیلی ہوئی فرقہ واریت منظّم دہشت گردی اور قتل و غارت کی فضا کے تیور دیکھ کر انہیں کئی معتمد ساتھیوں کے سامنے خطرات کا اظہار کرنا پڑا اور ان حالات میں آپؒ وصیت تحریر کرنے پر مجبور ہوگئے۔

دور آمریت میں آپؒ کے پیچھے خفیہ ایجنسیاں سائے کی طرح چلتی تھیں بعید نہیں تھا کہ آپؒ اس دور میں شہید کر دئے جاتے' حکومتوں کے تغیر و ترجیحات کے تنزل نے حالات کی کروٹیں بدلیں تو آپؒ کو اپنے ملک کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا مزید موقع میسر آیا۔ سننے میں آیا کہ آپؒ کا نام کئی اداروں کی ھٹ لسٹ "HIT LIST" میں آیا یہاں تک کہ بھارت نے جب کشمیر کے مسئلہ کو سبوتاژ کرنے اور پاکستانیوں کی توجہ ہٹانے کا سوچا تو پاکستان کے صوبہ پنجاب میں چند مذہبی رہنماؤں کے قتل کا منصوبہ تیار کیا جن میں ڈاکٹر محمد علی نقویؒ کا نام ہمیشہ سرفہرست رہا۔ اس سازش کا انکشاف فوج کے ہتھے چڑھنے والے ایک بھارتی ایجنٹ نے کیا تھا جس کے بعد اہم فوجی افسران نے اپنے ذرائع سے ان شخصیات کو خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔

جب بھی آپ کو ایسے خدشات سے آگاہ کیا جاتا تو آپ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ "ہماری ابھی اتنی اہمیت نہیں ہے۔" آپ پہلی بار ۱۲ فروری ۱۹۹۴ء کو دشمن کے ارادوں کی طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب ایک رجعت پسند مذہبی تنظیم نے آپ اور ایرانی قونصلیٹ جنرل کے خلاف اپنے دو کارکنان مولوی سمیع اللہ جھنگوی اور شاہین بٹ کے قتل کی ایف آئی آر تھانہ علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں درج کرائی۔ اگرچہ اس مقدمہ کے اندراج پر آپ سمیت آپ کے کئی اہم ساتھیوں کو تشویش لاحق ہوئی کہ آپ تو مسلمانوں کے درمیان نفاق کو بدقسمتی تصور کرتے ہیں۔ بھلا فرقہ پرست تنظیم کے کارکنان کے قتل میں آپ کس طرح ملوث ہوسکتے ہیں......؟ مگر ملت کے زیرک اور دور اندیش افراد اس روز سے جان گئے کہ نظریہ اور دلائل سے خالی دشمن جو مذہب حقہ کے پیروکاروں کو منصوبہ بندی کیساتھ قتل کر رہا ہے وہ آپ کی زندگی کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس لئے وہ آپ کو بھی راستہ سے ہٹانا چاہتا ہے۔

مؤقر ذرائع کا کہنا ہے کہ آپ کو قتل کے مقدمہ میں ملوث کرنے اور دشمن کو آپ کی ذات کی طرف متوجہ کرنے میں ملک کی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ تھا جو ایک عرصہ سے یہ سمجھتی تھیں کہ تحریک جعفریہ اور آئی۔ ایس۔ او پاکستان کی فعالیت کے پیچھے ڈاکٹر محمد علی نقوی کا ذہن کار فرما ہے۔

اگر غور کیا جائے تو حقیقت بھی یہی تھی کہ ڈاکٹر صاحب ملت جعفریہ کا ذہن تصور کئے جاتے تھے اور آپ سے ملکی و غیر ملکی ایجنسیاں خائف رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے گھر اور کلینک کے فون نمبر پر عموماً "OBSERVATION" لگی ہوتی تھی جس سے سرکاری خفیہ ادارے آپ کی نقل و حرکت اور گفتگو سے آگاہی رکھتے تھے۔ یہ معمہ اس وقت کھلا جب آئی۔ ایس۔ او کے سابق مرکزی صدر برادر سید تصور نقوی کے مقدمہ کے سلسلے میں آپ "سی۔ آئی۔ اے" کے ہیڈ کوارٹر گئے جہاں ایک سینئر پولیس افسر نے آپ کو اشارتاً کہا "ڈاکٹر صاحب آپ نے گذشتہ رات سرگودھا میں جس شخص کو رات فون پر ہدایات دی تھیں۔ وہ ہمارے ریکارڈ میں ہیں۔

خفیہ اداروں یا ایجنسیوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ معاشرہ کے افراد کو

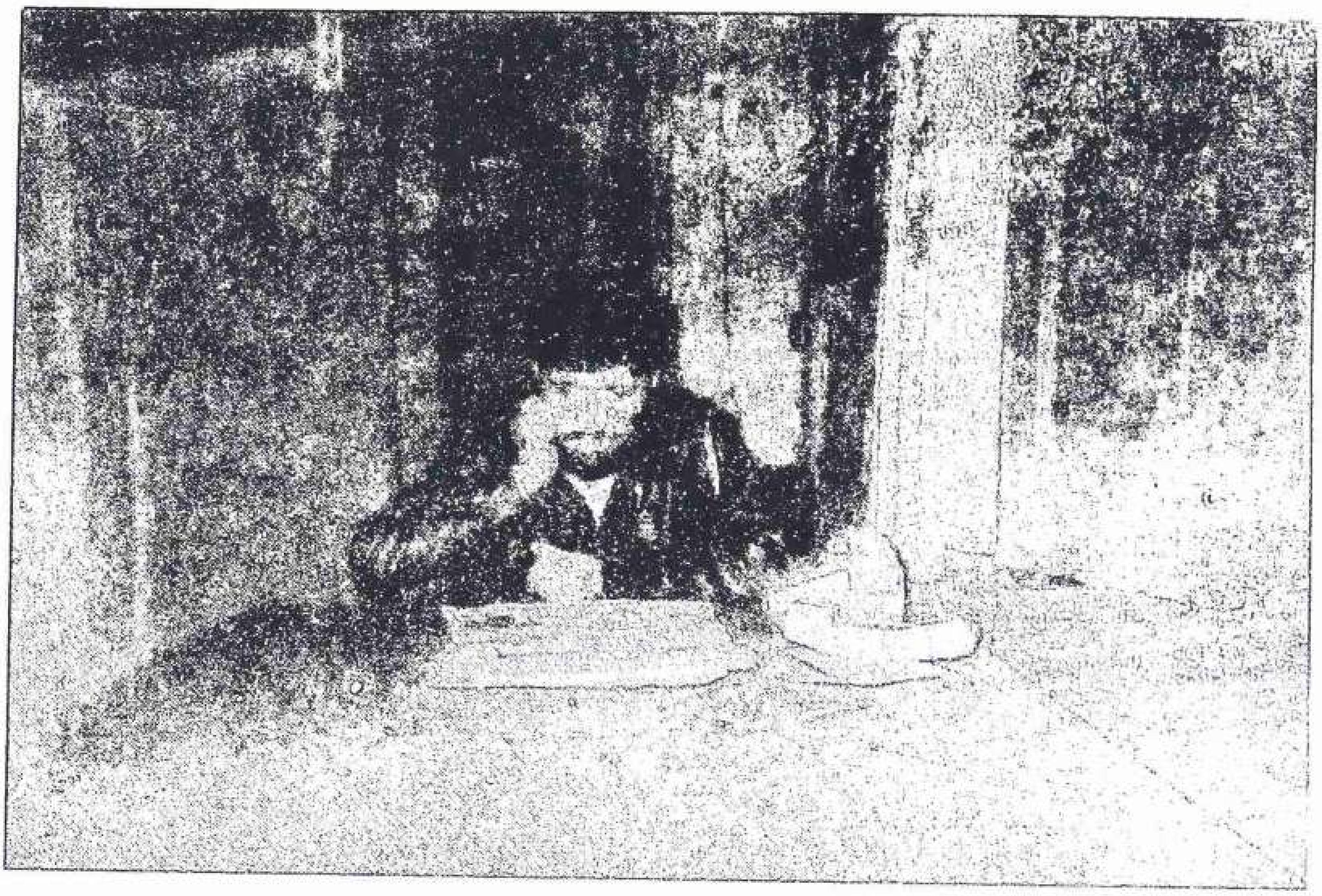

مومن کی یہ پہچان کہ آفاق اس میں ہے گم

استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہیں۔ ان کے مقاصد کسی فرد واحد سے بھی حاصل ہوسکتے ہیں اور کسی گروہ یا تنظیم سے بھی۔ البتہ ایک عام شہری ان ہتھکنڈوں سے بے خبر رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا المیہ رہا ہے کہ یہاں ۱۹۷۵ء سے ایجنسیوں نے مداخلت شروع کی جس کے نتیجہ میں کئی رہنما قتل اور کئی حکومتیں معزول ہوئیں۔

ہمیں تو یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ پاکستان کی ایک کٹر مذہبی تنظیم کے ایک مرکزی رہنما کو ایجنسیوں نے یہ ہدایت دی کہ وہ پاکستان میں "حضرت امام مہدی علیہ السلام" کے خلاف گستاخانہ زبان دراز کرے۔ سازش یہ تھی کہ ان کے اس گستاخانہ فعل سے ملک بھر میں اشتعال پھیلے گا اور ایران مذہبی بنیادوں پر اسے فرط جذبات میں واجب القتل قرار دے گا۔ جس کے بعد پاکستان کے مسلمان ایران کے خلاف سیخ پا ہو جائیں گے۔ اس سے ایک طرف رشدی کے خلاف دیئے گئے فتویٰ کی اہمیت ختم ہو جائیگی اور دوم ایران ایک فرقہ وارانہ ملک کی حیثیت سے منظر عام پر آئیگا۔ (یاد رہے کہ اس سازش کا انکشاف اس تنظیم سے منحرف ہونے والے ایک صوبائی صدر نے ملکی اخبارات میں برملا کیا تھا)۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں ایک سنگین مقدمہ میں ملوث کیا گیا اور پولیس کی بھاری نفری انہیں کلینک سے تھانہ علامہ اقبال ٹاؤن میں لے آئی جہاں چند گھنٹوں کیلئے آپ کو یہاں ٹھہرایا گیا۔

چند گھنٹوں کے بعد آپ تھانہ سے تو اٹھ آئے مگر اس کے بعد آپ کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ آپ کا دشمن آپ کے تعاقب میں ہے۔ اس سانحہ کے بعد آپ کے قریبی رفقاء نے آپ کو تنہا گھومنے پھرنے سے منع کیا اور ساتھ ہی چند معتمد رفقاء نے خود کو آپ کی حفاظت کیلئے وقف کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب انتہائی مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے تاثرات یا گفتار سے کبھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ ان کی زندگی کو لاحق خطرات نے سر اٹھا لئے ہیں مگر آپ کی رفاقت میں کام کرنے والوں نے محسوس کیا کہ آپ نے قومی کاموں کو بہت جلد انجام تک پہنچانے اور کچھ مزید کر گزرنے کیلئے بھرپور دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ بکھرے ہوئے امور سمیٹنے اور رواں معاملات کو احسن طریقہ سے چلانے کیلئے آپ

نے افراد سازی کو آخری شکل دی۔ اس دوران میں آپ نے اپنے تربیت یافتہ نوجوانوں کو کئی ملی امور کی مسئولیت سونپی یہاں تک کہ اپنے کلینک کیلئے تنظیمی ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کیں۔

آپ قومی فلاح کیلئے پھیلائے گئے منصوبوں کے بارے میں اظہار فرماتے ہوئے بعض شعبہ جات پر اطمینان ظاہر کرتے کہ وہ باحسن طریقہ سے جاری رہیں گے اور بعض پر مکمل اطمینان نہ فرماتے اور ان کے بارے میں فکر مند بھی رہتے کہ فی الحال انہیں چلانے کیلئے مناسب افراد میسر نہیں آرہے۔

ڈاکٹر صاحب سب سے زیادہ پریشان اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں تھے اور اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے بچوں کی تعلیم میں انصاف نہیں کرسکا۔ آپ کے دونوں بیٹے سید سلمان نقوی اور سید دانش نقوی پہلے لاہور کے معروف "انگلش میڈیم اسکول" میں زیر تعلیم تھے مگر قومی فلاح کیلئے قائم ہونے والے ادارہ "المصطفیٰ ماڈل ہائی اسکول" کے اجراء کے بعد آپ نے اپنے دونوں بچے اس سکول میں داخل کرا دیئے۔ چونکہ یہ اسکول بہت زیادہ معیاری نہ تھا۔ اس لئے اس سکول کے ٹرسٹی حضرات اپنے بچوں کو یہاں داخل کرنے سے گریز کرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "اگر یہ اسکول ہمارے بچوں کی تعلیم کیلئے مناسب نہیں تو پھر قوم کے بچوں کیلئے کس قدر مناسب ہے جب ہمارے بچے یہاں داخل ہوں گے تو ہم خود اس کے معیار کی بلندی کا درد محسوس کریں گے اور قوم کو دعوت دیتے وقت اپنے پیغام میں سچائی کا ثبوت دے سکیں گے"۔

یہ امر ڈاکٹر صاحب کی نظریہ سے وابستگی اور قول و فعل کی ہم آہنگی کا ثبوت تھا کہ آپ نے اپنے بچوں کو یہاں سے ایک لحہ نکالنے کی کوشش تک نہ کی۔

آپ کے خاندان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ملک کی کلیدی آسامیوں پر کام کرنے والے چنداں افراد کا تعلق آپ کے خاندان یا آپ کے مکتب سے ہے۔ مگر آپ نے کبھی بھی اپنے بچوں کیلئے سفارش نہ کرائی۔ ایک مرتبہ کیڈٹ اسکولز کے داخلے ہونے لگے تو آپ نے اپنے بڑے بیٹے کو مقابلہ کے امتحان میں شریک کیا۔ بعض افراد نے یہ مشورہ دیا کہ آپ فوجی افسروں سے سفارش کرالیں

(جو کہ آپ کیلئے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا) مگر آپ نے فرمایا "یہ ناانصافی ممکن نہیں ہے۔" آپ سمجھتے تھے کہ اگر آپ کا بچہ معیار پر پورا نہ اترا اور اسے داخلہ دلوا دیا گیا تو یہ اس کے ساتھ بھی ناانصافی ہے اور دوسرا اس لائق اور مستحق بچے کے ساتھ بھی جسے معیار سے گرا کر اس کی جگہ آپ کے بچے کو رکھا جائیگا۔

آپ ذہن کی لوح پر حضرت علی علیہ السلام کا یہ فرمان "جس معاشرہ میں عدل طاقتور کا سہارا بن جائے وہ تباہ ہو جاتا ہے" نقش تھا۔ آپ فرماتے تھے کہ ناانصافیاں ظلم کو جنم دیتی ہیں۔ تاریخ اسلام میں جتنے بھی ظلم ہوئے ہیں ان کی اساس ناانصافی ہی تھی۔"

آپ اپنی تنظیمی عزیزان سے بھی ایک شفیق بزرگ کی طرح سلوک کرتے۔ ستمبر ۱۹۹۴ء میں جب میں نے شیخ زید اسپتال کی نوکری سے استعفا دیا اور مزید تعلیم کے حصول کیلئے لاہور کے ایک پرائیویٹ ادارہ میں داخلہ لینے کیلئے مقابلہ کے امتحان کی تیاری میں مصروف ہوا تو آپ نے جمعہ کے روز مجھے اپنے گھر یاد فرمایا۔ میں عین وقت پر پہنچا تو آپ کہیں جا رہے تھے۔ مجھے گاڑی میں بٹھایا اور دو تین گھنٹوں کے سفر میں مسلسل دو اہم تنظیمی برادران اور میرے مستقبل پر گفتگو فرمائی۔ آپ نے پر درد پند و نصاح کیں۔ کبھی آپ مجھ سے ایک بڑے بھائی کے لہجے میں بولے اور کبھی والد کے درد میں گویا ہوئے۔ میں نے اس روز محسوس کیا کہ یہ عظیم انسان ہمارے لئے کس قدر جذبات رکھتا ہے اور اس کی نظر اپنے کن کن عزیزوں پر ہے۔ پھر جب میری ملازمت ہوئی تو آپ نے پہلے روز ہی مجھے فون کیا۔ کلینک پر یاد فرمایا۔ مجھے دیکھتے ہی کرسی سے اٹھے بہت پیار بھرے جذبات میں سینے سے لگایا اور کہنے لگے۔ آپ نے میری ایک بڑی مایوسی کو ختم کر دیا ہے۔ اس روز کی ملاقات اور گفتگو میں مجھے یہ بات کھٹکنے لگی کہ ڈاکٹر صاحب تو ہمارے بارے میں اس قدر مایوس ہیں جیسے بستر مرگ پر پڑا ہوا ایک گھر کا سربراہ اپنی نظروں کے سامنے گھر کے ہر فرد کو آسودگی بخشنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ یہ آپ کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ آپ کی شہادت پر بہت سے احباب نے اس مفہوم کا تاثراتی جملہ رجسٹر میں درج کیا کہ "اگر یتیمی صرف والد کے انتقال پر موقوف نہیں تو پھر ہم یتیم ہوگئے"۔

زندگی کے آخری سال میں آپ کا معمول بن گیا تھا کہ آپ تنظیمی محافل میں درس نہ دیتے تھے بلکہ درس سننے پر اکتفا کرتے۔ اگر کوئی سینئر ساتھی جامع درس دیتا تو آپ اس کی حوصلہ افزائی فرماتے اور انہیں دوسرے حلقوں میں درس دینے کیلئے بھیجتے۔ اس طرح سے آپ خود وہ خلا پورے کرنے کی کوشش کرتے رہے جو آپ کی زندگی کے بعد متوقع تھے۔

آخری ایام میں واضح طور پر محسوس کیا گیا کہ آپ اپنے عقائد کے پرچار میں مضطرب اور انتہائی کوشاں تھے۔ ۱۶ فروری ۱۹۹۵ء (۱۵ رمضان المبارک) کی ایک افطار پارٹی پر آپ سے ملاقات ہوئی تو میں نے ملت جعفریہ کی تاریخ پر مبنی ایک کتاب لکھنے کا عندیہ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نہ صرف اس سے اتفاق کریں گے بلکہ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ مگر آپ نے میرے خیال کو یکسر مسترد کر دیا۔ فرمانے لگے "کیا مذہب حقہ کے عقائد اور حقیقت پر کتاب نہیں لکھی جاسکتی......؟" میں نے عرض کی یہ بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ اس پر علماء کرام کی خدمات حاصل کی جائیں......؟ فرمایا بات تو درست ہے مگر اس سے پہلے عقائد پر جتنی کتب مارکیٹ میں دستیاب ہیں یا تو ان پر مناظرانہ رنگ کا غلبہ ہے یا پھر وہ اس قدر جانبدارانہ لگتی ہیں کہ عام مسلم قاری متاثر نہیں ہوتا۔

آپ نے فرمایا کہ اس وقت جتنی ضرورت اپنے عقائد اور مسلک کی حقیقت کے آشکار کرنے کی ہے۔ شاید کبھی ہوا کرتی تھی۔ ہمیں اس بات کا دکھ نہیں کہ دشمن ہمارے افراد قتل کر رہا ہے۔ ہمیں اس امر کی شدید تکلیف ہے کہ وہ عام مسلمان اور بالخصوص آنے والی نسلوں کو ہمارے مسلک کا نہایت غلیظ اور غلط تعارف کرا رہا ہے۔ ہمارے مذہبی مخالف گروہ اپنے لٹریچر میں ہمارے خلاف ایسا زہر اگل رہے ہیں جو غیر محسوس انداز میں اپنے تاثرات مرتب کر رہا ہے۔ اس مہم میں "اہلحدیث گروہ" بہت آگے جا رہا ہے۔

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اتحاد بین المسلمین کی جدوجہد اور اپنی دفاعی کوششوں کے ساتھ ساتھ اپنے عقائد کے پرچار پر زور دیا جائے۔ اگر ہم صحیح معنوں میں یعنی دیانتداری سے مذہب محمدؐ و آل محمدؐ کا تعارف کرانے میں کامیاب ہوگئے تو پھر

کوئی وجہ ہی نہیں کہ محمدؐ کا پیروکار آل محمدؐ کا راستہ اختیار نہ کرے اور اس کے مقابل لائے جانے والے نظریات کو مسترد نہ کرے۔

آپ کی زندگی خطرات میں تو گھری ہوئی ہی تھی مگر ۱۹۹۳ء سے ان خطرات میں شدت آتی گئی۔ یہاں تک کہ مخالف مذہبی تنظیم کی مساجد اور رسائل میں آپ پر منافرانہ تنقید شروع ہوگئی۔ موقر ذرائع کا کہنا ہے کہ لاہور کے چند مراکز نے اپنے مرکز جھنگ کو جن شیعہ رہنماؤں کی زندگی کا مقابلہ نہ کرسکنے کی رپورٹ دی ان میں آپ کا نام سرفہرست تھا۔ جھنگ کی رپورٹ کیمطابق وارڈ نمبر۵ کی ایک مسجد میں آپ کا نام لیکر للکارا گیا۔ دشمن کا خیال تھا کہ ملت جعفریہ کے جسم میں جس شخص کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے وہ ڈاکٹر محمد علی نقوی ہے

ایک مرتبہ آپ کے کلینک پر ایک شخص بخار کی حالت میں آیا یہ شخص ایک سرکاری ادارے کا ڈرائیور تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت کلینک پر موجود نہ تھے۔ وہ شخص جانے لگا تو آپ کے محافظ رفقاء کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا "تمہیں نجف کے والی کا واسطہ ہے ڈاکٹر صاحب کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیں ورنہ یہ سرمایہ بھی گنوا بیٹھو گے۔"

دشمن نے جب اپنی چشم بد فرزند اسلام پر مرکوز کی تو آل رسول کے پروانے آپ کے گرد طواف کرنے لگے۔ آپ کو تنہا سفر کرنے' بے دھڑک گھومنے پھرنے سے روک دیا گیا۔ مگر آپ تھے کہ ہر بار کہتے "زندگی میں موت جیسی پابندیاں میرے گرد جمع نہ کریں۔ موت کا ایک روز مقرر ہے۔ جب وہ وقت آپہنچے گا۔ تدبیریں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔"

آپ کو تحریک جعفریہ کی جانب سے محافظ فراہم کیۓ گئے مگر آپ نے بصد شکریہ واپس لوٹا دیئے۔ کلاشنکوف بردار یا مسلح نوجوانوں کا آپ کے اردگرد چلنا آپ کو بے حد ناگوار تھا۔ آپ کا نظریہ تھا کہ موت جس نے ہر حالت میں آنا ہے سے بچنے کیلئے اگر کوئی شخص ایسے اقدامات کرتا ہے جو اس کے نفس کو تکبر کی وادی میں دھکیل دیتے ہیں تو یہ اس کیلئے جیتے جی موت ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے گرد ایک لمحہ کیلئے بھی کوئی نوجوان اسلحہ لیکر نہ گھوما بلکہ آپ نے یہاں تک بھی گریز کیا کہ آپ کو

گاڑی چلانے یا اگلی نشست پر بیٹھنے سے روکا گیا مگر آپ نے فرمایا کہ "عام طور پر پچھلی نشست پر بیٹھنا بڑے بڑے لوگوں کا شیوہ ہے جو مجھ سے ممکن نہیں میں عام سا کارکن ہوں مجھے کارکن ہی رہنے دیا جائے"

آخری ایام میں آپ کی گاڑی کا کئی بار تعاقب کیا گیا مگر کبھی حملہ کی نوبت نہ آئی۔ شیخ زید اسپتال میں اکثر پولیس کا ایک سپاہی آپ کو بلانے آیا کرتا تھا اور آپ خاموشی سے اس کیساتھ چلے جاتے۔ ایک روز میں نے ماجرا پوچھا تو آپ نے فرمایا "کچھ پولیس افسران ممکنہ خطرات سے آگاہ کرتے ہیں۔" ایک موقعہ ایسا بھی آیا جب ایک مریض کیساتھ کچھ مشکوک لوگ اسپتال آئے اور وہ آپ کی گاڑی کا تعاقب کرنے لگے۔ ان حالات میں اسپتال کے چیئرمین نے آپ کو ایک ماہ کی چھٹی لینے کا مشورہ دیا۔ آپ کی چھٹی منظور بھی ہوئی مگر نامعلوم وجوہات کی بناء پر آپ نے پھر سے حاضر ہونا شروع کر دیا۔

قریبی رفقاء نے آپ کو ملازمت چھوڑ دینے اور کچھ عرصہ کیلئے لاہور ترک کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ بعض روایات میں ملتا ہے کہ تحریک جعفریہ کے مرکز کو آپ کی خدمات حاصل کرنے کیلئے کہا گیا تاکہ آپ نسبتاً محفوظ رہیں مگر تاحال علم نہیں ہوسکا کہ آخر ایسا کیوں نہ ہوا......؟

کراچی سے آپ کے ایک معتمد ساتھی لاہور آئے تو انہوں نے یہاں سے تنظیمی حلقوں کو متنبہ کیا "لاہور والو!...... اس عظیم شخص کے قدر شناس بنو۔ انہیں چھ سات ہزار روپے کی نوکری کیلئے سڑکوں پر آزاد نہ چھوڑو...... انہیں زیر زمین لے جاؤ اور ان کے ذہن سے دیر تک ملت کو فائدے پہنچاؤ...... اگر خدانخواستہ یہ عظیم انسان مارا گیا تو پھر نسلوں تک کف افسوس ملتے پھرو گے......"

بعض افراد نے ڈاکٹر صاحب کو ملک چھوڑ دینے کا مشورہ بھی دیا جسے آپ سن کر مسکرا دیئے اور فرمایا کہ کتنی باعث شرم بات ہے کہ میں عارضی زندگی کے تحفظ کیلئے راہ فرار اختیار کروں۔ خدا کے عظیم انعام "شہادت" کا منکر بنوں اور دشمن کو ہنسنے کا موقع دوں کہ میں اس کے خوف سے ملک چھوڑ گیا ہوں۔"

آپ شہادت کے حصول کیلئے ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ زندگی

کہ آخری ایام میں اپنے چند معتمد رفقاء کی محفل میں فرمایا ۴۳ برس بیت گئے مگر ابھی تک شہادت نصیب نہیں ہوئی' لگتا ہے کہ میرا کوئی عمل خدا کو پسند نہیں آیا"۔ اسی طرح آپ شہادت سے پندرہ روز قبل ایک رفیق کے سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ "میں نہیں چاہتا کہ ضعیفی میں کھانس کھانس کر مروں خدا میری موت کو میری متحرک زندگی سے متصل کر دے"۔

ایک رات ڈاکٹر صاحب لاہور میں قومی امور پر مبنی ایک اجلاس میں بیٹھے تھے کہ اچانک دو مسلح نوجوان کمرے کے اندر داخل ہوئے اور انہوں نے ایک تنظیم کے دفتر کے بارے میں استفسار کیا۔ بعض لوگوں نے انہیں پکڑنا چاہا مگر ڈاکٹر صاحب نے ایسا کرنے سے انہیں روک دیا۔ اجلاس کے اختتام پر آپ حسب معمول اپنے ایک دو ساتھیوں کیساتھ پرسکون روانہ ہوئے جبکہ دفتر میں موجود لوگ آپ کے گھر پہنچنے تک پریشان رہے۔

آپ کی شہادت سے چھ ماہ قبل تحریک جعفریہ کے ذرائع کو یہ رپورٹ مل گئی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے قتل کی سازش کو حتمی شکل دی جاچکی ہے اور ان پر یہ قاتلانہ حملہ "یتیم خانہ یا سکیم موڑ" پر کیا جائیگا۔ یہ مفصل رپورٹ تحریک جعفریہ کے مرکز تک بھی پہنچا دی گئی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی ممکنہ خدشہ سے آگاہ کر دیا گیا۔

سفیر انقلاب یہ سب کچھ جاننے کے باوجود نہایت مطمئن رہتے تھے۔ ان کے چہرے کی تازگی پر ایک پل مرجھاہٹ کا احساس ہوا نہ ان کے لبوں کے فاتحانہ تبسم میں کبھی کمی آئی۔ موت ایک ایسا لفظ ہے جو زندہ شخص کو ایک لمحہ کیلئے اداس کر دیتا ہے۔ مگر جو لوگ شعور کی موت مرتے ہیں انہیں ابدی زندگی کا ادراک ہوتا ہے وہ سنت علی اکبر پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یوم عاشور جب حضرت علی اکبر علیہ السلام نے اپنے والد گرامی حضرت امام حسین علیہ السلام سے پوچھا تھا۔ اے بابا "کیا ہم حق پر ہیں......؟" لاریب کا جواب ملا تو آپ نے فرمایا "جب ہم حق پر ہیں تو پھر ہمیں پروا نہیں کہ موت ہم پر آپڑے یا ہم موت پر جا پڑیں۔"

قرآن مجید میں ارشاد رب العزت ہے کہ "موت کی تمنا رکھو تاکہ تمہارا شمار صادقین میں سے ہو" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ موت سے محبت رکھتے ہیں

وہی سچے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کے فرمان کی تفسیر حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "ہم موت سے اس قدر مانوس ہیں جس قدر بچہ اپنے ماں کے پستانوں سے مانوس ہوتا ہے۔"

موت کے چار سو پھیلے ہوئے بادلوں کے نیچے ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ کا مفہوم بہت کم لوگوں پر واضح تھا۔ ذاتی طور پر مجھے آپ کی شہادت کے بعد ایک انٹرویو پر مبنی ویڈیو کیسٹ دیکھنے اور سننے کا موقع ملا جس میں آپ حضرت امام خمینی اور حضرت سید عارف حسین الحسینی کی ذات مقدسات پر بحث کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ "یہ لوگ اس محفل کے لوگ نہیں تھے یہ مسافر تھے چونکہ ان کا راستہ ہماری دنیا سے گزرتا تھا لہٰذا یہ ہماری نظروں کے سامنے سے گزرے ہیں۔ یہ لوگ امام زمانہ علیہ السلام کی محفل کے مہمان تھے اور بہت جلد وہیں چلے گئے ہیں۔" چونکہ ڈاکٹر صاحب علامہ سید عارف حسین الحسینی کے بے حد محبوب رفیق تھے اس لئے آپ بھی امام زمانہؑ کی محفل میں جانے کیلئے بے قرار تھے۔ یہ روحانی عقیدت کا اعجاز ہے کہ شہید حسینی اور شہید ڈاکٹر نقوی دونوں ہم عمر شہید ہیں۔

سفیر انقلاب لبنان کے شہید عباس موسوی سے بے حد مانوس تھے اور شہید موسوی بھی ڈاکٹر صاحب سے قلبی لگاؤ رکھتے تھے۔ تحریک جعفریہ کی جانب سے اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کشمیر کانفرنس کے موقعے پر شہید عباس موسوی پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو خصوصی وقت دیا اور یہ دونوں عاشقان امام بہت دیر تک بین الاقوامی صورتحال پر بحث کرتے رہے۔ شہید موسوی جب لبنان روانہ ہونے لگے تو انہوں نے فرط جذبات سے ڈاکٹر صاحب کی پیشانی کا دوبار بوسہ لیا اور محفل امام زمانہ علیہ السلام میں دوبارہ ملاقات کرنے کا وعدہ فرمایا۔

۱۶ فروری ۱۹۹۲ء کو جب سفیر انقلاب کو شہید قدس سید عباس موسوی کی شہادت کی خبر موصول ہوئی تو آپ نے فرمایا "عبد خدا بازی لے گیا ہے"۔ ایک اور موقعے پر شہید عباس موسوی کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "وہ شہادت کے معیار پر اس قدر پورے اترے کہ انہوں نے اپنی فانی زندگی کیساتھ "۴۰" کا ہندسہ نہیں لگنے دیا جبکہ میری زندگی کیساتھ "۴۰" کا ہندسہ لگ گیا ہے یعنی ۴۰ برس کا ہو چکا

ہوں"

ایک دفعہ ایک مخلص رفیق نے ایک عمل بتایا کہ نماز صبح اور/ نماز عشاء کے بعد اسے پڑھ لینے سے انسان دائرہ توحید میں آجاتا ہے اور تمام حادثات و بلات سے محفوظ رہتا ہے۔ آپ یہ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے "عزیز دوست کوئی ایسا عمل بتاؤ جو دائرہ توحید میں لے جائے" تو انہوں نے جواباً کہا "پھر وہ تو شہادت ہے" آپ نے برجستہ فرمایا "خدا آپ کا بھلا کرے۔" آپ احباب کو اس سلسلہ میں جو کہتے اسے بزرگ شاعر مرحوم رئیس امروہوی نے یوں بیان کیا ہے۔

صبح دم کتنی کلیاں شگفتہ ہوئیں
شام تک پھول سارے بکھر جائیں گے
موت کوئی' نیا حادثہ تو نہیں
تم بھی مر جاؤ گے ہم بھی مر جائیں گے

○○○○○

جب دشمن کے مکروہ منصوبہ کا علم ہوچکا تو بہت سے احباب نے مسلح محافظین رکھنے پر اصرار کیا۔ یہاں تک کہ آپ کی نظریاتی فوج کے برسر روزگار نوجوانوں نے محافظین کے اخراجات برداشت کرنے کا وعدہ کیا مگر آپ نے ہر بار اس قسم کی تجویز کو رد کیا۔

آپ کا ذاتی پستول ایک چھوٹے سے تھیلہ میں بند پڑا ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی دوست سوال کرتا کہ ڈاکٹر صاحب کیا مشکل وقت میں آپ اپنا پستول نکال کر استعمال کرلیں گے تو آپ فرماتے "یہ استعمال کرنے کیلئے کہاں پڑا ہے یہ تو احباب کے اصرار پر رکھا ہوا ہے۔" بہر طور آپ خطرہ سے مکمل آگاہ تھے یہی وجہ تھی کہ گاڑی خود چلاتے تو اگلی سیٹ پر کسی دوست کو نہ بیٹھنے دیتے اگر کوئی اصرار کرتا تو فرماتے "آپ

اپنی ذمہ داری پر بیٹھیں۔"

بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر آپ کو گاڑی تبدیل کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ آپ کے پاس سوزوکی کار تھی۔ جو حفاظتی حوالہ سے غیر مناسب تھی۔ احباب کا خیال تھا کہ اسے تو ٹکر مار کر بھی اندر والے لوگوں کو کچلا جاسکتا ہے۔ آخر آپ کے ایک نہایت قریبی رفیق نے اپنی پیجارو جیپ آپ کے حوالہ کر دی تاکہ آپ دو تین ساتھیوں سمیت آرام اور ہوشیاری سے بیٹھ سکیں۔ ایک دو ماہ تک آپ یہ گاڑی نہ لینے پر بضد رہے مگر چنداں وجوہات کی بناء پر رضامند ہوگئے۔ آپ نے یہ گاڑی تین چار ماہ استعمال کی اور پھر اس گاڑی میں شہید ہوگئے۔

آخری ایام میں جب آپ کی آمدورفت کے معمولات پر دشمن کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ آپ بے دھڑک اپنی گلی میں تنہا آتے جاتے۔ آپ کے دروازہ پر دستک دی جاتی تو آپ بغیر تعارف کے گھر سے اکیلے نکل آتے البتہ اسی دوران میں اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر علی عباس نقوی کو محتاط رہنے کی تاکید کرتے اور انہیں گھر سے کسی کے بلاوے پر نہ جانے دیتے۔ آپ کو خدشہ تھا کہ کہیں دشمن آپ کے مغالطہ میں انہیں قتل نہ کر دے۔

آپ روزانہ جس روڈ سے گزرتے مجھے بھی ملازمت پر جانے کیلئے یہاں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ تقریباً" روزانہ آپ سے ملاقات ہوتی آپ جونہی آگے بڑھتے میرے منہ سے بے اختیار "فی امان اللہ اور فی حفظ اللہ" کے دعائیہ جملے چھلک جاتے۔ مجھے حالات کیوجہ سے آپ کی منزل مقصود پر پہنچنے کا یقین نہ ہوتا تھا۔ مگر ان حالات میں بھی آپ ہمارے لئے پریشان رہتے تھے۔ اگر میں متواتر دو دن تک آپ کو روڈ پر نظر نہ آتا تو آپ اپنے ساتھیوں کو تاکید کرتے کہ وہ میرا پتہ کریں۔ کبھی کبھار آپ گھر بیٹھے ہوتے اور آپ کی شفقت انگڑائی لیتی تو گاڑی نہ ہونے کے باعث بھی آپ موٹر سائیکل پر سوار ہوکر ہمارے پاس تشریف لاتے اور گھر کی خیریت دریافت فرماتے ہم نے کئی بار اصرار کیا کہ آپ اسقدر آزاد و بے خطر نہ چلا کریں مگر آپ اس سلسلہ میں ماننے والے کہاں تھے-----؟

زندگی کا آخری سفر

۳ مارچ ۱۹۹۵ء بروز جمعہ آپ نے عیدالفطر کی نماز چھپڑ سٹاپ ملتان روڈ پر واقع "جعفریہ مسجد" میں ادا کی۔ آپ کو مومنین کے درمیان پاکر وہاں کے خطیب مولانا صادق صاحب نے حاضرین سے کہا "آج میں آپ کو دو مبارکبادیں پیش کرتا ہوں ایک عیدالفطر کے چاند کی اور دوسری قوم کے چاند ڈاکٹر محمد علی نقوی کے نظر آنے کی کہ آپ ایک طویل عرصہ بعد ہمارے درمیان نظر آئے ہیں۔"

نماز کی ادائیگی کا وقت آیا تو ڈاکٹر صاحب نے حسب معمول تکبیر بلند کی "الصلواۃ ------ الصلوۃ -------- الصلوۃ -------- فرزند اسلام کی آخری تکبیر کی بلند صدا مسجد کے در و دیوار سے ٹکرائی اور سکوت طاری ہوگیا۔ نماز ادا ہوئی تو آپ طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے چند رفقاء کیساتھ بھوانہ جھنگ کی جانب رواں ہوئے....... آپ لاہور چھوڑنے سے پہلے سیدھا کربلا گامے شاہ گئے۔ جہاں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے بانی اور قائد علامہ مفتی جعفر حسین مرحوم کی مرقد پر فاتحہ خوانی کی اور وہاں پر موجود احباب سے فرمایا "یہ بات کس قدر باعث دکھ ہے کہ ہمارے عظیم قائد کی مرقد غربت کے عالم میں ہے کہ یہاں فاتحہ دینے کوئی نہیں آیا" یہاں آپ نے دیگر قبور پر فاتحہ پڑھی اور لاہور سے باہر کے دوستوں کو عید ملنے روانہ ہوگئے۔

آپ ظہرین کے وقت "بھوانہ" پہنچے۔ نماز ظہرین یہاں ادا کی' کھانا کھایا کچھ دیر تک یہاں کے بزرگان اور تنظیمی ساتھیوں سے ملے اور پھر "سرگودھا" چل پڑے۔ رات کا قیام اپنے دیرینہ رفیق سردار سجاد حسین خان میکن کے ہاں کیا۔ صبح سویرے اٹھے۔ احباب کیساتھ نماز صبح ادا کی اور ناشتہ سے قبل چھ سات ھمسفر رفقاء سے قرآن مجید کی قرآت سننا شروع کر دی۔ بعض احباب کی غلطیاں نوٹ کیں اور انہیں اچھے قاری سے قرآن مجید کی تصحیح کی تاکید فرمائی۔ اس موقع پر آپ نے بھی بلند آواز میں تلاوت فرمائی۔ چند مفاہیم بھی زیر بحث لائے اور تمام رفقاء سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ باقاعدگی سے قرآن کریم کی تلاوت بمعہ ترجمہ کریں اور خدا کی اس عظیم کتاب سے ہدایت حاصل کریں۔"

ناشتہ کے بعد آپ اپنے قافلہ کے ہمراہ ”جوہر آباد“ کی جانب بڑھے نماز ظہرین تک وہیں پر رہے۔ یہاں بھی تنظیمی برادران سے ملاقاتیں کیں۔ بلکہ ”خوشاب“ کے چند احباب کو اپنی گاڑی بھیج کر بلوایا اور ان کے حالات سے آگاہی حاصل کی۔ یہاں چہیتے رفقاء نے آپکی تصاویر لیں اور ویڈیو فلم بنانا چاہی تو آپ نے مزاحاً“ فرمایا ”دوستو میری تو خیر ہے میرے ساتھ دوسرے احباب کی فلم بنا کر انہیں نہ مروائیں“

نماز ظہرین کی ادائیگی کے بعد آپ کا یہ کارواں نہایت خوشگوار موڈ میں برادر سید راشد عباس نقوی سے عید ملنے ”ان کے گاؤں کی جانب چلا۔ سفر میں خوب ہنسی مزاح ہوا۔ تقریباً“ ۱۰ بجے شب یہ قافلہ ضلع اٹک پہنچا مگر راشد بھائی کو یہاں نہ پاکر انہیں تھکاوٹ کا احساس ہوا“۔

۵ مارچ صبح نماز و ناشتہ سے فارغ ہوکر آپ کا قافلہ ”اسلام آباد“ پہنچا جہاں برادر ثاقب نقوی و برادر سید امتیاز رضوی سے ملاقات کی۔ آپ جب ان برادران سے ملنے ”اخوت اکیڈمی“ کے دفتر پہنچے تو انھیں دفتر کی صفائی میں مصروف پایا۔ چنانچہ علیک سلیک کے بعد آپ بھی اپنے رفقاء کے ساتھ صفائی میں مصروف ہوگئے آپ نے کمروں میں جھاڑو دیا' فرش دھوئے اور چیزوں کو ترتیب سے رکھا۔

چائے وغیرہ پی کر روانہ ہوئے آپ اسلام آباد کے مصروف ”زیرو پوائنٹ“ پر پہنچے تو دوپہر کے پونے بارہ بجے تھے۔ آپ نے اپنے ساتھی سے کہا ”ہمیں ہر حال میں چار بجے لاہور پہنچنا ہے مجھے وہاں کچھ ضروری کام سرانجام دینے ہیں ...... لہٰذا گاڑی دوڑائیں“ ساتھی نے گاڑی کو بے حد تیز چلایا راستہ میں تیسرے دوست نے کہا ”احتیاط کریں کہیں حادثہ نہ ہو جائے“ تو آپ نے جواب دیا ”ہم نے گاڑی کے حادثہ کی موت نہیں مرنا بے فکر رہیں“

آپ ٹھیک ساڑھے چار بجے لاہور پہنچ گئے۔ نہائے' کپڑے بدلے اور سیدھا کلینک چلے گئے۔ اچانک بیٹھے ہی تھے کہ ایک غریب ضعیف عورت کا بچہ آگیا اس نے اپنی والدہ کی صحت کے بارے میں آگاہ کیا۔ چند روز پہلے آپ نے ضعیفہ کا اپریشن کیا تھا۔ آپ نے فوراً“ اپنی گاڑی کے ذریعہ بوڑھی اماں کو بلایا۔ چیک اپ کیا اور پھر انہیں چھوڑنے کا بندوبست بھی کیا۔

جب آپ کا رفیق مریضہ کو گھر چھوڑ آیا تو انہوں نے مزاحا" کہا "ڈاکٹر صاحب یہ مریضہ تو فائدہ میں ہے کہ آپ نے اپریشن مفت کیا' دوائی دی اور پھر آمدورفت کا بھی اہتمام کیا......." آپ نے فرمایا "ایسے مریض خدا کی طرف سے ہمارے اوپر قرض ہوتے ہیں۔ ان کی تیمارداری اور تعاون ہم پر فرض ہوتا ہے۔ وگرنہ روز قیامت ایسے لوگوں کے بارے ہم سے پوچھا جائیگا۔ کہ انسانیت کو تڑپتا دیکھ کر آپ نے کوتاہ نظری کیوں کی........؟"

کلینک سے ٹھیک آٹھ بجے شب فارغ ہوکر آپ اپنے بچوں کے ہمراہ سید ذوالفقار نقوی کے گھر چلے گئے۔ جو اس وقت تحریک جعفریہ کے رہنما کی حیثیت سے سرکاری سطح پر کی جانے والی گرفتاریوں کی بدولت جیل میں تھے۔ آپ نے شام کا کھانا بھی ان کے گھر کھایا۔ ان کے بچوں کو تسلی دی اور صورتحال سے آگاہ کیا۔

۶ مارچ کو معمول کے مطابق اسپتال' تحریک کے دفتر' فلاحی دفتر اور کلینک پر گئے۔ رات کو گھر واپس لوٹے تو وہاں پر موجود ایک محافظ سے کلینک جانے کو کہا مگر وہ بضد تھا کہ وہ صبح آپ کے ساتھ ہی جائیگا۔ آپ نے اسے ایک بار رخصت کیا مگر وہ تھوڑی دیر بعد واپس آکر دیگر محافظین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ نہ جانے ڈاکٹر صاحب کو کیا خیال آیا کہ آپ رات کو اٹھ کر محافظ رفقاء کے کمرہ میں آئے اور اس دوست کو موجود پاکر برہم ہوئے۔ یاد رہے کہ محافظ رفقاء کو دیگر رفقاء کی جانب سے سختی سے ہدایات تھیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو تنہا نہ چھوڑیں۔ اس لئے وہ ساتھی فرائض کی بجا آوری پر سختی سے کاربند تھا اور وہ آپ کو چھوڑ کر کلینک نہیں جانا چاہتا تھا۔ تاہم آپ نے سختی سے صبح سویرے اسے کلینک بھیج دیا۔

☆☆☆☆☆

یہ کس کا لہو ہے کون مرا........؟

بتایا جاتا ہے کہ جب آپ ۷ مارچ ۱۹۹۵ء کی صبح حسب معمول اپنے گھر سے نکلے تو آپ کے ساتھ صرف ایک رفیق تقی حیدر ہمسفر ہوا جبکہ ایک پہلے سے کلینک پہنچ چکا تھا۔ آپ گھر سے روانہ ہوئے ہی تھے کہ تاڑ میں کھڑے ہوئے ایک شخص کے فائر نے ہوا میں پرواز کی جو تاک میں بیٹھے ہوئے قاتلوں کیلئے "گرین سگنل" تھا جس پر یتیم خانہ چوک اور ساہیوال اڈا کے عین درمیان میں ایک گلی کے کونہ پر نصب بجلی کے دو کھمبوں کی اوٹ میں بیٹھے کلاشنکوف بردار دو افراد نے پوزیشن سنبھالیں۔ آپ کی گاڑی جونہی اس گلی کے سامنے آئی ایسے میں آگے جاتی ہوئی ویگن نے بریک لگائی جس کی وجہ سے آپ کو گاڑی آہستہ کرنا پڑی۔ بس آپ رکے ہی تھے کہ آپ کی بائیں اور سامنے کی جانب سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ سامنے والے حملہ آور نے آپ کو جبکہ بائیں جانب والے نے آپ کے رفیق تقی حیدر کو برسٹ کا نشانہ بنایا۔

حملہ آوروں کا وار اتنا کاری تھا کہ آپ اور آپ کا رفیق سنبھل ہی نہ سکے جبکہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ موقع پر موجود ہزاروں لوگ دیواروں سے لگ گئے۔ اس موقع پر کئی راہگیر بھی زخمی ہوئے جبکہ ایک معصوم بچہ سبطین رضا جو اسکول جا رہا تھا۔ گولی لگنے سے شہید ہوگیا۔ آپ جس سڑک پر ستم کا نشانہ بنے وہ لاہور کا "ملتان روڈ" ہے اور جس چوک پر آپ کا ناحق خون بہا وہ لاہور کا پرہجوم چوک تصور کیا جاتا ہے جہاں چوبیس گھنٹے ٹریفک کی بہتات اور لوگوں کا انبوہ رہتا ہے۔ جبکہ آپ کی مقتل گاہ آپ کی رہائش گاہ سے بمشکل دو فرلانگ کے فاصلہ پر ہے۔

قاتل اطمینان کیساتھ قتل کرنے کے بعد فاتحانہ انداز میں کلاشنکوفیں لہراتے ہوئے دو مزید افراد کیساتھ موٹر سائیکلوں پر روانہ ہوئے اور آرام سے اپنے ٹھکانے پر جا پہنچے۔

جب خوف کی فضا ختم ہوئی تو لوگ ایک دم آپ کی گاڑی کی طرف لپکے اور ہر فرد کی زبان پر ایک ہی سوال تڑپا۔

یہ کس کا لہو ہے کون مرا..............؟

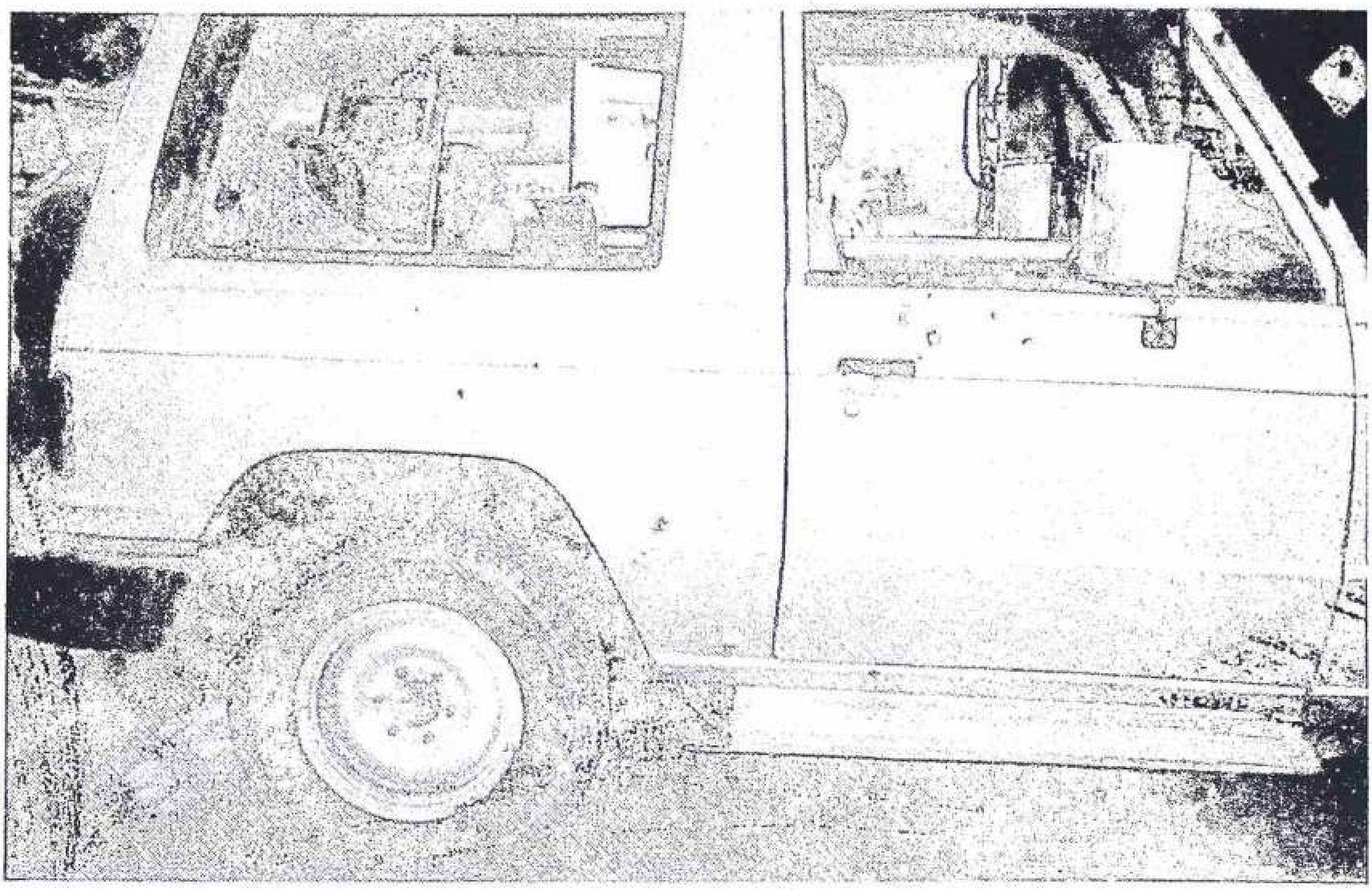

آپ کی گاڑی جس پر حملہ کیا گیا۔

اس وقت کسی کو علم نہ تھا کہ

- یہ ایک معاشرے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر تھا .... جو معاشرے کے جہلاً اجرتی قاتلوں کے ہاتھوں مارا گیا۔
- یہ ایک دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے اسپتال جا رہا تھا .... جو انسانیت کے قاتلوں کے ستم کا نشانہ بن گیا۔
- یہ فرزند مصطفیٰ تھا .... جو مصطفیٰ کے بظاہر کلمہ گو لوگوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا
- یہ فرزند اسلام تھا .... جو دشمنان اسلام کے غضب کی بھینٹ چڑھ گیا۔
- یہ پاک دھرتی کا بے لوث محافظ تھا .... جو وطن عزیز کے بدخواہوں کی سازش کا نشانہ بن گیا۔
- یہ اتحاد بین المسلمین کا داعی تھا .... جو نفاق بین المسلمین کے علمبرداروں کی کاروائی کا نتیجہ ٹھہرا۔

آپؒ اور آپ کے جانثار رفیق کو فوراً" میو اسپتال لاہور لے جایا گیا' جہاں ڈاکٹروں نے موت کی تصدیق کر دی۔ دونوں شہدا کے جنازے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیجے گئے۔ جہاں آپؒ کے جسم پر بیس اور تقی حیدرؒ کے جسم پر چالیس کے قریب گولیوں کے نشان واضح ہوئے؟ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ نشانہ آپؒ کے رفیق کو محافظ سمجھ کر بنایا گیا جو آپ کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے۔

آپؒ کی شہادت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ملک بھر میں پھیلی اور ہواؤں کے دوش پر سوار ہو کر ملکی حدود عبور کر گئی۔ بین الاقوامی نشریات نے آپؒ کی شہادت کی خبر کو خاصی اہمیت کے ساتھ نشر کیا۔ آپؒ کی جدائی کی اطلاع لبنان اور ایران کے شہداء کی مزاروں اور غازیوں کے کانوں سے ٹکرائی جن کے ساتھ آپؒ نظریاتی محاذوں پر مصروف جہاد رہے .... فلسطین و کشمیر کے مجاہدین تک پہنچی جن کی نظریاتی کمک کا مورچہ خالی ہوا .... ملت کے علماء کرام و زعماء عظام نے بھی اپنے ہمکار مجاہد کی جدائی کا نوحہ سنا .... تحریک جعفریہ کی کمر ٹوٹی اور آئی ۔ ایس ۔ او پاکستان نے یتیمی کی دستار باندھی .... ہر طرف نوحہ و ماتم کی صدائیں اٹھیں۔

تم تھے تو اتنی تیز نہیں تھی غموں کی دھوپ
تم تھے تو درد حد سے زیادہ بڑھا نہ تھا
تم تھے تو آنکھ واقف گریہ ہوئی نہ تھی
تم تھے تو زندگی پہ بھروسہ بلا کا تھا

تقریباً بارہ گھنٹے بعد آپؒ کا جسد خاکی آپؒ کی رہائش گاہ ۱۴۶ بھلا سٹاپ ملتان روڈ لایا گیا جہاں تمام شہدا کو غسل و کفن ملا۔ بارہ تیرہ گھنٹے کے دورانیہ میں لاہور کے گرد و نواح اور مختلف شہروں کے نوجوان اور تحریک جعفریہ کے تمام مرکزی قائدین لاہور پہنچ گئے۔ آہ و بکا، نوحہ و ماتم کے لامتناہی سلسلہ کے دوران اپنوں کی زبان پر یہ سوال تڑپتا رہا کہ قاتل کون تھے ....؟

چونکہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے زاویئے مختلف تھے اور ان کا اثر دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس لئے ہر زاویہ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے تاثرات بھی مختلف تھے۔

اکثریت کا خیال تھا کہ یہ کاروائی ملت جعفریہ کی مخالف تنظیم کی ہے کیونکہ یہ لوگ ایک عرصہ سے آپؒ کے تعاقب میں تھے۔ انہوں نے آپؒ کے خلاف اپنے کارکنان کے قتل کا مقدمہ درج کرایا تھا اور ان کے رہنماؤں نے کئی بار سٹیج پر آپ کا نام لے کر تنقید کی تھی۔

تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر کی رپورٹ کے مطابق کہ اپنی شہادت سے ایک روز قبل ڈاکٹر صاحبؒ نے دفتر فون کر کے انہیں متنبہ کیا کہ مخالف تنظیم کے دفتر واقع لٹن روڈ لاہور میں دو تین روز سے مسلسل کوئی خفیہ میٹنگ ہو رہی ہے اور مختلف چہروں کی نقل و حرکت مشکوک ہے لہٰذا اردو بازار لاہور کی شیعہ تاجر برادری کو ممکنہ خطرات سے بچنے کے لئے آگاہ کر دیں۔ یاد رہے کہ چند روز پہلے اردو بازار میں ایک مذہبی تاجر کا قتل ہوا تھا جن کی ذمہ داری اہل تشیع کی ایک جماعت پر ڈالی گئی تھی اور انہوں نے شیعہ تاجروں سے انتقام لینے کا اعلان کیا تھا اور پھر دو شیعہ تاجر برادران پر حملہ ہوا جس کے نتیجہ میں ایک شہید ہو گیا۔

ہم خون کی قسطیں تو کئی دے چکے لیکن
اے ارضِ وطن قرض ادا کیوں نہیں ہوتا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک مذہبی تنظیم کو ڈاکٹر صاحب جیسے انسان سے کیا دشمنی تھی کیونکہ نہ آپ تحریک جعفریہ کے عہدیدار تھے نہ جلسوں اور اخبارات کی زینت بنتے تھے اور نہ کبھی ان کا مخالف تنظیم سے آمنا سامنا ہوا تھا ....

اس ضمن میں جواب بڑا سادہ سا ہے کہ دشمن دو حوالوں سے آپ" کو جانتا تھا اس کا خیال تھا کہ ڈاکٹر نقوی" ملت جعفریہ کی ریڑھ کی ہڈی، تحریک جعفریہ کا ذہن اور آئی۔ ایس۔ او پاکستان کا سرپرست ہے۔ لہٰذا اس کا قتل اہل تشیع کی کمر توڑنے کے مترادف ہے اور دوم اسے یہ گمان بھی تھا کہ اس کے خلاف ہونے والی تمام کاروائیوں اور اس کے تمام منصوبوں کی ناکامی کے پیچھے ڈاکٹر نقوی" کا ہاتھ ہے۔ لہٰذا وہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا مقابلہ کرنے کی جنگ ہار بیٹھا اور اس نے اپنے روایتی انداز کو اپنایا۔

ایک حلقہ یہ رائے بھی رکھتا تھا کہ مخالف تنظیم کے ایک رہنما نے بارہویں امام حضرت امام مہدی علیہ السلام کے خلاف جو زبان دراز کی ہوئی تھی اور پورے مسلمان اس کی گستاخانہ حرکت پر مشتعل تھے اسے خدشہ تھا کہ دو آدمی اس کی جان کے لئے بڑا خطرہ ہیں۔ ایک جھنگ کے بریلوی اور سیاسی مخالف شیخ محمد اقبال جن پر اس تنظیم کے دو بڑے رہنماؤں کے قتل کے الزامات اور ثبوت پہلے سے موجود تھے۔ اور دوسرا اہل تشیع سے ڈاکٹر محمد علی نقوی" جن کا نام مخالف حلقہ کے لئے ایک خوف کی علامت بنا ہوا تھا۔ لہٰذا ایک منصوبہ بندی کے تحت ۵ مارچ کو شیخ محمد اقبال اور ۷ مارچ کو ڈاکٹر محمد علی نقوی" قتل کر دئے گئے۔

ایک اطلاع کے مطابق اسی تنظیم کے ایک گرفتار ملزم سے ڈائری برآمد ہوئی جس پر ۵ مارچ جھنگ، ۶ مارچ ملتان اور ۷ مارچ لاہور لکھا ہوا تھا۔

تحریک جعفریہ کا معتمد حلقہ بھی ڈاکٹر صاحب کے قتل کا ذمہ دار مذہبی مخالف تنظیم کو ٹھہرا رہا تھا کیونکہ چھ ماہ قبل موصول ہونے والی رپورٹ کے مطابق کہ "ڈاکٹر صاحب پر قاتلانہ حملہ چوک یتیم خانہ یا سکیم موڑ ملتان روڈ پر ہوگا" بھی اس تنظیم کی نشاندہی کرتا تھا۔

تحریک جعفریہ کے ایک معتبر حلقہ کا یہ خیال بھی تھا کہ ڈاکٹر صاحب چونکہ

رجعت پسندانہ یا فرقہ وارانہ سرگرمیوں میں کبھی دلچسپی نہیں لیتے تھے بلکہ ان کا معیار دشمنی بھی خاصا وزنی تھا وہ امریکہ کو اسلام اور پاکستان کا دشمن قرار دیتے تھے اور انہوں نے پاکستان میں پہلی بار امریکہ مردہ باد کا نعرہ متعارف کرایا تھا اور انہوں نے امریکی اور اسرائیلی رہنماؤں کے پتلے نذر آتش کرنے کی رسم ڈالی تھی اور ان سے یہاں کے امریکی سفارتکار خوفزدہ رہتے تھے۔ لہٰذا یہ کاروائی امریکی یا اسرائیلی ایجنٹوں کی سازش کا نتیجہ ہے۔

ایک غیر جانبدار حلقہ یہ تجزیہ بھی کرتا تھا کہ سندھ کراچی کے حالات کی خرابی کے بعد بھارت نے پنجاب کے حالات خراب کرنے کے لئے ایک بڑے رہنما کا قتل کرایا ہے تاکہ فرقہ واریت کو شدت ملے اور پاکستان کا استحکام کمزور ہو۔

ایک محدود حلقہ اس حادثہ کا ذمہ دار ایک معروف طلبہ تنظیم کو ٹھہراتا تھا جس کے ساتھ آئی۔ ایس۔ او لاہور کی شدید چپقلش چل رہی تھی اور اس سے قبل کئی بار نازک معاملات پر ڈاکٹر صاحب کا بھی اس سے آمنا سامنا ہو چکا تھا۔

تحریک جعفریہ کا ایک دور اندیش حلقہ اس سانحہ کے پیچھے ملکی ایجنسیوں اور بالخصوص پنجاب حکومت (وٹو حکومت کا ہاتھ تصور کرتا تھا۔ کیونکہ اس حلقہ کا خیال تھا کہ ملکی ایجنسیوں کے کاغذات میں ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے سب سے بڑے رہنما اور ذہن ہیں دوم اس وقت کی پنجاب حکومت مخالف تنظیم کے دو ایم۔ پی۔ اے اور مذہبی دباؤ کی بدولت گھٹنے ٹیک چکی تھی اور اس نے شیعیت کے لئے ضیاالحق کی یاد تازہ کر رکھی تھی۔

اس ضمن میں سیاسی حلقہ یہ تاثر بھی دیتا رہا ہے کہ منظور وٹو حکومت اہل تشیع پر ظلم کا بازار اس لئے گرم کئے ہوئے ہے کہ شیعہ ووٹر پیپلز پارٹی کے دور اقتدار سے مایوس ہوں اور اس طرح پی۔ پی کی قوت کا شیرازہ بکھر جائے۔

دور اندیش حلقوں کے دلائل کے مطابق کہ پنجاب حکومت نے جعلی پولیس مقابلے شروع کر کے ڈاکوؤں، قاتلوں، مفروروں کے قتل کی آڑ میں چند مذہبی رہنماؤں کے قتل کے منصوبے تیار کر رکھے تھے۔ اس حلقہ کی اطلاع کے مطابق جب ڈاکٹر صاحب ۲۴ فروری ۱۹۹۵ء کو اپنی زندگی کے آخری جلوس "یوم القدس" میں شریک تھے

شہید وفا تقی حیدر

معصوم شہید شیخ سبطین رضا۔

تو پولیس کے حلقوں میں سے کچھ سادہ لباس میں ملبوس لوگ ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کی حرکت سے ڈاکٹر صاحب کو بھی آگاہ کیا گیا اور انہوں نے اس بات کا نوٹس بھی لیا۔

آپؒ کی حفاظت پر مامور نوجوانوں نے بتایا کہ ایک مرتبہ ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ کے صوبائی دفتر واقع مسلم ٹاؤن لاہور میں بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؒ کو کلینک سے فون کے ذریعے آگاہ کیا گیا کہ "ییلوکیب ٹیکسی" پر کچھ مشکوک لوگ کلینک کے گرد چکر لگا رہے ہیں جن کے ہاتھوں میں "موبائل فون" ہیں۔ یہ اطلاع ملتے ہی یہ دونوں نوجوان جائزہ لینے کیلئے موٹر سائیکل پر سوار ہوئے۔ مغرب کا وقت تھا ابھی یہ کلینک کے پاس پہنچے ہی تھے کہ مشکوک ٹیکسی کلینک کی گلی سے برآمد ہوئی اور ٹھوکر نیاز بیگ کی طرف روانہ ہو گئی۔ ان دونوں نوجوانوں نے اس کا غیر محسوس انداز میں تعاقب کیا اور ملتان روڈ پر واقع پولیس چوکی پر موجود انسپکٹر کو اس بات سے آگاہ کر دیا۔

یہ گاڑی کچھ فاصلے پر جا کر ایک مسجد کے سامنے ٹھہری تو اتنے میں پولیس انسپکٹر بھی وہیں پر پہنچ گیا۔ ان نوجوانوں کا خیال تھا کہ مشکوک افراد ہتھے چڑھ گئے ہیں مگر جونہی ایک شخص گاڑی سے باہر نکلا تو وہ مسکرایا اور انسپکٹر نے اسے گلے لگا لیا۔

ابھی تک یہ عقدہ حل نہ ہو سکا کہ وہ کون لوگ تھے اور کس مقصد کے لئے آئے تھے......؟

اپنے ایک نہایت معتمد ساتھی کے سامنے اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ پولیس کے اعلیٰ افسر نے آپ پر واضح کیا تھا کہ "ڈاکٹر صاحب آپ ہمیں بڑے عرصے سے مطلوب ہیں مگر کوئی موقع نہیں مل رہا" ایسے ہی چند اور واقعات کی روشنی میں آپؒ نے فرمایا کہ "بہتر ہے ایک مرتبہ میں پولیس مراحل سے گزر جاؤں یہ روز کے ڈراوے، دھمکاوے مجھے تنگ کر چکے ہیں"

۲۴ فروری کی شب ملک بھر میں فرقہ وارانہ سرگرمیاں روکنے کے لئے مذہبی رہنماؤں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایجنسیوں سے مربوط ایک شخص نے ڈاکٹر صاحب سے کہا اگرچہ آپ کا نام گرفتار کئے جانے والوں میں نہیں ہے تاہم آپ کے لئے مناسب ہے کہ آپ ایک ماہ کی چھٹی لے کر یہاں سے باہر چلے جائیں۔ آئی ۔ جی

پولیس نے اعتراف کیا کہ گرفتار ہونے والے رہنماؤں میں ڈاکٹر صاحب کا نام تھا مگر انہوں نے یہ کہہ کر کہ ڈاکٹر صاحب شریف النفس انسان ہیں کا نام خود کاٹ دیا۔

بعض باشعور افراد کا خیال تھا کہ پولیس کا ڈاکٹر صاحب کو گرفتار نہ کرنا اور انہیں کھلا چھوڑ دینا اس خدشے کا پیش خیمہ تھا کہ ایجنسیاں اندرونی یا بیرونی اشارے پر ڈاکٹر صاحب کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتی تھیں۔

بعض افراد ان تمام حقائق کی روشنی میں چلتے چلتے آخر وہیں پہنچتے تھے کہ یہ قتل مخالف تنظیم کی کاروائی ہے البتہ وہ ملکی یا غیر ملکی ایجنسیوں کے ہاتھوں حسب معمول استعمال ہوئے ہیں۔

جتنے منہ اتنی باتیں ہوئیں بہرحال ہر شخص کا یہ موقف تھا کہ

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر میں تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بڑی تھی

ایف آئی آر درج کرنے کا وقت آیا تو تھانہ نواں کوٹ میں مخالف تنظیم کے مرکزی رہنما اور کارکنان کے نام شواہد کے ساتھ درج کئے گئے۔ اس دوران میں ایک حلقہ اس بات پر بھی مصر رہا کہ ایف۔آئی۔آر میں منظور وٹو وزیر اعلیٰ پنجاب کا نام دیا جائے مگر نا معلوم وجوہات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔

ایف۔آئی۔آر میں درج پانچ ملزمان گرفتار کر لئے گئے مگر ان سے غیر جانبدارانہ تفتیش نہ ہو سکی۔ اور تھوڑے عرصہ بعد تمام ملزمان رہا کر دیئے گئے۔

ڈاکٹر صاحب انتہائی دور اندیش اور زیرک انسان تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنی وصیت میں تحریر فرمایا تھا کہ "میرا پوسٹمارٹم نہ کرایا جائے اور نہ میری تجہیز پر تنظیمی اجتماع منعقد کیا جائے۔

"میرا پوسٹمارٹم نہ کرایا جائے" یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی شہادت کے بارے میں سو فیصد واضح تھے۔ انہوں نے یہ نہیں لکھا کہ اگر میں قتل ہوجاؤں .... اگر مگر کے لفظ تحریر نہ کر کے انہوں نے ثابت کیا کہ وہ اپنی سرخ موت پر یقین کامل رکھتے تھے اور اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔

دوم آپ اپنے خون کو عدالتوں میں لے جانے پر ہرگز رضامند نہ تھے اس لئے کہ آپ کو یہاں کسی سے انصاف کی توقع نہ تھی آپ سمجھتے تھے کہ۔

یہاں تو قاتل بھی ہے منصف تو عدالت میں نہ جا
چور تو چور کو ہی اذن رہائی دے گا

آپؒ اپنے عظیم قائد علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ کے مقدمہ قتل کا نتیجہ دیکھ چکے تھے جب پانچ قاتلوں نے عدالت کے رو برو کئی بار اعتراف جرم کیا اور ۵۶ گواہان نے قاتلوں کے خلاف گواہی دی۔ قاتل بار بار کہتے رہے کہ ہم سے وقت کا پیغمبر قتل ہوا مگر عدالت نے ہر بار کہا آپ قاتل نہیں ہیں اور آخر بیرونی سگنل پر انہیں رہا کر دیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پاکستان کی عدالتوں سے بال برابر انصاف کی توقع نہ تھی وہ غیور تھے اور قطعاً" برداشت نہیں کرتے تھے کہ ان کا خون عدالتوں میں بظاہر ہار جائے۔

اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب جو شہید لاریب ہیں اور مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق زندہ ہیں کئی بار اپنے معتمد رفقاء سے خواب میں مل چکے ہیں اور ہر بار یہی فرماتے ہیں کہ آپ نے میرے خون کا مقدمہ درج کرا کے مجھے شرمسار کیا ہے۔

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن ......؟

۸ مارچ ۱۹۹۵ء کی صبح نو بجے ڈاکٹر صاحب کے گھر کے سامنے آپؒ کے پرستاروں، ماتمداروں اور غمگساروں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دینے لگا۔ ملک بھر سے ہزاروں افراد آپؒ کی نماز جنازہ ادا کرنے کیلئے لاہور پہنچے۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب شہدا کے جنازے شیخ زید اسپتال لاہور کے سرد خانہ سے لائے گئے تو استقبالی کہرام سے زمین پر بھونچال آگیا۔ آپؒ کے تابوت کے چاروں اطراف تحریک جعفریہ اور آئی۔ ایس۔ او کے پرچم سرنگوں تھے جبکہ آپؒ کے جسم پر بھی یہ پرچم بطور کفن لپٹے ہوئے تھے۔

پروگرام کے مطابق آپؒ کی نماز جنازہ ناصر باغ لاہور میں طے تھی۔ چنانچہ آپؒ ہزاروں افراد کے درمیان، ناصر باغ کی جانب ماتمیوں کے دوش پر سوار ہو کر چلے۔

اک جنازہ اٹھا مقتل سے عجب شان کے ساتھ
جیسے سج کر کسی فاتح کی سواری نکلے

ملت جعفریہ کا یہ پہلا بڑا اجتماع تھا جو آپؒ کی قیادت یا نگرانی کے بغیر رواں تھا مگر پھر بھی آپ کے بغیر نہ تھا ...... آپؒ کے جنازے میں ملک بھر کے علماء کرام اور اہلسنّت برادران نے بھرپور شرکت فرمائی جبکہ نماز جنازہ قائد ملت جعفریہ علامہ سید ساجد علی نقوی کی اقتداء میں ادا کی گئی۔ نماز جنازہ کی ادائیگی سے قبل اتحاد بین المسلمین کے علمبردار اور اسلام و وطن کے عظیم فرزند کو سنی، شیعہ مسلمانوں نے خراج عقیدت پیش کیا۔ ایک مرحلہ پر جب آپ کے بڑے صاحبزادے سید محمد سلمان نقوی کو اظہار خیال کی دعوت دی گئی تو شرکاء جنازہ پر سکوت طاری ہو گیا۔ آپؒ کے ۱۵ سالہ فرزند نے نہایت حوصلہ اور تحمل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ......

سید سلمان نقوی "یتیمی کا پہلا دردناک خطاب کرتے ہوئے۔"

بسم اللہ الرحمن الرحیم .... انا للہ و انا الیہ راجعون

انسانی عقل و فہم سے بلند و بالا ہے خدا کی ذات جو ایک پل میں ہنستے مسکراتے چمن کو ویران کر دیتی ہے۔ یہ کل صبح کی بات ہے کہ جب میرے شہید والد نے گھر سے نکلتے وقت ہمیں عجیب درد بھرے انداز میں خدا حافظ کہا۔ ان کے الوداعی جملے میں اتنا درد تھا کہ ہمارا پورا گھر غمناک ہوگیا۔ چند لمحوں بعد کل کے سورج اور چشم فلک نے دیکھا کہ میرے بے جرم و بے خطا والد کو شہر کے پر ہجوم چوک میں اسلام اور وطن دشمن قوتوں کے ایجنٹوں نے انتہائی بے دردی سے شہید کر دیا۔ کل جب ہم شہید سے بے موسم روٹھ جانے کا شکوہ کرنے لگے تو ان کے نحیف جسم سے لہو کے ٹپکتے قطروں نے کہا بیٹا !

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لئے
عہدِ کم ظرف کی ہر بات گوارہ کر لیں

اے میرے والد اور ان کے شہید رفقاء کے ماتمیو! قائد ملت اسلامیہ علامہ سید ساجد علی نقوی اور رہبر کبیر حضرت علی خامنہ ای کی حیات میں ہمیں کبھی یتیم نہ کہنا۔ زمانہ جانتا ہے کہ میرے والد کا جرم کیا تھا؟ یہی ..... کہ انہوں نے اسلامی اقدار اور وطن کی سرحدوں کی حفاظت کی، یہی ..... کہ انہوں نے ملک میں پہلی بار مردہ باد امریکہ کا نعرہ لگایا، یہی ..... کہ انہوں نے اتحاد بین المسلمین کی صدا بلند کی۔ یہی ..... کہ انہوں نے حضرت امام خمینیؒ کے افکار کو ملک کے درو دیوار تک پہنچایا۔ ہاں، ہاں! یہی ان کے جرم تھے جن کی پاداش میں اسلام دشمنوں نے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔ میں آج امام زمانہ کے روبرو اپنے محبوب قائد کی موجودگی میں اعلان کرتا ہوں کہ میں اپنے روحانی بھائیوں کے ساتھ اپنے مظلوم اور شہید والد کے مشن کو تکمیل تک پہنچاؤں گا اور ان کے اس دعویٰ کو زندہ رکھوں گا کہ

ہمارے بعد بھی رونق رہے گی مقتل میں
ہم اہل دل کو بڑے حوصلے میں چھوڑ آئے ہیں

البتہ اے میرے مظلوم پاپا!

گزر تو جائے گی تیرے بغیر بھی لیکن
بہت اداس بڑی بے قرار گزرے گی

☆☆☆☆☆

علامہ سید ساجد علی نقوی کا تاریخی خطاب

سید محمد سلمان نقوی کے پر درد خطاب اور آخری شعر نے ایسا کہرام برپا کیا کہ علماء سمیت دیگر شرکاء دھاڑیں مار کر روتے رہے۔ آہ و بکا کے اس درد ناک ماحول میں قائد ملت جعفریہ حضرت علامہ سید ساجد علی نقوی چشم تر آگے بڑھے اور انہوں نے اپنے عظیم رفیق کے جنازہ پر پاکستان کی تاریخ کا تاریخی خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

عزیزان گرامی! تحریک اسلامی کے فعال اور مخلص کارکن، مرحوم و مغفور ہمارے درد مند ساتھی کی شہادت پر اور اس کے ساتھ اس کے فدا کار محافظ اور عزیز سبطین رضا کی شہادت پر میں آپ سب حضرات کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان حساس اور جذباتی لمحات میں ہمیں اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ جس راستہ میں ڈاکٹر محمد علی نقوی اور ان کے رفقاء نے شہادت کی سعادت حاصل کی۔ اس راستہ میں اگرچہ دشواریاں بہت زیادہ ہیں لیکن اس راستہ پر ہمیں چلتے رہنا ہے۔ اسی ہدف اور اسی مقصد کے لئے کوشاں

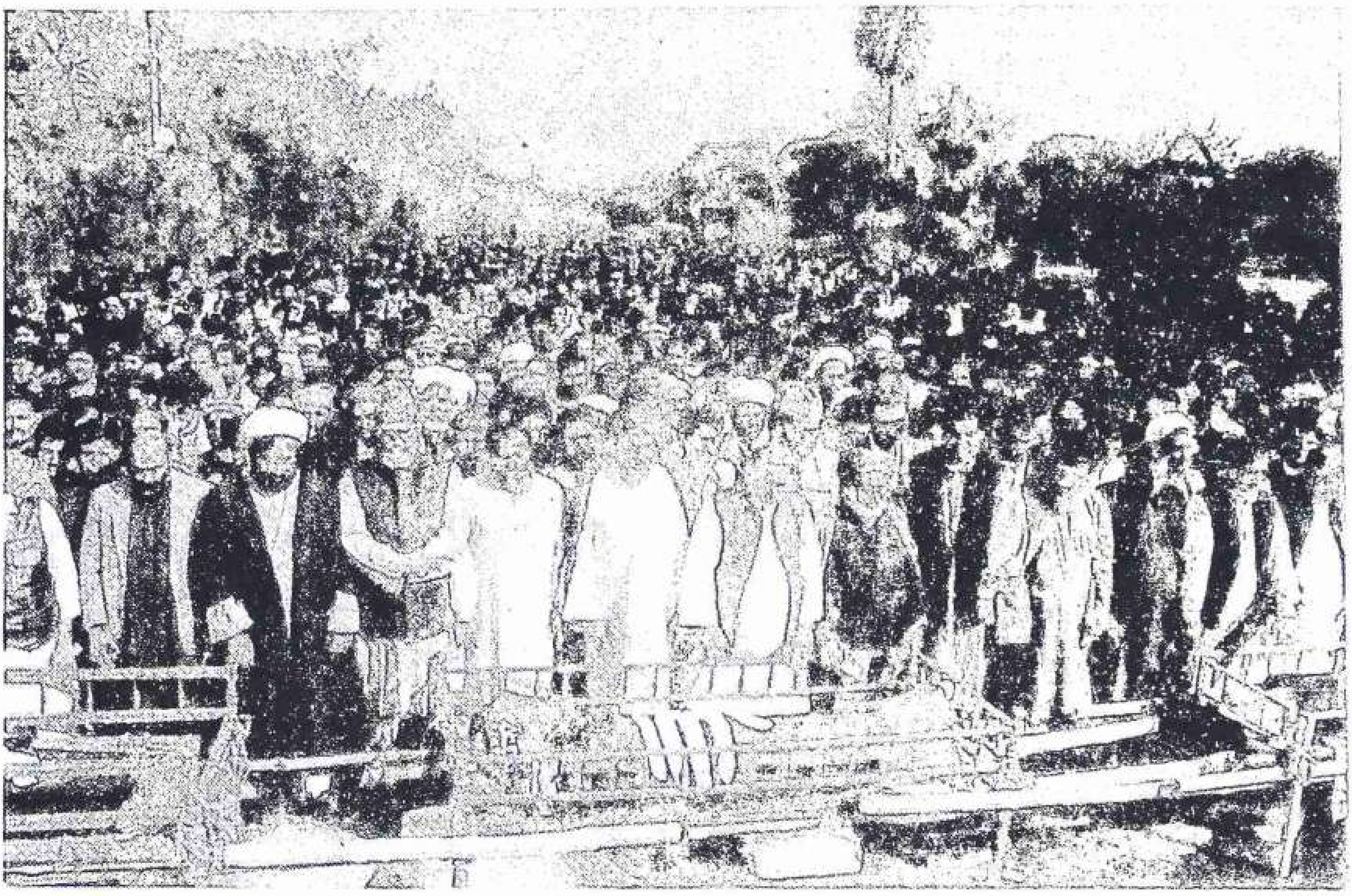

قائد ملت جعفریہ کی اقتداء میں سنی شیعہ مسلمان شہداء کی نماز جنازہ ادا کرتے ہوئے۔

رہنا ہے۔ جس کے لئے ڈاکٹر محمد علی نقوی نے مصیبتیں اور مشقتیں اٹھائیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تسلسل اور سوچ سمجھے منصوبہ کے تحت ہم دہشت گردی کا نشانہ بنتے چلے آ رہے ہیں۔ فلسطین کے مسلمان ہوں' بوسنیا' چیچنیا کے مظلوم مسلمان ہوں' دوسرے خطوں کے مسلمان ہوں یا ہمارے کشمیری مسلمان بھائی ہوں سب کے سب عالمی دہشت گردی کا شکار ہیں۔ دشمنان اسلام سامراجی قوتیں مسلمانوں کو کمزور کرنے کے درپے ہیں۔ اس وقت عالم انسانیت اس بات کی منتظر ہے کہ اسلام اس کے لئے کیا نجات کا پیغام دیتا ہے۔ ان سب کی نگاہیں اسلام کی طرف ہیں اور وہ اپنی نجات و فلاح اسلام کے پیغام میں سمجھتی ہیں۔

دشمنان اسلام یہ چاہتے ہیں کہ وہ اسلام کے راستے میں ان بڑھتے ہوئے قدموں کے سامنے رکاوٹ کھڑی کریں۔ اس لئے عالم اسلام کو مختلف طریقوں سے دہشت گردی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ عالمی سامراج اس بات سے خوفزدہ ہے کہ اگر کسی چھوٹی سی مملکت میں مسلمانوں کو حق دیدیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ اسلام پورے خطے میں پھیل جائے۔ اسی لئے بوسنیا کے مسلمانوں کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں۔ ان کے ساتھ حمایت و ہمدردی کوئی نہیں کر رہا۔ انسانی حقوق کے ادارے خاموش ہیں۔ اقوام متحدہ آج ان کی کوئی مدد نہیں کر رہی۔ یہ سب اس لئے ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔

مجھے کہنے دیجئے کہ اسلامی کانفرنس بھی بے عملی کا شکار ہے اس نے بھی ان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم مسلمان ہیں' ہم زندہ بھی ہیں لیکن ہماری طرف سے ان مظلوموں کی کوئی مدد نہیں کی جا رہی جبکہ دشمنوں کی طرف سے اسرائیل کو مضبوط کرنے اور تقویت دینے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ اسرائیل دہشت گردی کے ہر طریقہ کو آزما رہا ہے۔ آپ دیکھیں اگر ان کے سرپرستوں کا کتا بھی کسی جگہ مر جائے تو ان کو دہشت گردی نظر آتی ہے لیکن مسلمان امت کے بہترین فرد اور ان کی قیمتی متاع اگر ان سے چھن جائے تو اس کو دہشت گردی نہیں کہتے بلکہ اس کی حمایت کرتے ہیں۔ قدس اسرائیل کے قبضہ میں ہے عالمی سامراجی اسرائیلی کے اس غاصبانہ قبضہ کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ اسرائیل کو دہشت گردی پر آمادہ کرنا اور اس کی پشت پناہی کرنا یہ عالمی سامراج کا وطیرہ اور حربہ ہے۔

ہمیں حیرانی ہے کہ آج مسلمان حکمران اس بات کی تیاریاں کر رہے ہیں کہ اسرائیل کو تسلیم کریں۔ اگر ہم اتنی لمبی مدت تک رہنے والے قبضہ کو آج تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے تو پھر کشمیر کے غاصبانہ قبضے کو بھی تسلیم کرنا ہوگا۔

ہم نے ہمیشہ غاصبوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی ہے۔ ہم نے ہمیشہ غاصبوں کو بے نقاب کیا ہے ہم نے ملت مسلمہ کے دشمنوں کے چہروں سے نقاب کھینچی ہے اور مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اے شیعہ تمہارا دشمن سنی نہیں ہے اور اے سنی تمہارا دشمن شیعہ نہیں ہے' بلکہ ہم سب کا دشمن امریکہ ہے۔ مکتب اہل سنت سے تعلق رکھنے والے علماء اور عوام کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ آج ہمارے ساتھ شریک غم ہیں۔ پاکستان کے اندر کوئی شیعہ سنی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے ایسے اقدامات اٹھائے ہیں جس سے اگر کوئی ایسا مسئلہ تھا بھی تو وہ ختم ہو چکا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ملت مسلمہ کے مسائل' مصائب و مشکلات سے آگاہ ہیں وہ ہمارے ان اقدامات کی حمایت کریں گے۔

آج عالم اسلام دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ آج پاکستان کے غریب عوام مختلف افراد کی دہشت گردی کا شکار ہیں۔ پاکستان کے مظلوم عوام بیچارگی کی کیفیت میں ہیں۔ خاص کر کراچی کے عوام۔ وہاں ان کا کوئی یارو مدد گار نہیں۔ کوئی پرسانِ حال نہیں ان کا خدا کے علاوہ کوئی نہیں رہا جس پر وہ بھروسہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دہشت گردی کی بنیادی ذمہ داری حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ پچھلی حکومتوں نے "ڈنگ ٹپاؤ" پالیسی اپنائی۔ میں پوچھتا ہوں کہ موجودہ حکمرانوں نے دہشت گردی کے خاتمہ کے لئے کیا اقدامات کئے ہیں اس ملک کے اندر بیسیوں ایجنسیاں موجود ہیں۔ ایک لشکر جرار موجود ہے جو خزانہ پر بوجھ ہیں۔ بھاری بھر کم تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔ کیا انہیں پتہ نہیں کہ دہشت گردی کرنے والے کون لوگ ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ حکمرانوں کو' ایجنسیوں کو' اداروں کو معلوم ہے کہ دہشت گرد کون ہیں۔؟

مجھے کہنے دیجئے کہ انتظامیہ کی بے بسی اور حکمرانوں کی مصلحتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ملک کے اندر کچھ بالا دست قوتیں موجود ہیں جن کے اشاروں اور پشت

پناہی سے یہ دہشت گردی ہو رہی ہے اس بات کی طرف سالہا سال سے ہم متوجہ کرتے چلے آرہے ہیں لیکن کسی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ پاکستان کے وہ عوام جنہوں نے پاکستان بنانے میں بے شمار قربانیاں دیں آج انہیں کیا صلہ دیا جا رہا ہے ان کو پاکستان کے لئے قربانیاں دینے کا' کیا اجر دیا جا رہا ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں پاکستان بنا کر کیا ملا ......؟ یہ صورت حال دیکھ کر کشمیری پاکستان کے حق میں کیا رائے دیں گے؟ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے حکمران پاکستان کے لئے مخلص نہیں ہیں۔ یہ سب مصیبتیں حکمرانوں کی لائی ہوئی ہیں۔

آج آپ نے دیکھا کہ گرفتاریاں ہو رہی ہیں میں نے کہا کرلو گرفتاریاں ہم مزاحمت نہیں کریں گے ہم تمہیں کوئی بہانہ فراہم نہیں کرنا چاہتے۔ یہ گرفتاریوں کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی جیسی شخصیت دہشت گردی کا نشانہ بنی ہے۔ دہشت گرد گرفتار نہیں ہوئے۔ اگر دہشت گردوں کو گرفتار کیا جاتا تو یہ صورتحال پیدا نہ ہوتی۔ مولانا ابوالحسن نقوی ایک پاکباز خطیب ہیں ذوالفقار نقوی امن پسند ہیں جن کو ہم نے انتظامیہ سے رابطہ رکھنے کے لئے مقرر کیا۔ انتظامیہ کے لئے ان کو گرفتار کرنا باعث شرم ہے

میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر میرے ساتھیوں میں سے کسی ایک پر بھی دہشت گردی ثابت ہو جائے تو میں تحریک جعفریہ کو توڑنے کا اعلان کر دوں گا۔ افسوس ہے بے گناہ افراد کو پکڑا جا رہا ہے یہ وقت گزارنے کی بات ہے۔ سالہا سال سے ہم اس سے روک رہے ہیں۔ یہ پاکستان سے غداری ہے یہ عمل بے نتیجہ ہے۔ یہ پاکستان کی سالمیت کے ساتھ دشمنی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی کی قربانی پاکستان کی سالمیت کے لئے ہے وہ شہید وطن ہیں۔ ہمیں مزید تیار رہنا چاہیے ہم قربانیاں دینے کے لئے گھبرانے والے نہیں ہیں ہماری تاریخ شہادتوں کے خون سے سرخ ہے۔ کوفہ سے لیکر کربلا سے گزرتے ہوئے تاریخ کے اس سارے سفر میں ہم نے بڑی بڑی قیمتی قربانیاں دی ہیں لیکن وہ قربانیاں ایک ہدف اور مقصد کے لئے تھیں۔ ہمیں وہ ہدف زیادہ عزیز ہے۔ قربانی ہمیشہ اس ہدف کے لئے دی جاتی ہے جو زیادہ قیمتی ہو زیادہ عزیز ہو۔

حضرت زینب کبریٰؑ نے جب ایک نگاہ بھائی کی لاش پر اور ایک نگاہ اللہ تعالیٰ کی عظمت پر ڈالی تو پھر یہی فرماتی ہیں "**اللھم تقبل من ھذا قلیل من القربان**" باری الٰہا اپنے راستے میں میری یہ قربانی قبول فرما۔ اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی قرآن کے راستے میں قربان ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نقوی کو ہم پاکستان کے راستہ کی قربانی سمجھتے ہیں۔ ہمیں پاکستان کی سالمیت اور پاکستان کی عوام سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں موجودہ صورتحال کو شیعہ سنی کا کوئی مسئلہ نہیں سمجھتا۔ میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کی عبادات و نظریات اور ان کی رسومات کا احترام کرتا ہوں۔

سیاچن کے دامن سے لیکر کراچی کے ساحل تک کوئی ایک سنی اٹھ کر یہ کہہ دے کہ میں نے ان کے عقیدے، مذہب یا رسم کی ان چھ سالوں میں ایک مرتبہ بھی توہین کی ہو۔ مقام افسوس ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے ساتھ بٹھانے کی باتیں کی جارہی ہے۔ جو شیطانی مشن عمل پیرا ہیں جنہوں نے پاکستان کی سالمیت اور وحدت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ وہ لوگ جن کے خلاف دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ وہ شیطانی مشن رکھتے ہیں اور اپنے شیطانی مشن سے باز آنے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے مسجدوں کو استعمال کیا ہے، مقدس مقامات کو استعمال کیا ہے۔ پاکستان کے گلی کوچوں کو استعمال کیا ہے۔ مسلمانوں کو لڑانے کی باتیں کھلے عام کیں اس کے باوجود انہوں نے جتنی غلیظ زبان استعمال کی۔ ہم نے اس کے خلاف ایک بھی دل آزار نعرے کی کبھی لوگوں کو اجازت نہیں دی ہے۔

ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ ہم دینی جماعتوں کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔ دینی جماعتوں کے سربراہوں کے ساتھ مل بیٹھنے کے لئے تیار ہیں۔ تمام مکاتب فکر کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔ میں بتانا چاہتا ہوں کہ کوئی سنی شیعہ مسئلہ نہیں ہے ہم ایک ہیں۔ ہمارے مقاصد ایک ہیں ہمارے درمیان سینکڑوں مشترکات ہیں جب نظام کی بات آئے گی تو شیعہ سنی کے اندر ننانوے فیصد مشترکات ہیں۔ آیئے ان مشترکات کے لئے مل کر کوشش کریں۔ آیئے یہ ملک خطرے میں مبتلا ہو چکا ہے یہ حکمران اس ملک کی کشتی کو ڈبونا چاہتے ہیں آیئے مل کر اس ملک کو بچائیں یہ ملک سازشوں اور سازشیوں میں گھر

چکا ہے یہ لوگ پاکستان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ اگر مخلص ہوتے تو پاکستان کو بچانے کے لئے سنجیدہ اور ٹھوس اقدامات کرتے۔ وہ ان کے لئے آمادہ نہیں ہیں یہ وقت گزارنے کے لئے پاکستان کو لوٹنے کے لئے اور اغیار کو ہدیہ اور تحفے میں دینے کے لئے آئے ہیں اور ایسا ہی کر رہے ہیں۔ آیئے ملک پاکستان کی حفاظت کریں۔ میں واضح اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی سرزمین کے ایک ایک انچ کو بچانے کے لئے جان کی قربانی دینا ہم اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد علی نقوی بہت قیمتی شخصیت تھے۔ میں ان کو جانتا ہوں وہ بہت جلد ہمیں چھوڑ گئے۔ وہ میرے معتمد ساتھی تھے لیکن ہمیں ایسی اور قربانیوں کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ہم ایسی قربانیوں سے گھبرانے والے نہیں ہیں ہم بڑی خندہ پیشانی اور خوشی کے ساتھ اسلام کے رستہ میں، پیغمبر اسلام کے راستہ میں، سید الشہداء کے راستہ میں، قربانیوں کو پیش کرنے کے لئے آمادہ ہیں اور ہماری یہ عظیم قربانی اسی راستہ کے لئے اور پاکستان کی سلامتی کے راستہ کی قربانی ہے۔

مجھے یہ سن کر افسوس ہوا ہے کہ کچھ لوگوں نے اس موقعہ سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ غلط کام انجام دیئے۔ میں ایسے عمل کی مذمت کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ شہید قائد سید عارف الحسینی جب شہید ہوئے تو ہم نے کسی مکتب فکر پر اس کی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ ہم نے اس وقت بھی احتجاج کیا تھا لیکن ایک پتہ بھی کسی درخت کا نہیں ہلا تھا۔ آج بھی جو لوگ ایسا کرتے ہیں عوام کی املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا حرام ہے اور جائز نہیں ہے کیونکہ قومی املاک اور شخصی املاک کو نقصان پہنچانے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ ہم اس کی اجازت دیتے ہیں اور نہ ہی اس کے لئے اکساتے ہیں۔ ہم ملک کے شریف اور مہذب شہری ہیں ہم نے شرافت اور تہذیب کے نمونے پیش کئے ہیں۔ ہم ملک کے وفادار ہیں۔ تہذیب کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ غلط فہمی میں ہیں وہ لوگ جو ہمیں اس مقام سے گرا کر نیچے لانا چاہتے ہیں۔

ان لوگوں کے مقابلہ میں جن کا نام کسی مہذب معاشرہ میں لینا درست نہیں ہے اصل میں حکمران، دہشت گردوں کو ہمارے مقابلہ میں نہیں لانا چاہتے۔ بلکہ وہ

اپنے راستے سے روڑے ہٹانا چاہتے ہیں۔

میں چیلنج کرتا ہوں کہ ہم ان کے راستے کا پتھر ہیں' ہم ان کے راستہ کی چٹان ہیں۔ ان کے عزائم کو کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ ہم نے اس کے نمونے اس ملک کے اندر بعض علاقوں میں پیش کئے ہیں اور آئندہ آنے والی مدت میں ایسے ہی اسلامی اقدار کے اعلیٰ نمونے پیش کریں گے۔ جس سے ان حکمرانوں کو اس ملک سے بھاگنا پڑے گا۔ یہ اس وقت بھاگے ہوئے تھے جب ہم ماضی کے آمر حکمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر رہے تھے اور انہی سڑکوں پر ہمارے ساتھی کوڑے کھا رہے تھے۔

ہمیں ملک کی سالمیت کی خاطر' وحدت کی خاطر' اتحاد کی خاطر کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا ہے جس سے ہماری سفید چادر پر کوئی بدنما داغ آجائے۔

میں اپیل کرتا ہوں کہ ان حساس لمحات میں صبر و حوصلہ کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ڈاکٹر محمد علی نقوی کی شہادت بہت بڑا المیہ ہے اس میں کربلا کے شہداء کو یاد کرتے ہوئے امام حسینؑ کے اسوہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس بڑی مصیبت کو برداشت کرنا ہے۔ میں ان کے اعزاء اور بیوہ سے کہوں گا کہ وہ کربلا کی خواتین کے صبر و حوصلہ کو یاد رکھتے ہوئے اس مصیبت کو انتہائی صبر و حوصلہ سے برداشت کریں۔

☆....☆....☆....☆....☆....☆....☆ ☆....☆....☆....☆

سفیر انقلاب کی شہادت کے بعد ملت جعفریہ کے خیر خواہ نوجوانوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ آپؒ نے ملت کے لئے جو بیسیوں منصوبے چلائے ہوئے تھے' تعلیم' جہیز' صحت اور روزگار کے لئے جو کوششیں کی ہوئی تھیں اب انہیں کون جاری رکھے گا' طلباء کے ہاتھوں سے کتاب کو کون گرنے نہ دے گا' ملت کی بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی ذمہ داری کون لے گا' بستر علالت پر تڑپنے والے افراد کی مسیحائی کون کرے گا' ضعیف والدین کے نوجوان سہاروں کو روزگار فراہم کرنے کا بیڑا کون اٹھائے گا' تنظیمی نوجوانوں کو روحانی غذا کون مہیا کرے گا' ظالم دشمن کا مقابلہ کون کرے گا' اپنی قوم کو احساس تحفظ کون بخشے گا' تنظیموں میں دینداری کو زندہ کون رکھے گا' خالصتاً خلوص کی بنیادوں پر اپنے قائد کے ہاتھ کون مضبوط کرے گا' اسلام کی خدمت کا مستقل جہاد

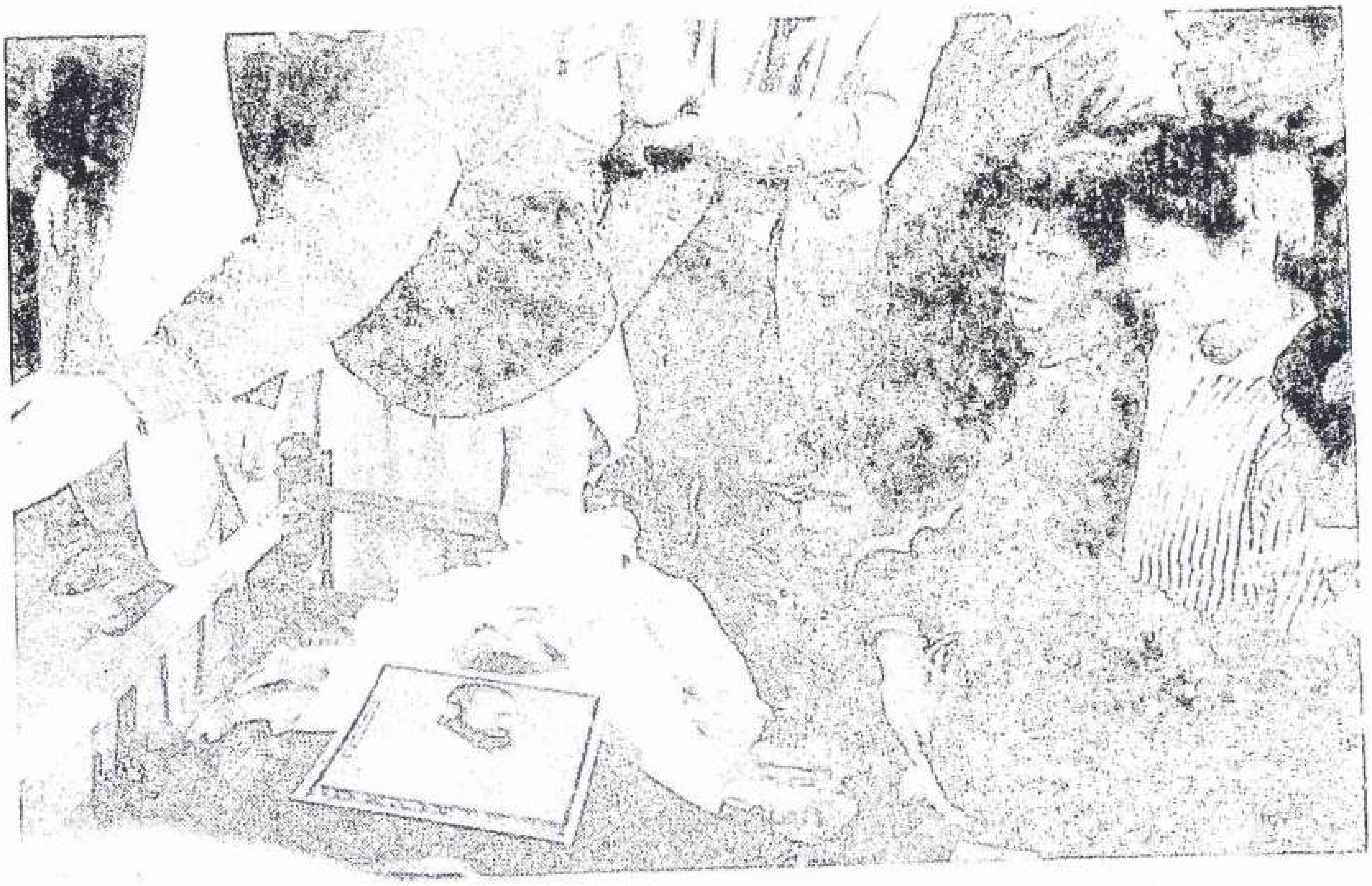

شہادت کے بعد شہید قائد کی خون آلود تصویر سینہ پر سجائے ہوئے

اک جنازہ اٹھا مقتل سے عجب شان کیساتھ
جیسے سج کر کسی فاتح کی سواری نکلے

کون جاری رکھے گا اور دنیا بھر کے مظلوم مسلمانوں سے رشتہ اخوت کون استوار کرے گا......؟ تھرتھراتے ہونٹوں پر صرف ایک سوال تھا۔

جہاں نہ تو نہ تیری یاد کے قدم ہونگے
ڈرا رہے ہیں وہی فاصلے سفر کے ہمیں

یہ وہ فکر تھی جو اہل درد کے دل و دماغ پر حاوی تھی مگر آپ کی شہادت کے دوسرے روز آپ کے تربیت یافتہ نوجوانوں کا اجتماع ہوا جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے نوجوانوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر آپؒ کے معتمد رفقاء جن کا آپ نے وصیت میں بھی ذکر فرمایا ہے اور آپ کے نظریاتی جانشین ہیں نے مرجھائے ہوئے چہروں اور بجھے دلوں کو ڈھارس دی اور ڈاکٹر صاحب کے جاری منصوبوں کو برقرار اور توانا رکھنے کا عہد کرنے کے ساتھ آپ کی وصیت کا مفہوم پیش کیا کہ۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

الحمد اللہ کہ یہ فرزندان اسلام اپنے سینکڑوں قابل اعتماد برادران کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کی راہ پر گامزن ہیں اور سفیر انقلاب بن کر اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ خدا ان برادران کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور انہیں نظریاتی سطح پر ڈاکٹر صاحب کا حقیقی پیرو بنائے۔

مجھے یقین ہے کہ جب تک یہ برادران ڈاکٹر صاحب کی فکر کے تابع رہیں گے ملک بھر کے ہزاروں نوجوان شہید نقویؒ کی طرح انہیں اپنے دلوں کی سلطنت کا شہنشاہ بنا دیں گے۔

آخر میں اپنی قوم پر واضح کرتا چلوں کہ جب تک اجالے اور اندھیرے کا سلسلہ جاری ہے حق و باطل کے درمیان رن پڑتا رہے گا۔ بقول شاعر کہ۔

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
وہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
ہم آگ بجھاتے پھرتے ہیں
وہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
ہم جوت جگاتے پھرتے ہیں

ہمارے لئے ظلم نئے ہیں نہ قربانیاں نئی .... زمانہ کو آگاہ رہنا چاہئے کہ ؎

ہم صلیبوں پہ چڑھے' زندہ گڑے' آگے بڑھے
رسم جو ہم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

ہمیں اپنی قربانیوں کا قطعاً" رنج نہیں بلکہ شہادتیں تو ہمارا افتخار ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری تاریخ زندہ ہے اور ہمیشہ انہی حادثوں نے ہمیں توانائی بخشی ہے۔ ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارا دشمن تاریخ سے نابلد ہے وہ بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی تقلید پر تو اتر آیا ہے مگر اس نے ایک لحظہ کے لئے بھی ہماری تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا کہ ہم اس دور میں کیسے زندہ رہے جب عزاداری سید الشہداؑ کی ایک مجلس برپا کرنے کے لئے جوان بیٹا ذبح کرانا پڑتا تھا .... حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے خطبہ زندہ رکھنے کی پاداش میں ہمیں دیواروں میں چنوایا جاتا تھا .... فاتحِ کربلا اور اسیر شام کی مظلومیت کا نوحہ سنانے کے جرم میں پس زندان دھکیلا جاتا تھا .... کلمہ حق کہنے

پر زبانیں نکلوائی جاتی تھیں ...... ماتم حسین علیہ السلام کی صدائیں بلند ہونے کے عوض میں ہمارے گھر جلائے جاتے تھے ...... حق اور باطل کی تمیز کرانے پر علماء کرام کا قتل عام ہوتا تھا اور محمدؐ و آل محمدؐ کے مشن کو زندہ رکھنے والے مؤرخین کے ہاتھ قلم کئے جاتے تھے ...... اور حسینیتؑ زندہ باد اور یذیدیت مردہ باد کا پرچار کرنے والے کربلا کے سفیروں کے سروں سے مقتل سجائے جاتے تھے......

ہم اس دور میں بھی زندہ رہے جب کئی کئی میلوں تک ہمیں کوئی اپنا دکھائی نہ دیتا تھا ...... ان حالات میں بھی ہم نے غم حسینؑ کی آہوں اور سسکیوں کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچایا اور ایک ریاست سے دوسری ریاست تک خون کی لکیر کھینچ کر گھروں کو امام بارگاہوں سے متصل کیا ...... یہ حق کی طاقت اور ہماری قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہر ملک پر حسینؑ کی حکمرانی ہے ...... کوئی بازاروں میں نکل کر ماتم کرتا ہے اور کوئی گھر کی چاردیواری میں اپنے پیغمبرؐ کے نواسہ کا غم مناتا ہے ...... کوئی خون بہاتا ہے اور کوئی اشک ...... غرضیکہ ہر وہ آنکھ آل محمدؐ کے غم میں اشک بار رہتی ہے جس میں اپنے نبیؐ کی تعظیم کا حیا باقی ہے اور ہر وہ دل خون روتا ہے جس پر "**لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ**" کا اثر موجود ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا دشمن فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے ...... "محمدؐ" کو روایتی انداز میں مان کر "آل محمدؐ" کا قتل اس کی سرشت میں شامل ہے۔ وہ بطخ کے بچے کی طرح ہے جو انڈے سے نکل کر فوراً پانی کا رخ کرتا ہے ...... ہمارا دشمن بھی بظاہر مسلمانوں کے گھر میں جنم لیتا ہے مگر وہ فطرت کے طفیل "آل محمدؐ" کی مخالفت کی راہ اختیار کرتا ہے۔

ہمارے سینے ظلم کے آگے بطور دیوار کام آتے ہیں ہم خنجر یا گولی سے ڈرنے والے نہیں مگر تاریخ سے بھٹکے ہوئے نادان دشمن سے اتنا کہتے ہیں کہ وہ ہمارے سینے چاک کرنے سے پہلے تاریخ کا دامن کھولے، تعصب کی عینک اتارے اور ہمارا تعارف پڑھے ہم کون ہیں ...... کن کے سفیر ہیں ...... تاریخ کو ہم نے کیسے زندہ رکھا اور کتنے جغرافیے بدلے۔ ہم نہ نسب سے شرمندہ ہیں اور نہ تاریخ سے ...... ہمارے قبیلے کے ششماہے بچے کا تبسم لاکھوں کی فوج پر غالب آیا ہے ...... شام غریباں کے

جلے ہوئے خیموں کی راکھ کی پرواز سے محلات لرزے ہیں .... ہمارے پس گردن بندھے ہوئے ہاتھوں سے بادشاہوں کے تخت کانپے ہیں اور ہماری صدائے حق سے مقتل اور زندان سہمے ہیں .... ہمیں اپنے بزرگوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہم نے ہر دور میں اسلام کا دفاع کیا ہے کیونکہ اس کی بقا پر ہمارے قبیلہ سے زیادہ خرچ کسی کا نہیں ہوا اور ہر حالت میں اپنے وطن کا استحکام پیش نظر رکھا ہے اور اس کے چپہ چپہ کے تحفظ کو اولین فریضہ جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے قیام پاکستان سے لے کر استحکام پاکستان تک اپنا سب کچھ قربان کیا ہے۔ ہم نے اپنے خون سے اس کی تاریخ لکھی ہے اور دنیا کے نقشہ پر فتح کی لکیریں کھینچی ہیں۔ مجھے یہ لکھنے میں باک نہیں کہ وطن عزیز کا قیام "محمد علی جناحؒ" اور استحکام ڈاکٹر محمد علی نقوی کے خون کا مرہون منت رہے گا۔

ہر وہ چہرہ جو اسلام میں انتشار پھیلانے کا مرتکب ہو گا یا وطن عزیز کے استحکام کو کمزور کرنے کی سازش کرے گا چاہے وہ سیاسی عدم استحکام کے حوالہ سے ہو یا سیاسی و مذہبی فرقہ واریت کی شکل میں، ہم سینہ سپر ہو کر اس کا پامردی سے مقابلہ کریں گے اور اپنے شہداء کی تاریخ کو زندہ رکھیں گے کہ۔

جب ساز سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے
جب پرچم جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تلک جلاد پہ ہیبت طاری ہے
زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے
ہم سہل انگار سہی لیکن کیوں اہل ہوس یہ بھول گئے
یہ خاک وطن ہے جاں اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

☆☆☆☆☆

سلام تجھ پر! کہ تو نے وفا کی لاج رکھی

قارئین! اگر سفیر انقلاب کی مجاہدانہ زندگی اور فاتحانہ موت پر مفصل تذکرہ کے بعد، شہید وفا آغا تقی حیدر کا ذکر نہ ہوا تو یہ نہ صرف کتاب کے عنوان کی تشنگی کا باعث بنے گا بلکہ وفا سے بھی نا انصافی ہو گی۔

شہادت گواہی کے مفہوم میں آتی ہے اور گواہی وفا کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اس بات کا ثبوت ۷ مارچ ۱۹۹۵ء کو وفا کے پیکر آغا تقی حیدر نے اپنے بازو کٹوا کر دیا۔ آغا تقی حیدر سفیر انقلاب سے پہلے شہید ہوئے اور اپنے جسم میں اپنے محبوب رہنما سے زیادہ گولیاں جذب کیں۔

شہید وفا تقی حیدر ۱۶ جولائی ۱۹۷۳ء کو امامیہ کالونی لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ نے میٹرک اپنے علاقہ کے ہائی اسکول سے کیا بعد ازاں ایف۔اے کے لئے کالج میں داخلہ لے لیا اور مذہب سے قلبی لگاؤ کی بدولت قومیات میں متحرک ہو گئے۔ آپ کے بڑے بھائیوں نے چمڑے کا کارخانہ لگایا تو انہیں آپ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گھر والوں کے اصرار پر آپ کو تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا مگر اپنے کارخانہ میں کام کرنے کی بجائے آپ کا رجحان قومی خدمت کی طرف مائل رہا۔

ملکی حالات کی تلخیوں کے پیش نظر آپ نے امامیہ کالونی میں اپنی ملت کے دفاع اور اتحاد بین المسلمین کے پرچار کے لئے "پاسبان" میں شمولیت اختیار کی تو تھوڑے عرصہ بعد آپ کو خلوص اور شجاعت کی بناء پر تحصیل کی سطح پر مسئولیت سونپی گئی۔ اسی دوران میں آپ کی والدہ کی طبیعت ناساز ہوئی تو آپ انہیں ڈاکٹر محمد علی نقوی کے کلینک پر لے آئے۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چند لمحے گزارنے کے بعد تقی حیدر بظاہر بچھڑ گئے مگر دل سے جدا نہ ہو سکے۔ اس کے بعد ایک دو مرتبہ عقیدتاً" ڈاکٹر صاحب

سے ملنے آئے اور یوں ان کی ذات میں ضم ہوتے چلے گئے۔

سفیر انقلاب کے سر پر خطرات کے سائے منڈلانے لگے تو آپ کے قریبی رفقاء نے آپ کے محافظین کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے اتفاق نہ کیا اور بدستور کہتے رہے کہ " موت کا ایک روز اٹل ہے اور تدبیریں ' تقدیر کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتیں۔" مگر احباب کا اصرار رہا کہ " ڈاکٹر صاحب آپ اپنے لئے نہیں قوم کے لئے جی لیں۔"

بالاخر سفیر انقلاب محافظین رکھنے پر آمادہ ہوگئے مگر انہوں نے محافظین کے انتخاب کو اپنے تک محدود رکھا۔ اس سلسلہ میں تقریباً دس پندرہ معتمد نوجوان مختلف علاقوں سے آئے مگر ڈاکٹر صاحب کی دور اندیش نظروں میں کوئی نہ جچا۔ ڈاکٹر صاحب کو خدا نے اس صلاحیت سے نوازا تھا کہ آنکھوں کے دروازوں سے دل میں اترتے تھے اور دل کی کتاب کا مطالعہ چہرے کے تاثرات سے کرتے تھے۔ چونکہ آپ کا سلسلہ نسب کربلا سے ملتا تھا اور منزل آپ کے سامنے تھی اس لئے آپ بھی اس حقیقت کے قائل تھے کہ

بجھے چراغ پہ ہم دوستی پرکھتے ہیں
یہ رسم ! اپنے قبیلے میں ابتداء سے ہے

ایک شام اپنے محبوب کا محافظ بننے کی غرض سے آغا تقی حیدر بھی آئے۔ چند لمحے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بیٹھے اور یوں ایک دوسرے کے ہوگئے۔ سفیر انقلاب نے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ سجا کر تقی حیدر کو ساتھ رکھنے کی آمادگی کا اظہار کیا اور تقی حیدر نے فرزند اسلام کی حفاظت کرنے کو افتخار جان کر عزم وفا کر لیا۔

آغا تقی حیدر گھر گئے اور الوداع کر کے راہی شہادت ہوگئے۔ جن احباب نے آپ کو قریب سے دیکھا وہ اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ تقی حیدر اپنے محبوب کے گرد ہمیشہ دیوانہ وار گھومتے رہے۔ آپ کا معمول تھا کہ اسپتال ' دفتر ' کلینک یا گھر کے گرد عقابی نظروں کے ساتھ گشت کرتے اور ڈاکٹر صاحب کو جس راہ سے گزرنا ہوتا تھا اس کا

جائزہ لیتے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب عام طور پر ۱۸ گھنٹے مسلسل کام کرنے کے عادی تھے اس لئے تقی حیدر کو ۱۸ گھنٹے سے زیادہ جاگنا اور متحرک رہنا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پرائیویٹ دفتر کے باورچی نے بتایا کہ تقی حیدر بعض اوقات بے حد تھکے ہوتے تھے۔ جونہی ڈاکٹر صاحب اپنے دفتر میں دیگر احباب کے ساتھ بیٹھ جاتے تو تقی حیدر غیر محسوس انداز میں کچن میں ایک چادر بچھا کر چند لمحوں کے لئے سو جاتے تھے البتہ باورچی کو تاکید کرتے کہ ڈاکٹر صاحب کے دفتر سے نکلنے سے قبل انہیں جگا دیا کریں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ شہید وفا ابھی سوئے ہی ہوتے کہ ڈاکٹر صاحب دفتر سے باہر جانے کا ارادہ کر لیتے یوں آپ کو جگایا جاتا تو آپ تڑپ کر اٹھتے اور فوراً منہ دھو کر سفیر انقلاب سے آگے گیٹ پر نکل آتے اور اپنی تھکاوٹ محسوس نہ ہونے دیتے۔

ایک مرتبہ آپ ہسپتال کے گیٹ پر کھڑے تھے میں نے کہا "تقی بھائی خیال کرنا قوم کی امانت آپ کے پاس ہے" یہ سنتے ہی کہنے لگے "زندگی کی آخری سانس تک قوم کو ڈاکٹر صاحب کی حفاظت کی ضمانت دیتا ہوں۔" چند روز بعد ڈاکٹر صاحب اور راقم کو اسلام آباد جانا پڑا تو تقی حیدر اپنے محبوب کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے اور روانگی سے قبل مجھے علیحدگی میں کہا" آج ہماری امانت آپ کے پاس ہے خیال رکھنا" تقی حیدر کے یہ جملے میرے دل میں اترے اور لفظ "امانت" لاہور واپسی تک میرے ذہن میں گھومتا رہا۔

آپ کے گھر والوں نے بتایا کہ آپ والدہ سے ملنے چند لمحوں کے لئے آتے اور فوراً" ڈاکٹر صاحب کے پاس واپس چلے جاتے۔ کئی بار گھر والوں نے ایک دو روز گھر گزارنے کی خواہش کا اظہار کیا مگر آپ نے کہا" ڈاکٹر صاحب اکیلے ہو جائیں گے۔" عید کے موقع پر ڈاکٹر صاحب نے آپ کو تین چار روز گھر گزارنے کی تاکید کی مگر آپ ایک روز کے بعد واپس آگئے اور کہنے لگے" مجھے آپ کے بغیر قرار نہیں آتا۔"

ایک مرتبہ آپ گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے فون پر اطلاع دی کہ ڈاکٹر صاحب قتل ہو گئے ہیں یہ سنتے ہی آپ نے اطمینان سے کہا"یہ ممکن نہیں ہے کہ میں

زندہ ہوں اور ڈاکٹر صاحب کو کوئی قتل کردے۔"

آپ کے بھائیوں نے ایک مرحلہ پر آپ سے درخواست کی کہ ڈاکٹر صاحب سے دو چار ماہ کی چھٹی لے کر گھر آجائیں اور اپنے کارخانہ کو منظم اور رواں کریں مگر آپ نے جواباً" کہا" ذاتی کارخانہ کی بجائے قومی کارخانہ کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔"

شہادت کے روز آپ سفیر انقلاب کے ساتھ گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے کہ دہشت گردوں نے سب سے پہلے آپ کو نشانہ بنایا اور کلا شنکوف کے کئی برسٹ مار کر آپ کو چھلنی کیا چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ جب ڈاکٹر صاحب کی گاڑی بے پناہ رش اور گاڑیوں میں پھنسی تو موٹر سائیکل پر سوار ایک شخص نے پیچھے سے پستول کا فائر کیا جونہی تقی حیدر پیچھے کی سمت متوجہ ہوئے تو دو کلا شنکوف بردار سامنے آئے اور انہوں نے سب سے پہلے تقی حیدر اور پھر ڈاکٹر صاحب کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا۔

جائے حادثہ پر موجود ایک خاتون نے روایت کی کہ نوجوان (تقی حیدر) فائرنگ کے دوران کبھی ہاتھ اٹھا کر گولیاں روکتا تھا اور کبھی اپنے دائیں بیٹھے ہوئے شخص پر گرتا تھا۔ آپ کو غسل دیتے وقت یہ حقیقت سامنے آئی کہ آپ کے بازو کٹے ہوئے تھے اور آپ کے جسم پر کم و بیش چالیس کے قریب گولیوں کے زخم تھے۔ جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ آپ اپنے محبوب کو بچانے کے لئے ان پر بار بار گرتے رہے۔

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب پہلے حملہ میں بچ گئے تھے قاتلوں نے جاتے جاتے محسوس کیا کہ ان کا اصل نشانہ ابھی زندہ ہے تو وہ واپس لوٹے اور انہوں نے پھر سے برسٹ مار کر ڈاکٹر صاحب کو شہید کیا۔

شہید وفا کی اس وفا کو دیکھ کر ان کے وہ جملے یاد آئے کہ زندگی کی آخری سانس تک قوم کو ڈاکٹر صاحب کی زندگی کی ضمانت دیتا ہوں۔ یا یہ ممکن نہیں کہ میرے ہوتے ہوئے کوئی ڈاکٹر صاحب کو قتل کر دے۔

آغا تقی حیدر نہ صرف اپنے رب اور قوم کے رو برو سرخرو ہوئے بلکہ انہوں نے

حضرت ابو طالب علیہ السلام سے شروع ہونے والی پاک وفاؤں کی لاج رکھی۔ شہید پرور قوم تقی حیدر کی وفاؤں کو تازیست سلام کرتی رہے گی اور ان کے والدین کی عظمتوں کو تاریخ اپنے دامن میں محفوظ رکھے گی جو اپنے بیس سالہ خوبصورت جوان بیٹے کی میت پر رونے کی بجائے قوم کو ڈاکٹر صاحب کا پرسہ دیتے رہے۔ ماں نے چار دیواری کے اندر تقی حیدر کا آخری بوسہ لیتے ہوئے فرمایا "تم نے کربلا کے شہید وفا کی یاد تازہ کرکے میرے دودھ کی لاج رکھ لی ہے اب میں روز محشر حضرت عباس علمدار علیہ السلام کی ماں کے رو برو سرخرو رہوں گی کہ میرے بیٹے نے فرزند رسول کو بچانے کے لئے اپنے بازو کٹوائے تھے۔" اور بوڑھے باپ نے ناصر باغ لاہور میں ہزاروں ماتمیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "میں معذرت خواہ اور شرمسار ہوں کہ میرا بیٹا ڈاکٹر صاحب کو نہیں بچا سکا۔"

اے شہید وفا! تمہیں تمہارے بھائی سلام کہتے ہیں کہ تو نے شہادت کی داستان مکمل کی ہے۔ جب تک سفیر انقلاب کا نام زندہ رہے گا تمہارا نام بھی اسی طرح زندہ و تابندہ رہے گا اور کہیں بھی سفیر انقلاب کا ذکر شہید وفا کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو گا۔

جب ذکر وفاؤں کا گلستاں میں چھڑے گا
برسوں تجھے گلشن کی فضا روتی رہے گی

اے تقی حیدر! آپ نے اپنے ساتھیوں پر نہیں بلکہ قاتل پر وفا کے اثرات مرتب کئے ہیں آپ نے قاتل پر واضح کیا ہے کہ تم جس قوم کے فرزند ہو وہ شہادت کو اپنی میراث سمجھتی ہے اور عارضی زندگی کو سرخ موت پر ترجیح نہیں دیتی۔ تمہاری وفا نے زمانہ پر ثابت کیا کہ واقعاً"..........!

تم پرچم عباسؑ کے سایہ میں پلے تھے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شہادت کیا ہے اور شہید کا رتبہ کیا ہے........؟

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ہم "شہادت" اور "عام موت" کے درمیان فرق محسوس نہیں کرتے بلکہ "شہادت" کو جان کا ضیاع سمجھتے ہیں جس پر نوحہ و ماتم کے علاوہ طویل عرصہ تک افسوس کرتے رہتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی شہادت کے بعد بھی حسب معمول بظاہر باشعور چنداں افراد سے یہ سننے کا موقع بھی ملا کہ "ڈاکٹر صاحب تحریک جعفریہ میں فعالیت اور آئی۔ ایس۔ او کی سرپرستی کی بدولت مارے گئے .... وہ ڈاکٹر بنے مگر اپنی زندگی کو آسودہ نہ کر سکے .... اپنے بچوں کو پروان نہ چڑھا سکے .... اہل و عیال کو تنگدست چھوڑ گئے .... بے چارے یہ ہوئے بے چارے وہ ہوئے وغیرہ وغیرہ۔

اگرچہ یہ ہمدرد لوگ اپنی گفتگو کو ان کی شہادت پر منتج کرتے تھے تاہم ان کے چہرے پر طاری اداسی اور لہجے کی مایوسی یہ ظاہر کرتی تھی کہ ان کے خیال میں ایک بے مقصد اور بے سود کام ہو گیا ہے اور ایک قیمتی جان ضائع چلی گئی ہے۔

ان حضرات کے مقابلے میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ڈاکٹر صاحب کی جدائی کا غم نڈھال کئے جا رہا تھا مگر وہ آپؒ کی شہادت پر رشک کر رہے تھے کہ ان کا ایک ساتھی خدا کے بہت قریب چلا گیا ہے اور اس نے اپنی منزل پا لی ہے۔

چونکہ ہمارے معاشرہ بالخصوص پاکستان میں "شہید" کی منزلت کا ادراک کم ہے اور شہادتوں کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے لوگ "شہید" کے لفظ سے جی کو تو مطمئن کر لیتے ہیں جبکہ اس کے برعکس وہ شہید کی موت پر بے حد افسردہ اور مایوس ہوتے ہیں۔

فروری ۱۹۷۹ء میں ہمارے پڑوسی اور اسلامی ملک ایران میں اسلامی انقلاب کا جو سرخرو سورج طلوع ہوا اس کی سرخی ہزاروں شہدا کی مرہون منت تھی۔ ایران کے عوام کے جذبہ شہادت کا واقعہ ایک دوست نے نقل کیا کہ جب عراق کی جارحیت کے

خلاف ایرانی نوجوان محاذ کی طرف رواں دواں تھے اس وقت ہر نوجوان کی کوشش تھی کہ اسے کسی لشکر میں شامل ہونے کی اجازت مل جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم پاکستانی دوست حضرت امام رضا علیہ السلام کے روضہ کے قریب بیٹھے تھے کہ ایرانی نوجوانوں کا ایک گروہ دوڑتا ہوا آیا اور ہجوم کا سینہ چیر کر امامؑ کی مرقد سے لپٹ کر "شہادت" کی دعائیں مانگنے لگا۔ یہ نوجوان لشکر امام مہدیؑ کے سپاہی تھے جو جذبہ شہادت سے سر شار محاذ جنگ کی جانب جھومتے جا رہے تھے۔

جب یہ لشکر دعا و مناجات کے بعد روضہ امامؑ سے رخصت ہونے لگا تو لوگوں نے قطاروں میں کھڑے ہو کر ان پر بے پناہ گل پاشی کی .... ان پر عطر کے چھڑکاؤ کیئے .... ان کے راستے میں دنبے ذبح کیئے اور ان کے لئے فتح اور شہادت کی دعا کی۔

جب یہ کاروان اسٹیشن پر پہنچا تو ان کو رخصت کرنے کے لئے دور دراز کے رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ محاذ پر جانے والوں نے اپنے تمام عزیز و اقارب کو چند روز پہلے مطلع کیا تھا اس لئے ان کے رشتہ دار ان کے لئے سرخ پھولوں کے ہار اور تحائف لائے تھے۔ کسی چہرے پر نام تک کی اداسی کا گمان نہ تھا........ مجاہدین اور لواحقین کے چہرے سرخ پھولوں کے درمیان چاند کی چاندنی کی طرح چمک رہے تھے۔

دوست نے مزید بتایا کہ چونکہ ہمارا مزاج پاکستانی تھا اس لئے یہ منظر دیکھ کر ہماری آنکھیں چھلک پڑیں اور ہم مجاہدین کے لواحقین کے ایسے جھرمٹ میں چلے گئے جہاں دو چار خواتین اور ایک معذور ضعیف شخص کھڑے تھے۔ ہم نے ماجرا پوچھا تو معذور ضعیف گویا ہوئے کہ "آج لشکر امام مہدی علیہ السلام کی روانگی ہے ہمارے گھرانے کی خوش قسمتی ہے کہ آج ہمارے آخری بیٹے کو اس لشکر میں شامل ہونے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ اس سے پہلے میرے دو بڑے بیٹے محاذ پر شہید ہو چکے ہیں جبکہ ایک محاذ پر میری ٹانگ بھی کٹ چکی ہے" ضعیف عمر اور بظاہر بے سہارا والد بار بار دعا کے لئے ہاتھ اٹھا رہا تھا........ اسی طرح اس کی ضعیف والدہ اپنا دامن پھیلا کر خدا سے دعا مانگتی تھی کہ "اے خدا بصدقہ امام مہدیؑ و بصدقہ زہرا سلام اللہ علیہا ہمیں

اس کربلا میں سرخرو فرماتا۔"

شہید پرور والدین کے چہرے پر مو برابر ملال نہ تھا بلکہ معذور والد بار بار اپنی بدقسمتی کا تذکرہ بھی کرتا تھا کہ وہ محاذ پر شہید نہیں ہو سکا اور یوں وہ قربت خداوندی کے حصول میں ناکام رہا ہے۔

پاکستانی دوست وہاں کے شہدا کے گھروں تک بھی پہنچے تاکہ شہداء کی آمد پر لواحقین کا رویہ جانچ سکیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب گھر والوں کو شہید فاؤنڈیشن یا دیگر اداروں سے شہید کی خبر موصول ہوتی تو تمام گھر والے نماز شکرانہ ادا کرتے اور پھر شہید کے استقبال کے لئے اپنے گھر کی گلیاں سجانے لگتے۔ دور دور تک بجلی کے قمقمے لگاتے .... پھولوں کی ٹوکریاں لٹکاتے .... استقبالی ترانے گاتے .... خوش آمدید کے بینرز آویزاں کرتے اور امام خمینیؒ کی تصویر گھروں کے دروازوں پر سجا دیتے۔

محلّہ داروں کی یہ صورتحال تھی کہ وہ شہید کے والدین سے گلے ملتے درود پڑھتے اور خوشی سے ان کی پیشانی کو بوسہ دے کر مبارک دیتے جب کہ شہید کے لواحقین شہید پرور گھرانے کا اعزاز ملنے پر بے حد نازاں ہوتے۔

یہ حقیقت جان کر ہمیں تجسس ہوتا ہے کہ وہاں یہ سب کچھ کس لیے تھا تو اس ضمن میں واضح رہے کہ ایران کے عوام اسلام کی بقاء کے نظریہ سے بڑے واضح تھے اور وہ قرآن مجید' احادیث اور فرمودات آئمہ طاہرینؑ کی روشنی میں شہادت کا ادراک رکھتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ "شہید کا براہ راست خدا سے تعلق ہوتا ہے اور اس کے خون کی وجہ سے اس کے لواحقین تک بخشے جاتے ہیں۔

وہ اس بات کا شعور رکھتے تھے کہ خدا کی راہ میں جہاد' اس کے دین کی ترویج اور بقاء اور وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے مارے جانے یا مرجانے کا نام "شہادت" ہے۔

قرآن مجید کی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۷ میں ارشاد باری ہے کہ "اگر تم خدا کی راہ میں مارے جاؤ تو ان لوگوں سے بدرجہا بہتر ہو جو دنیا میں مال و متاع جمع کرتے ہیں"۔

"شہادت" بلاشبہ موت کی قسم ہے جس سے انسان اسی دنیا سے ناطہ توڑ کر ہمیشہ

کے لئے چلا جاتا ہے۔ مگر "عام موت" سے مختلف بھی ہے کہ شہید سفر کے اگلے مرحلہ میں داخل ہوجاتا ہے یہاں وہ زندہ لوگوں کی طرح اپنا سفر جاری رکھتا ہے .... خدا سے اس کا براہ راست رشتہ ہوتا ہے اور اسے خدا سے روزی ملتی ہے البتہ اس کے لئے شعور بہت ضروری ہے۔

صدر اسلام میں جب لوگ رسول خداؐ کے ساتھ جہاد کی طرف جاتے اور شہید ہوجاتے تو ان کے عزیز و اقارب (کفار)، طرح طرح کی باتیں بناتے قرآن مجید فرماتا ہے "اے رسولؐ" جن لوگوں نے خدا کی راہ میں قربانیاں دیں ان کے بھائی کہتے ہیں کہ اگر یہ ہمارا کہا مانتے تو قتل نہ ہوتے .... ان سے کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو پھر اپنے اوپر سے موت کو ٹال دینا .... جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے انہیں مردہ نہ سمجھنا وہ زندہ ہیں اور خدا سے روزی پاتے ہیں .... جو کچھ خدا نے انہیں انعام (شہادت) عطا کیا ہے وہ اس پر بے حد خوش ہیں (سورۃ آل عمران ۱۷۰۔۱۶۷)

"شہادت" خدا کا ایک منفرد انعام ہے جو خدا کے محبوب لوگوں کو عطا ہوتا ہے جن کے بارے میں خدا خود فرماتا ہے کہ "خدا مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا" (سورۃ آل عمران ۱۷۰)

قرآن مجید کی روشنی میں جب واضح ہوتا ہے کہ "شہادت" خدا کا انعام ہے اور ہمیشہ انعام اسے دیا جاتا ہے جس کی کارکردگی بہتر ہو اور انعام دینے والا اس سے راضی ہو .... شاید یہی وجہ تھی کہ امام اول حضرت علی علیہ السلام نے بوقت ضربت بلند آواز میں یقین سے فرمایا "**فزت برب الکعبہ**" (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہوگیا) حالانکہ آپؑ نے بڑے بڑے معرکے سر کئے۔ جنگ خندق میں عمر بن عبدوود پر آپؑ کی ضرب ثقلین کی عبادت سے افضل ٹھہری .... آپؑ نے حالت رکوع میں زکواۃ دی اور قرآن کی آیت نازل ہوئی .... آپؑ کے گھرانہ پر درود نازل ہوا مگر آپؑ نے کہیں بھی اپنی کامیابی کا نعرہ بلند نہ کیا مگر جیسے ہی شہادت کا انعام حاصل ہوا "**فزت برب الکعبہ**" کا نعرہ بے اختیار لبوں سے چھلک گیا۔

شہید کا رتبہ :۔

حدیث نبوی ہے کہ "شہید" کی سات صفات ہیں اس کی پہلی صفت یہ ہے (۱) جب اس کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتا ہے خدا اس کے بدلے اس کے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔ (۲) شہید کا سر زمین پر نہیں لگتا بلکہ وہ حوروں کی گود میں گرتا ہے۔ (۳) اسے فوراً جنت کی پوشاک پہنا دی جاتی ہے۔ (۴) اسے جنت میں مخصوص (رہائش گاہ) دکھا دی جاتی ہے۔ (۵) اس کی نظروں کے سامنے جنت کے تمام پھول لائے جاتے ہیں جنہیں وہ پسند کرتا ہے اس کی رہائش گاہ پر لگا دیئے جاتے ہیں۔ (۶) اس کی روح کو جنت میں گھومنے پھرنے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ (۷) شہید کا خدا سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔

فرمان معصومؑ ہے کہ شہید پر جب تلوار، تیر یا خنجر چلتا ہے تو اس کے گرد خدا کے نور کی چادر پھیل جاتی ہے اور اس نور میں اس قدر مخمور ہو جاتا ہے کہ اسے اپنے جسم کے کٹنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے نور کا واقعہ ہے کہ ان کے نور میں مدہوش ہو کر خواتین اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھی تھیں مگر انہیں احساس تک نہ ہوا تھا۔

ذیل میں شہید مرتضیٰ مطہری کے "فلسفہ شہادت" سے اقتباسات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں کیونکہ ان سے بہتر کوئی شخص اس موضوع پر بحث نہیں کر سکتا۔

شہید کی خدا سے قربت:۔

فرمان معصومؑ ہے "شہید کی روح کو فرشتے جنت کے پہلے مرحلہ میں لے جاتے ہیں تو اسے قرار نہیں آتا........ پھر فرشتے اسے دوسرے مرحلہ میں لے جاتے ہیں وہاں بھی اس کی روح بے قرار رہتی ہے یہاں تک کہ جنت کے آخری درجہ میں بھی روح کو تسکین نہیں پہنچتی .... آخر کار فرشتے اسے جنت کے مدارج کے خاتمہ کے بعد اس سے آگے "**لقاء اللہ**" (خدا سے ملاقات کا دائرہ) میں لے جاتے ہیں جہاں اس کی بے قراری کو قرار آجاتا ہے۔ شہید مطہری فرماتے ہیں "چونکہ شہید نے جنت کے لئے جان نہیں دی ہوتی بلکہ خدا کے لئے جان قربان کی ہوتی ہے اس لئے اسے جنت میں نہیں بلکہ "**لقاء اللہ**" میں قرار نصیب ہوتا ہے۔

شہید کا تقدس:۔

کسی شخص کا محض قتل ہونا تقدس کی بنیاد نہیں بن سکتا بلکہ بعض اوقات موت افتخار کی بجائے ذلت کا موجب بن جاتی ہے۔ جیسے خودکشی یا جرم کے نتیجہ کی سزا ہے مگر شہید اس لئے مقدس ہوتا ہے کہ وہ مقدس مقصد کے حصول کے کی خاطر یا قرآنی الفاظ میں "**فی سبیل اللہ**" اپنی جان داؤ پر لگا لیتا ہے۔

شہید کے تقدس کے دو پہلو ہوتے ہیں اول یہ کہ وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کرتا ہے دوم یہ کہ اس کی قربانی پورے شعور کے ساتھ برضا و رغبت ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

شہید بحیثیت فاتح :۔

فتح ایک بہت بڑا انعام، سرخروی اور اعزاز ہے۔ محض کسی ریاست یا مال و زر کو فتح کرنا اعزاز نہیں بلکہ حقیقی فتح نظریہ کی کامیابی ہوتی ہے۔ فاتح اس لئے فاتح ہوتا ہے کہ دشمن اس کے نظریات کے مقابلہ کا حوصلہ نہیں رکھتا اور پھر اس کے نظریات کی فتح کو گوارہ بھی نہیں کرتا جس کے باعث وہ اسے قتل کرتا ہے۔ مگر شہید کا خون اس کی زندگی سے زیادہ طاقتور بن کر ابھرتا ہے اور ہر شخص قاتل کو مجرم، سفاک اور درندہ سمجھتا ہے۔ مقتول کی شہادت قابل تحسین عمل بن جاتی ہے جو اسے فاتح بنا دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت امام حسین علیہ السلام کی قربانی اور شہادت ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے باوجود بھی حسینؑ زندہ باد اور یزید مردہ باد ہے۔

شہید کا اعزاز :۔

شہید کو یہ اعزاز حاصل ہوتا ہے کہ قبر میں اس کی آزمائش نہیں ہوتی یعنی اسے قبر و برزخ کے سوال و جواب کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ حدیث نبویؐ ہے کہ "شہید کے سر پر تلوار کی چمک سے اس کی آزمائش ہو چکی ہوتی ہے اور وہ پہلے ہی سوالوں کا جواب دے چکا ہوتا ہے"۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شہید عملی طور پر اپنے ایمان کی صداقت ثابت کر چکا ہوتا ہے اس لئے عالم برزخ میں اس سے مزید سوال پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

علاوہ ازیں شہادت ایک ایسا اعزاز ہے کہ اسلام میں جب کسی قابل تعریف مرتبے یا فعل کو سراہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو شہید کا رتبہ حاصل ہے یا کہ فلاں فعل اس قابل ہے کہ اسے شہادت کا اجر دیا جائے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم حق کی تلاش میں نکلتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اسی دوران میں مرگیا تو

"شہید" کی موت مرے گا یا حدیث میں ہے کہ "جو شخص محمدؐ و آل محمدؐ کی محبت پر فوت ہوا ہو وہ "شہید" مرا۔ ایک جگہ ارشاد نبویؐ ہے کہ جو شخص اپنا اور اپنے اہل خاندان کا پیٹ پالنے کے لئے محنت کرتا ہے اور زحمات اٹھاتا ہے تو وہ ایک ایسے شخص کی مانند ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے۔

شہید کے لفظ کے گرد تقدس کا جو ہالہ بنا ہوا ہے وہ کسی اور لفظ کے گرد نہیں ملتا۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہیرو سے بڑھ کر ایک ہیرو ہے مگر شہید لفظ کا کوئی نعم البدل نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کا قول ہے کہ "اللہ تعالی قیامت کے روز شہدا کو اس شان و شوکت اور عظمت و نورانیت کے ساتھ سامنے لائے گا کہ انبیاء کرام اگر سوار ہوں گے تو ان کی تعظیم کی خاطر اپنی سواریوں سے نیچے اتر پڑیں گے"

شہید کا خون:۔

حدیث پاک میں ہے کہ "اللہ کسی قطرے کو اتنا پسند نہیں کرتا جتنا کہ اس خون کے قطرہ کو جو اس کی راہ میں بہتا ہے"

شہید کا خون کبھی رائیگاں نہیں جاتا بلکہ اس کے خون کے قطرے دریا کا روپ دھار کر قوم کے ابدان میں منتقل ہو جاتے ہیں گویا "شہادت" ایک معاشرے کے بدن میں خون کا انتقال ہے اسلیئے کہا جاتا ہے کہ

شہید کی جو موت ہے
وہ قوم کی حیات ہے

شہید کا خون اس قدر خدا کو پسند ہے کہ اس کے بارے میں احکامات ہیں کہ "شہید" کو بغیر غسل و کفن دفنا دیا جائے کیونکہ شہید کا بدن "متروح" ہوتا ہے یعنی

اس پر روح کے احکام جاری ہوتے ہیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی کھلاڑی یا ہیرو اپنا انعام وصول کرتا ہے تو اپنے لباس میں ہوتا ہے جو اس کی پہچان ہوتا ہے لہٰذا ''شہید'' بھی خدا سے جب ملاقات کرتا ہے تو وہ سرخرو چہرے اور رنگین لباس کے ساتھ حاضر ہوتا ہے۔

شہید کی ولولہ انگیزی:۔

''شہید'' کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قوم میں ہمت اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔ جن قوموں میں جوش بالخصوص الٰہی جذبہ کی روح مرجاتی ہے ''شہید'' ان کے اندر دوبارہ دلاوری، صبر، ہمت اور جوش پیدا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام کو ہمیشہ شہدا کی ضرورت رہی ہے۔ مشہور فلسفی اور مؤرخ ویل ڈیورینٹ (WILL DURANT) اپنی کتاب ''تاریخ تمدن'' میں رقمطراز ہے کہ ''اپنی قوم کو زندہ رکھنے اور انہیں طاقت بخشنے کے لئے جتنا زور اسلام نے اپنے پیروٴں پر دیا ہے اتنا کسی اور مذہب نے نہیں دیا''

شہید کا جاودانی ہونا:۔

جس طرح ایک عالم اپنے علم، موجد اپنی ایجاد، شاعر اپنے اشعار اور معلم اپنے اخلاق کی بدولت معاشرے میں پیوست ہوجاتا ہے اور ان کی انفرادیت انہیں زندہ جاوید بنا دیتی ہے اور وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح ''شہید'' بھی اپنے خون کے ذریعہ معاشرہ میں لافانی زندگی حاصل کرتا ہے اور وہ معاشرہ میں ہمیشہ باقی رہنے والا خون پیدا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا قسم کے لوگ در اصل اپنے اثاثہ کے ایک حصہ کو جاودانی بناتے ہیں

جبکہ شہید اپنے پورے اثاثہ کو لافانی بنا دیتا ہے اس لئے رسول پاکؐ کا فرمان ہے کہ "ہر نیکو کار کار سے بڑھ کر ایک اور نیکو کار ہے مگر شہید سے بڑھ کر کوئی اور نیکو کار نہیں"

شہید کی شفاعت :۔

ایک حدیث کے مطابق تین اقسام کے لوگ یعنی انبیاء کرامؑ علما اور شہداء قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے دوسروں کی شفاعت کریں گے (علماء سے مراد علما ربانی ہیں جن میں سب سے پہلے ائمہ اطہارؑ شامل ہیں اور پھر وہ علماء جو ان کی پیروی کرتے ہیں)

شہداء کو لوگوں کی شفاعت کا حق اس لئے حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی مظلوموں، محروموں اور بے کسوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قربان کی اور ہمیشہ ان کی مدد پر کمر بستہ رہے اس لئے انہیں اگلی دنیا میں لوگوں کی شفاعت کی اجازت دی جائے گی۔

جیسا کہ حدیث نبویؐ میں ہے کہ خداوند کریم شہید کے پہلے خون کے قطرے کے گرنے پر اس کے تمام گناہ معاف کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہید کا باقی خون نسلوں کی بخشش کا باعث بنتا ہے۔

شہید کا ماتم :۔

صدر اسلام میں جو لوگ رسول پاکؐ کے دور میں شہید ہوئے ان میں آنحضرتؐ کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلبؓ کا نام سر فہرست ہے۔ انہوں نے جنگ احد میں شہادت پائی اور "سیدالشہدا" کا لقب پایا۔

جب حضرت حمزہؓ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تو اس وقت تنہا تھے اور کوئی شخص ان کے ساتھ ان کے گھر میں نہیں تھا۔ جب رسول اکرمؐ احد سے واپس مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ حضرت حمزہؓ کے گھر کے سوا تمام شہداء کے گھروں میں گریہ و ماتم ہو رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر آپؐ نے حسرت بھرا جملہ ادا فرمایا

"**اما حمزۃ فلا بواکی لہ**""کیا حمزہ کو رونے والا کوئی نہیں ہے"

صحابہ کرام یہ جملہ سن کر اپنے گھروں کو گئے اور اپنے بچوں اور عورتوں کو حضرت حمزہؓ کے گھر لے آئے اور انہوں نے رسول پاکؐ کی خواہش کا احترام کر کے آپؐ کے چچا پر ماتم کیا۔ اس کے بعد یہ رسم بن گئی جو گھرانہ بھی اپنے شہید کا گریہ و ماتم کرنا چاہتا وہ پہلے سید الشہدا حضرت حمزہؓ کے گھر جا کر ان کا ماتم کرتا۔

امام حسین علیہ السلام کی قربانی کے بعد جب یہ ثابت ہو گیا کہ امامؑ کی قربانی "**لا الہ الا اللہ**" کی بنا ٹھہری ہے اور اس خون سے خدا کا دین محفوظ ہو گیا تو پھر "سید الشہدا" کا لقب حضرت امام حسین علیہ السلام کو حاصل ہو گیا اور سید الشہداء کے ماتم و گریہ کو ابھی تک وہی حیثیت حاصل ہے۔

شہداء پرور قومیں کربلا کی یاد کو نہ صرف زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ ان کی عطا کردہ راہ پر جان وارنے کو اپنا افتخار سمجھتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

وصیت نامہ

ڈاکٹر محمد علی نقوی

بسم رب الشہداء

موت کی جانب سفر تیزی سے ہو رہا ہے کئی ایک ایسے مواقع دیکھنے میں نصیب ہوئے ہیں جو انسان کے لیے عبرت کا کام دیتے ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ سبق حاصل نہ کر سکا جو دوسروں کو کہتا رہا۔ بالآخر وہ وقت آن پہنچا۔ کاش موت سے نہ بھاگے ہوتے' کاش لشکر خمینی میں شمولیت اختیار کی ہوتی تو شاید ان پاک و پاکیزہ نوجوانوں کے صدقے ہم بھی بخشش کا کوئی سامان لے جاتے۔ بہر حال یہ سب باتیں اب رہ گئیں اور ہم ایک لمبے سفر پر روانہ ہوگئے۔ التماس دعا میں وصیت کرتا ہوں۔

مجھے اپنے آبائی قبرستان علی رضا آباد میں دفن کیا جائے۔ جنازہ میں تاخیر نہ کی جائے۔ پوسٹ مارٹم نہ کروایا جائے اور اس موقع پر کسی قسم کا تنظیمی اجتماع نہ کیا جائے۔

میری ملکیت ظاہری میں اگر کوئی شخص یا تنظیم دعویدار ہو تو اسے ضرور پہلے اس کا حق دیا جائے۔

آخری گزارش! خوش بختی ہے ان لوگوں کی جو باصلاحیت اور باشعور لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہلاکت ہے ان کے لئے جو اپنے سے کمتر کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں۔ اپنی اہلیہ محترمہ کا شکر گزار اور بچوں سے پر امید۔ تمام دوستوں سے ان کی توقعات پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے شرمسار ہوں۔

والسلام

محمد علی نقوی

یکم اپریل ۱۹۹۲ء

ابدی حیات کی خوشبو

فرمان خداوندی ہے کہ "شہید" زندہ ہوتا ہے 'وہ اپنے رب سے روزی پاتا ہے اور اس کی روح آزاد ہوتی ہے مگر اس کے لئے شعور بہت ضروری ہے۔ ذیل میں چند واقعات نقل کئے جارہے ہیں جس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ "شہید" کی ابدی حیات کیسی ہوتی ہے۔

سفیر انقلاب ۷ مارچ ۱۹۹۵ء کو شہید ہوئے تو ان کے چنداں اہم ترین امور تشنہ رہ گئے اور بعض قومی معاملات اس قدر مخفی تھے کہ آپ کی ذات کے علاوہ کسی اور کو خبر تک نہ تھی۔ ایسے میں شہید ڈاکٹر نقوی اپنے معتمد رفقاء سے خوابوں میں ملے اور ان پر تمام صورتحال آشکار کردی۔ مثال کے طور پر کچھ مخیر حضرات نے قومی امور کی تکمیل کے لئے کثیر مالی تعاون کرنا تھا تو ڈاکٹر صاحب نے احباب کو تمام افراد اور اعداد و شمار تک سمجھائے اور اس طرح سے آپ کے تشنہ امور رواں ہوئے۔

○ ○ ○ ○ ○

آخری چند سالوں سے آپ کا معمول تھا کہ آپ رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کرتے تھے۔ اسی دوران میں آپ کی آشنائی پنجاب سیکریٹریٹ میں کام کرنے والے ایک تبلیغی سے ہوگئی۔ جو راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ یہی تبلیغی صاحب آپ کی شہادت کے دو ماہ بعد حج بیت اللہ ادا کرنے گئے واپس لوٹے تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے ایک ساتھی سے تذکرہ کیا کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو حج ادا کرتے دیکھا ہے۔ بعض احباب نے استفسار کیا کہ کہیں شکل کا مغالطہ تو نہیں ہوا 'تو کہنے لگے کہ ایسا قطعاً نہیں ہوسکتا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے معمول کے لباس پینٹ 'شرٹ میں ملبوس تھے اور اس سے دس پندرہ قدم آگے مناسک (خانہ کعبہ کا طواف) ادا کرتے رہے اور تھوڑی دیر بعد غائب ہوگئے۔

○ ○ ○ ○ ○

آپ کی شہادت کے ایک ماہ بعد موسمی بارشیں ہوئیں تو آپ قدمبارک کے

سرہانے چند گز کے فاصلے پر زمین میں سوراخ ہوا جس سے پانی داخل ہو کر آپ کے جسد تک جا پہنچا۔ آپ نے اپنے ایک عزیز کو خواب میں بتایا کہ "پانی میری آرام گاہ میں داخل ہوچکا ہے' آپ اس کا راستہ بند کریں۔" انہوں نے تساہل کیا تو دوسری شب آپ نے پھر بشارت دی' قدرے ناراض ہوئے اور ساتھ ہی پانی کے داخلہ کی جگہ بھی مشخص کردی۔ جب آپ کے عزیز آپ کے مزار پر پہنچے تو اس جگہ سے پانی آہستہ آہستہ زمین میں داخل ہو رہا تھا۔ جس کی آپ نے نشاندہی کی تھی۔

○ ○ ○ ○ ○

آپ کے چھوٹے فرزند شدید بیمار ہوئے تو آپ کے گھر والے سخت پریشان ہوئے۔ ایسے میں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر والوں سے ملے اور انہیں تمام ادویات اور طریقہ کار تفصیلاً" بتایا۔ دوسری صبح آپ کی بتائی ہوئی ادویات لے کر علاج کیا گیا تو ننھے موسیٰ رضا روبہ صحت ہوگئے۔

○ ○ ○ ○ ○

ڈاکٹر صاحب سے مربوط' قومی امور میں انتہائی معاون ایک شخصیت علیل ہوئیں تو آپ نے اپنے ایک قریبی رفیق سے خواب میں ملاقات کی اور انہیں بیمار قومی شخصیت کی عیادت کی تاکید کی۔ جب آپ کے رفیق اس شخصیت کے گھر پہنچے تو انہیں بستر علالت پر پایا اور وہ بار بار ڈاکٹر صاحب کو یاد کر رہے تھے۔

○ ○ ○ ○ ○

آپ کی دختر نیک اختر قم یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ آپ کی شہادت کے بعد انہیں چنداں مرتبہ رہنمائی کی ضرورت پڑی تو آپ نے اسی طرح سے انہیں گائیڈ کیا جیسے زندگی میں کرتے تھے۔

○ ○ ○ ○ ○

لاہور میں ایک ضعیف سیدہ دل کے مرض میں عرصہ سے مبتلاء ہیں جو ہر ہفتہ یا عشرہ میں ڈاکٹر صاحب سے چیک اپ کراتی تھیں اور آپ کی دواؤں کے مسلسل

استعمال سے انہیں افاقہ تھا۔ آپ کی شہادت کے بعد انہیں دل کا عارضہ ہوا تو انہوں نے آپ کو یاد کیا۔ آپ انہیں خواب میں ملے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کا نام لے کر انہیں ان سے دوائی لینے کی درخواست کی اور ساتھ دعا فرمائی کہ آئندہ انہیں یہ مرض نہیں ہوگا۔ انہوں نے مبینہ ڈاکٹر صاحبہ سے رابطہ کیا۔ دوائی لی تو نہ صرف تندرست ہوگئیں بلکہ گذشتہ ایک سال سے انہیں پھر کبھی تکلیف نہیں ہوئی۔

○ ○ ○ ○ ○

آپ کی شہادت کے بعد آپ کے اہل خانہ کو گھریلو معاملات اور مستقبل کے مسائل کے بارے میں فکر لاحق ہوئی تو آپ انہیں ملے اور چند ایک معتمد احباب کا نام لے کر ہمیشہ ان سے مربوط رہنے کی تاکید فرمائی۔ آپ کی نشاندہی کے بعد آپ کے اہل خانہ کسی بھی مسئلہ کی صورت میں آپ کے احباب سے رابطہ کرتے ہیں اور یہ احباب (خدا انہیں خوش رکھے) ہر حوالہ سے توقعات پر پورے اتر رہے ہیں۔

○ ○ ○ ○ ○

شہادت کے بعد آپ اپنے ایک نظریاتی وارث سے ملے اور قدرے ناراض ہو کر فرمایا کہ " میں نے تمہیں اپنے مقدمہ کے بارے میں منع فرمایا تھا۔ " آپ نے میرے خون کا مقدمہ درج کرا کے مجھے شرمسار کیا ہے۔ مجھے خبر تھی کہ یہاں کی عدالتوں میں انصاف نہیں ملتا بلکہ رسوائی ہوتی ہے۔"

○ ○ ○ ○ ○

اہم اور حساس قومی معاملات میں جب آپ کے نظریاتی رفیق(جن کا نام آپ نے اپنی وصیت میں بطور نظریاتی وارث لکھا) کسی مقام پر الجھن کا شکار ہوتے ہیں تو آپ بروقت ان سے تفصیلی ملاقات کرتے ہیں اور انہیں ویسے ہی مفصل ہدایات دیتے ہیں جیسے زندگی میں دیتے تھے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

○ ○ ○ ○ ○

ایک گزارش ---------- ایک اپیل

قارئین! زندگی ایک فانی شے ہے اور اس کا سفرپانی کے سینے پر تیرنے والے بلبلے کی طرح ہے جسے ہر حال میں فنا ہونا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ آل عمران کی آیت ۱۴۵ میں ارشاد رب العزت ہے کہ کسی شخص میں طاقت نہیں کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر مرجائے اس نے موت کا وقت مقرر کر رکھا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ "اگر اللہ نے موت کا وقت مقرر نہ کیا ہوتا تو لوگوں کی روحیں ثواب کے شوق اور سزا کے خوف کی بنا پر ایک لحظہ کے لئے بھی ان کے ابدان میں نہ رہتیں"

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہر جسم نے موت کا مزہ چکھنا ہے اور اسی فرمان خداوندی کی روشنی میں حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا تھا "جب جسم فنا ہونے کے لئے ہی ہے تو پھر راہ خدا میں فنا ہونا ہی بہترین عمل ہے"۔

جب موت کا تقرر اور زندگی کا فنا ہونا لاریب ہے تو پھر انسان کو چاہئے کہ وہ سورۃ جمعہ کی آیت ۶ کا مصداق بنے کہ "موت کی تمنا کرو تاکہ تم اپنے دعویٰ میں سچے ثابت ہو سکو" البتہ کوشش کرنی چاہئے کہ عارضی زندگی سعادت کے طور پر بسر ہو اور ابدی سفر شہادت کے دوش پر طے ہو کیونکہ شہادت خدا کا بہت بڑا انعام ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرے جد بزرگوار نے مجھ سے فرمایا کہ تمہیں بارگاہ خداوندی میں ایک عظیم رتبہ ملنے والا ہے لیکن وہ رتبہ شہادت کے بغیر ممکن نہیں"۔

حضرت علی علیہ السلام جب مسجد کوفہ میں عبدالرحمٰن ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہوئے اور گھر لائے گئے تو آپؑ نے فرمایا "خدا کی قسم کوئی غیر متوقع یا ناپسندیدہ بات نہیں ہوئی بلکہ وہی ہوا ہے جس کی مجھے ایک عرصہ سے خواہش تھی اور جس کے لئے میں خدا سے دعائیں مانگا کرتا تھا۔ میں نے شہادت کا سفر اختیار کیا ہے جس کا مجھے بے حد اشتیاق تھا۔ میری مثال اس شخص کی ہے جو اندھیری رات میں پانی کی تلاش میں ہو اور اچانک اسے کنواں یا چشمہ مل جائے .... میں اس شخص کی مانند ہوں جو

کوئی چیز پانے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہے اور اسے پالے"

بھائیو، بہنو اور بزرگو! شہید مظلوم حضرت علامہ سید عارف حسین الحسینیؒ نے فرمایا تھا کہ "شہادت ہماری میراث ہے جو ہماری ماؤں نے ہمیں اپنے دودھ میں بخشی ہے" لہٰذا ہماری میراث ہمیں تک منتقل ہونی چاہیئے اور اس کا سفر جاری رہنا چاہیئے۔ ہمارے لبوں پر رمضان المبارک میں پڑھی جانے والی دعاؤں کا یہ ورد رواں رہنا چاہیئے "**الھم برحمتک فی الصالحین فادخلنا وفی علیین فارفعنا و قتلا فی سبیلک مع ولیک فوفق لنا**"

"اے پروردگار! ہمیں توفیق دے کہ ہم تیری راہ میں اور تیرے ولی (امام) کے ہمراہ قتل ہو جائیں اور شہادت کی سعادت سے ہمکنار ہوں"

یاد رہے کہ دعا کے ساتھ حصول کے راستوں کا سفر بھی بے حد ضروری ہے لہٰذا اس سفر میں جہاں آپ اپنے لئے "شہادت" کی تمنا کریں وہاں مجھ ناچیز کے لئے بھی خدا سے دعاؤں کے ذریعہ اس کے انعام (شہادت) کی سفارش ضرور فرمائیں تاکہ ہم جلد از جلد امام زمانہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کی محفل میں جا پہنچیں جہاں صدر اسلام کے شہدا سے لے کر ڈاکٹر محمد علی نقویؒ تک کے تمام شہداء اکھٹے ہیں اور خدا سے ملاقاتوں کی لذت حاصل کرتے ہیں۔

شہادت ہمارا افتخار ہے ہم حسینی ہیں اور ہمارا نظریہ ہے کہ۔

جو حسینی بھی ہے اور موت سے بھی ڈرتا ہے
ہاں! وہ توہین حسینؑ ابن علیؑ کرتا ہے

☆☆☆☆☆

تمام قارئین سے شہداء اسلام کی ارواح مقدسات کیلئے سورہ فاتحہ کی اپیل ہے۔

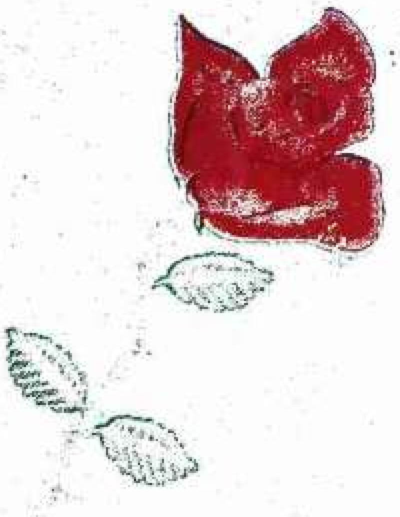

○ میں نہیں چاہتا کہ ضعیفی میں کھانس کھانس کر مروں، خدا میری موت کو میری متحرک زندگی سے متصل کردے۔

○ ۴۳ برس بیت گئے مگر ابھی تک "شہادت" نصیب نہیں ہوئی لگتا ہے کہ میرا کوئی عمل خدا کو پسند نہیں آیا۔

(زندگی کے آخری ایام کی گفتگو سے اقتباسات)

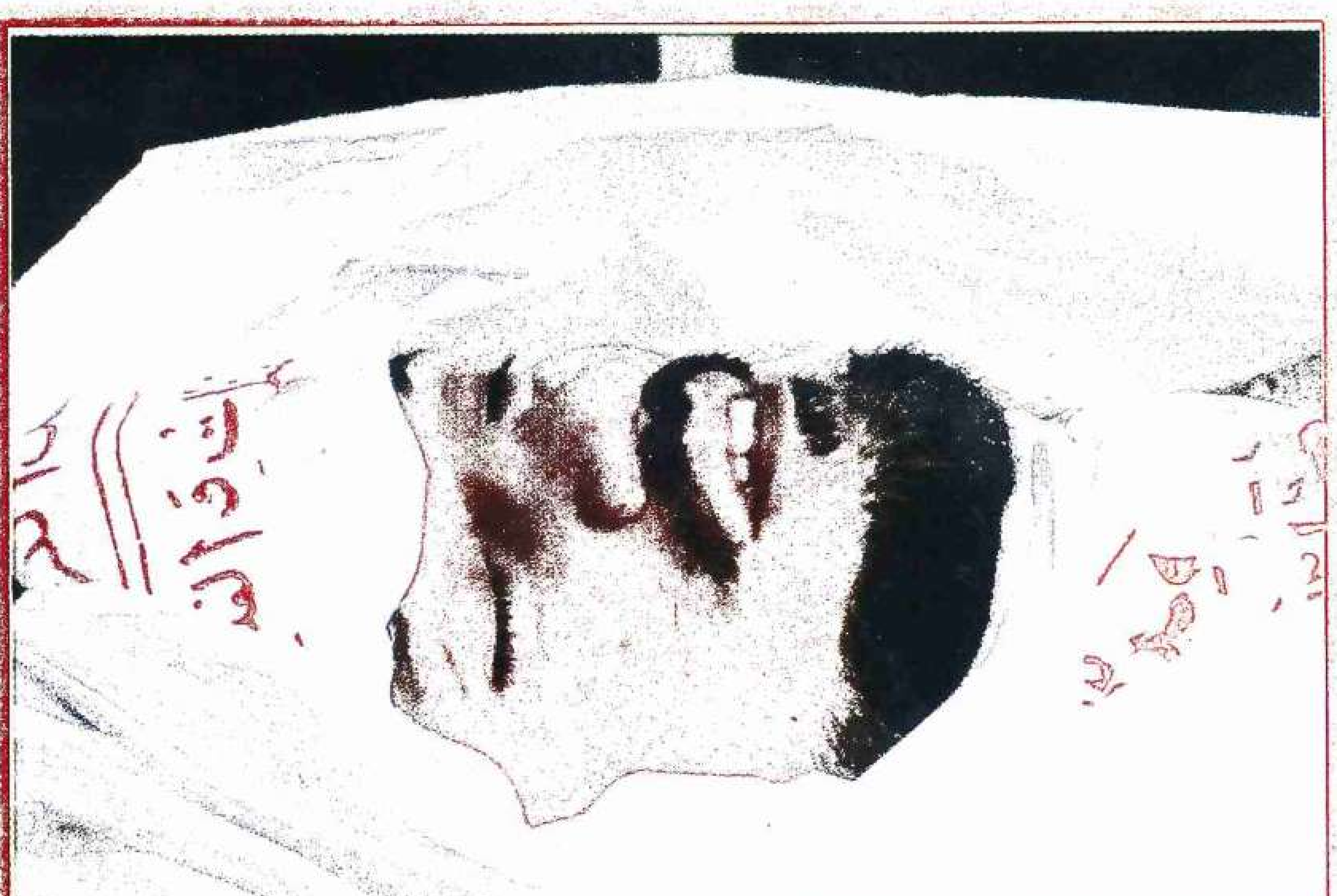

اپنے خوں کے غسل سے کتنی نکھر جاتی ہے موت